کہے فقیر... سلسلہ

ارژنگِ فقیر

دل کی گہرائیوں سے نکلی روحانی گفتگو

سرفراز اے شاہ

INSIDE

ہیں......لیکن جب ہم توبہ کر لیتے ہیں تو ہم حالت جفا سے حالت وفا میں چلے جاتے ہیں۔

☆ ...... قرآن پاک کی تلاوت کی فضیلت بے پناہ ہے۔بدقسمتی سے ہم تصوف کے بارے میں غلط تصور رکھتے ہیں اور وظائف کو اہم سمجھنے لگے ہیں۔

☆ ...... جب انسان محبت سے رب کو پکارتا ہے تو پھر اُس پر رب کی طرف سے ایسے انعامات اور رحمتوں کی بارش ہونے لگتی ہے جو بے پناہ ہوتی ہے۔

☆ ...... جب آپ دوسرے کا ادب کرتے ہیں، اُس کو عزت دیتے ہیں تو کامیابی اور نصیب کے دروازے آپ کے لیے کھل جاتے ہیں۔

☆ ...... جب انسان دوسروں کی خامیاں اُجاگر نہیں کرتا، اُنھیں تنقید کا نشانہ نہیں بناتا تو وہ لوگوں کے نزدیک پسندیدہ شخص کہلاتا ہے۔

☆ ...... رب تعالیٰ کے نور نے پوری کائنات کو گھیرے میں لیا ہوا ہے۔وہ پوری کائنات پر محیط ہے۔

☆ ...... آپ ﷺ سے سچی محبت پیدا کرنے کے لیے ہم آپ ﷺ کی عملی حیات طیبہ کو توجہ اور باریکی سے پڑھیں۔

دل کی گہرائیوں سے نکلی رُوحانی گفتگو



سرفراز اے شاہ

www.jbdpress.com



ناشر: فواز نیاز

قانونی مشیر: چودھری غلام سرور نہنگ، چوہدری ریاض اختر



قیمت:-/950 روپے
US $ 19
UK £ 12

DVD کے ساتھ

اشاعت: دوم

For suggestions and complaints please contact
info@jbdpress.com
www.qalander.org

جہانگیر بکس

121۔ڈی بلاک گلبرگ II، لاہور۔ فون:042-35760323

ڈسٹری بیوشن

لاہور: اردو بازار، فون: 042-37220879

لاہور: جہانگیر سنز، جوہر ٹاؤن، فون:3-042-35290892

لاہور: جہانگیر سنز، گلبرگ، فون:042-35771000

راولپنڈی: کتاب گھر، اقبال روڈ، نزد کمیٹی چوک، فون: 051-5539609

کراچی: اردو بازار، فون: 021-32765086

حیدرآباد: مکان نمبر194/8 نزد علی مینشن، لجپت روڈ، فون: 022-2780128

صابر ملک (0321-4443533) :212- جہانزیب بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور۔

Life Style

دبئی: ڈسلڈورف بلڈنگ، نمبر 104، البرشا 1 متحدہ عرب امارات
فون: +9714-4475920

انتساب

انتہائی خوبصورت اور منفرد شخصیت
جناب ایس ایم نقی صاحب کے نام
جن کی آج اکتالیس سال گزر جانے کے بعد
بھی میں بے پناہ عزت کرتا ہوں کہ انھیں
میں نے ہمیشہ افسر سے زیادہ گائیڈ پایا!

صاحبان! اُردو کتاب کا نام فارسی میں رکھنے پر معذرت چاہتا ہوں۔ میری کم علمی کا عالم یہ ہے کہ میرے ذہن میں سوائے ''ارژنگِ فقیر'' کے کوئی لفظ آیا ہی نہیں۔

انسان اِس طرح سے زندگی گزارے کہ عبادت تو رب کے لیے کی جائے لیکن زندہ دوسروں کے لیے رہا جائے۔ عبادت اور نیکی یک جا ہو جائیں تو رب تعالیٰ کی دوستی نصیب ہو جاتی ہے۔

''ارژنگِ فقیر'' اِسی راہ میں ایک کاوش ہے کہ اللہ سے دوستی اور قرب کے راستے حتی المقدور واضح کر دیے جائیں۔ اِس میں کس حد تک کامیابی ہوئی، فیصلہ آپ کریں گے۔

سرفراز اے شاہ
212۔ جہانزیب بلاک
علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

فہرست

نشست نمبر 1

غور و فکر

نشست نمبر 2

کثافتیں دُور کرنے کے طریقے

نشست نمبر 3

سورۃ الفاتحہ کے اہم مضامین کا خلاصہ

نشست نمبر 4

دس کثافتیں

نشست نمبر 5

رُوحانی کیفیات اور بنیادوں کی تیاری

نشست نمبر 6

سورۃ التغابن

نشست نمبر 7

نفس سے جنگ

نشست نمبر 8

اکتسابِ فیض

نشست نمبر 9

مرشد، مرید اور راہِ سلوک

نشست نمبر 10

مثبت رویہ اور شکرگزاری

نشست نمبر 11

رب پر یقین

نشست نمبر 12

عمل سے زندگی

نشست نمبر 13

چند مضامین قرآن اور حروف کے اثرات

نشست نمبر 14

شکرانِ نعمت

نشست نمبر 15

حسنِ آگہی

نشست نمبر 16

دوسروں کی سنیے

نشست نمبر 17

منفی سے مثبت تک

نشست نمبر 18

عالمِ اسرار

نشست نمبر 19

علم حصولی و حضوری اور درستی اعمال

نشست نمبر 20

تلاوت قرآن......رب تعالیٰ سے ہم کلامی کا ذریعہ

نشست نمبر 21

بدونِ عشقِ الٰہی مشاہدۂ حق ممکن نیست

نشست نمبر 22

توکل علی اللہ

نشست نمبر 23

ذوقِ مناجات سے شوقِ ملاقات تک

نشست نمبر 24

فضیلتِ تلاوتِ کلامِ پاک

نشست نمبر 25

سورۂ محمد ﷺ اور مشاہدۂ اسرار

نشست نمبر 26

کلامِ الٰہی

نشست نمبر 27

جمعہ کی فضیلت

نشست نمبر 28

رُوح کی لطافت

نشست نمبر 29

رب کی رضا اور قرب

نشست نمبر 30

اعمال میں اخلاص کی اہمیت

نشست نمبر 31

نیت اعمال

نشست نمبر 32

پُر اخلاص عبادت کے ثمرات

نشست نمبر 33

Personality Grooming

نشست نمبر 34

تصوف اور غلط فہمیاں

نشست نمبر 35

سورۃ القلم کے خاص مضامین اور اسم اعظم

نشست نمبر 36

فلسفۂ حیات

نشست نمبر 37

مضامین سورۃ النور

نشست نمبر 38

قلبی وارداتیں

نشست نمبر 39

اللہ نور ہے

نشست نمبر 40

ایک خط

نشست نمبر 41

آرزوئیں

نشست نمبر 1

غور و فکر

ہم بچپن سے سنتے آئے ہیں کہ جس نے خود کو پہچانا اُس نے رب کو پہچان لیا...... اگر آئینہ میں ہماری شکل دکھائی جائے تو ہم خود کو فوراً پہچان جاتے ہیں۔ اسی طرح ہم اپنی Strengths اور Weaknesses بھی جانتے ہیں۔ ہم خود کو تو کچھ حد تک پہچانتے ہیں لیکن پھر بھی رب تعالیٰ کو نہیں پہچان پاتے۔

رب تعالیٰ کو پہچاننے کے لیے ہمیں غور و فکر کرنا ہوگا اور غور و فکر کا آغاز ہم اپنے جسم کی Formation کے جائزے سے کر سکتے ہیں۔ کاسۂ سر میں 55 ہڈیوں کی حکمت، Brain، انسانی جسم کی 247 ہڈیوں کے فوائد، ان کی حفاظت کے لیے اُن پر گوشت اور اُس گوشت میں بلڈ سرکولیشن کے لیے مختلف سائز اور Description کی مختلف Veins کی کارکردگی اور جسم میں موجود 527 عضلات (Muscles) کے اندازِ کار پر غور کر کے اللہ کی اعلیٰ قدرت اور صناعی کا احساس ہوتا ہے۔

اسی طرح غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ انسانی جسم میں رب تعالیٰ نے حیوانیت کا جو جذبہ رکھا ہے، وہ چار چیزوں پر مشتمل ہے:

1۔ خون
2۔ سودا
3۔ صفرا
4۔ بلغم

آپ نے سنا ہوگا کہ سفلی علوم کے ماہر عموماً خون سے تحریر کرتے ہیں۔ مجھے اب یہ بات سمجھ آئی ہے کہ وہ خون سے تحریر کیوں کرتے ہیں۔

انسان میں جو حیوانی جذبے ہیں جنھیں ہم نفس بھی کہتے ہیں، اُن کا پہلا Ingredient خون ہے۔ سفلی یا کالے علم والے جب کوئی عمل کرتے یا چیز لکھ کر دیتے ہیں تو خون اُس کا لازمی حصہ ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں جس طریقۂ علاج نے بہت عروج پایا وہ حکمت تھی۔ آج سے ساڑھے تین سو سال پہلے اس طریقۂ علاج کو عروج حاصل تھا اور اس پر بہت تحقیق ہوا کرتی تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ بڑے Mind- blowing treatments سامنے آئے لیکن پھر مغلیہ دور کے زوال کے ساتھ حکمت بھی ختم ہو

گئی۔ حتیٰ کہ دو سال قبل اس پر تحقیق بھی ختم ہو گئی اس لیے اب اچھا حکیم شاذ و نادر ہی ملتا ہے۔

جب حکمت عروج پر تھی تب حکماء بھی ان چار Ingredients خصوصاً سودا اور صفرا پر کام کرتے کہ مریض کے جسم میں صفرا، سودا، بلغم یا خون میں سے کسی چیز کی زیادتی ہو گئی ہے۔ وہ ایسی دوائیں دیا کرتے جو یا تو معتدل مزاج ہوتیں یا گرم یا خشک یا تر۔

حکماء حضرات ادویات کے ذریعے مریض میں سودا، صفرا، خون اور بلغم کو کنٹرول میں رکھا کرتے تاکہ وہ حیوانی جذبات سے مغلوب ہو کر حیوانیت کی راہ پر نہ چل پڑے۔ وہ حیوانی جذبات کو کنٹرول کر کے انسان کی رُوحانی صفات کو Activate کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اچھا حکیم رُوحانی شخصیت بھی ہوتا ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ رُوحانیت کے بغیر حکمت ممکن نہیں۔ حکماء حضرات ادویات کے ذریعے مریض کے حیوانی جذبات کو دبا دیا کرتے تھے (یہ موضوع سے ہٹ کر بات تھی)۔ ذکر ہو رہا تھا غور و فکر کا۔

زمین جس پر ہم چلتے پھرتے ہیں اور جسے اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے بچھونا بنایا ہے اُس کی ساخت پر نظر ڈالیں تو پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کیسی کیسی چیزیں اس میں چھپا دی ہیں، کیسے کیسے خزانے اس میں پوشیدہ کیے ہیں۔ جوں جوں انسان اِن خزانوں کو دریافت کر کے استعمال میں لائے گا وہ اللہ کی عظمت و قدرت کا قائل ہوتا جائے گا۔ قیامت تک انسان کو جن چیزوں کی ضرورت پڑ سکتی ہے وہ زمین میں موجود ہے۔ مثلاً ہمارے یہاں پٹرول کا استعمال 1850ء کے بعد شروع ہوا لیکن Crude oil (خام تیل) تب سے زمین میں موجود ہے جب سے زمین بنی حالانکہ Crude oil بننے میں بہت وقت لگتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تیل اُن علاقوں میں پایا جاتا ہے جہاں کسی زمانے میں سمندر ہوتا تھا۔

اسی طرح نباتات (Vegetation) پر مٹی، گرد اور کوڑا کرکٹ جمع ہوتا رہتا ہے۔ کئی صدیوں میں مٹی کی اتنی تہیں جم جاتی ہیں کہ وہ مٹی Solid rocks میں بدل جاتی ہے اور ان Solid rocks میں سے ہوا کا گزر ختم ہو جاتا ہے۔ نباتات پر جمی مٹی کئی ہزار ٹن کے حساب سے اُس نبات کو Compression دیتی ہے۔ Heat اور Compression مل کر Vegetation، جانوروں کے ڈھانچوں اور پتھروں کو اس طرح Format کر دیتے ہیں کہ یہ سب ایک گاڑھے سیال کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ یوں کئی صدیوں میں تیل بنتا ہے اور ڈھلان کی طرف چلنا شروع کر دیتا ہے۔ کہیں کہیں درزوں (سوراخوں) سے باہر بھی نکلتا رہتا ہے حتیٰ کہ اگر اسے زمین کے اندر کہیں Depression مل جائے تو وہاں یہ تیل تالاب کی شکل میں جمع ہو جاتا ہے۔

سونا بھی اسی اُصول کے تحت بنتا ہے لیکن یہ کبھی اصلی حالت میں نہیں پایا جاتا ہمیشہ دوسری Metals کے ساتھ ملا ہوتا ہے۔ قیمتی پتھر بھی رب تعالیٰ نے کئی لاکھ سال پہلے ہمیں Provide کر دیے تھے۔ ان سب پر غور کرنے سے رب تعالیٰ کی عظمت کا ادراک ہونے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک میں رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ "تم غور و فکر کیوں نہیں کرتے۔" حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان ہے:

"انسان پر لازم ہے کہ وہ رب کی زمین پر گھوم پھر کر اس کی قدرت کا مشاہدہ کرے۔"

جب انسان زمین پر سیر کرتا ہے تو اُسے رب کی قدرت کا ادراک ہوتا ہے، اُس کے اندر شکر گزاری کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ جہاں شکر گزاری ہو وہاں بخوشی اطاعت کی جاتی ہے۔

اگر ہم رُوحانی طور پر ترقی کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ جو چیزیں بھی دیکھیں اُن پر غور ضرور کریں۔ روزانہ کسی ایک چیز پر غور ضرور کریں۔ جب ہم اُس کی گہرائی میں جائیں گے تو حیرت ہوگی کہ اُس کے اندر رب کی قدرت کے کیا کیا کرشمے چھپے ہیں۔ چیزوں کی حقیقت کا ادراک ہمیں رُوحانیت کی طرف لے جائے گا۔

اکثر حضرات یہ سوال کرتے ہیں (اگرچہ میرے لیے یہ لطیفہ ہی ہوتا ہے کہ آپ جیسے نیک لوگ مجھ گناہ گار سے پوچھتے ہیں) کہ نماز میں دل کیسے لگے گا، اس میں خشوع و خضوع کیسے آئے گا؟

نماز میں خشوع و خضوع میں دو عوامل حائل ہوتے ہیں:

1۔ خارجی عوامل
2۔ داخلی عوامل

خارجی عوامل تو سادہ سے ہیں کہ ہم نماز پڑھ رہے ہیں، اتفاقاً ہماری نظر کسی خوب صورت چیز پر پڑ گئی اور توجہ اُس طرف چلی گئی۔ اس کا حل یہ ہے کہ اُس چیز کو وہاں سے ہٹا دیں۔

ایک شخص نے آپ ﷺ کی خدمت میں نہایت عمدہ اور خوب صورت کپڑا ہدیہ کیا۔ آپ ﷺ کو پسند آیا اور آپ ﷺ نے اُسے سلا کر پہن لیا۔ نماز پڑھتے ہوئے ذہن اُس کی خوب صورتی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ نماز پڑھنے کے فوراً بعد آپ ﷺ نے پہلا کام یہ کیا کہ وہ سوٹ اُس کو دے دیا جس نے وہ کپڑا پیش کیا تھا۔

اسی طرح آپ ﷺ نے ایک بار چمڑے کا نیا تسمہ جوتے میں لگایا۔ دورانِ نماز اُس تسمے کی طرف خیال چلا گیا۔ نماز کے بعد آپ ﷺ نے اپنے جوتے اُس شخص کو بطور تحفہ دے دیے جو سب سے پہلے نظر آیا۔

میوزک، لوگ، شور اور اِسی قسم کے دیگر خارجی عوامل نماز میں خشوع و خضوع میں رُکاوٹ بنتے ہیں۔ آج ایک اور بات سمجھ آ جائے گی کہ فقیر تنگ جگہ پر نماز کیوں پڑھتے ہیں کیونکہ کشادہ جگہ پر Distraction زیادہ ہوگی جب کہ تنگ اور کم روشن جگہ پر خشوع و خضوع بڑھ جائے گا۔

داخلی عوامل سے مراد ہے کوئی جذبہ یا فکر جو ذہن سے محو نہ ہو اور نماز میں بھی دھیان اُدھر رہے۔ آپ نے بارہا سنا ہوگا کہ اگر سخت بھوک لگی ہو اور نماز کا ٹائم بھی ہو تو پہلے کھانا کھا لیں کیونکہ بھوک کی حالت میں نماز پڑھنے سے نماز میں یک سوئی نہیں آئے گی۔

اسی طرح اگر انسان کے ذہن میں کوئی ایسا جملہ ہے جو وہ کہنا چاہتا ہے تو پہلے وہ جملہ کہہ لے پھر نماز پڑھے تاکہ وہ جملہ ذہن میں اٹکا نہ رہے اور نماز کی یک سوئی اور خشوع و خضوع کو متاثر نہ کرے۔

بعض یادیں بھی ایسی ہوتی ہیں جو نماز میں تنگ کرتی ہیں۔ اس کا حل یہ ہے کہ اُن یادوں کو ترک کر دیا

جائے۔ اگرچہ یہ آسان امر نہیں ہے لیکن نماز میں خشوع وخضوع کے حصول کے لیے اس پر عمل کرنا بہت ضروری ہے۔

سوال: مادیت پرستی کس حد تک جائز ہے؟ اگر جائز ہے تو کیا انسان صرف تقدیر پر اکتفا کرے؟

جواب: مسلمان کبھی تقدیر پر اکتفا نہیں کرتا۔ رب تعالیٰ کو وہ لوگ بہت پسند ہیں جو ہر وقت مجاہدوں کی طرح عمل کے لیے کمر کس کے رکھتے ہیں، جو سست اور کاہل نہیں بلکہ ہر وقت جدوجہد اور محنت کرتے ہیں۔ محض تقدیر پر اکتفا کرنے والے ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جاتے ہیں، بے عمل ہو جاتے ہیں اور بے عملی کا اسلام میں کوئی تصور نہیں۔

اگر مادیت پرستی سے مراد دُنیاوی وسائل پیدا کرنا یا اُن کے حصول کے لیے کوشش کرنا ہے تو بہت سادہ سی بات ہے کہ مسلمان Maximum دُنیاوی وسائل کے حصول کے لیے جان توڑ محنت کرتا ہے۔ میرا ذاتی خیال بھی یہی ہے کہ انسان کو آخری حد تک محنت کرنی چاہیے لیکن اِس محنت کے نتیجے میں جو حاصل ہو جائے اُس میں سے اپنی ذات پر کم سے کم اور اپنے Dependents پر کھلے ہاتھ سے خرچ کیا جائے۔ جو بچ رہے اُسے رب کے بندوں پر کھلے دل سے خرچ کر دینا چاہیے۔

حضرت عثمان غنیؓ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اُنھوں نے مسلمانوں کے لیے کنواں اور دیگر دُنیاوی سہولتیں فراہم کیں کیونکہ اُن کے پاس دُنیاوی وسائل موجود تھے۔ اِس لیے اللہ تعالیٰ نے جتنی ہمت دی ہے اُس سے کام لے کر آخری حد تک کوشش کر کے دُنیاوی وسائل جائز طریقے سے حاصل کرنے چاہییں۔

سوال: حضرت علیؓ کا فرمان ہے ''میں نے دُنیا کو تین طلاقیں دے دیں۔'' اِس کا کیا مطلب ہے؟

جواب: حضرت بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ بے پناہ امیر انسان تھے۔ اُن کے ہم عصر اولیاء کرام اُنھیں اکثر و بیشتر کہتے رہتے کہ آپ کیسے ولی اللہ ہیں جنھوں نے اِس قدر دولت جمع کر رکھی ہے۔ تب آپ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک ولی اللہ کو اُن کے خط کے جواب میں لکھا کہ میں نے دولت جمع ضرور کی ہے لیکن اُسے دل میں جگہ نہیں دی اور یہ بات کچھ عرصہ بعد اُس وقت ثابت بھی ہو گئی جب ریاست میں قحط پڑا اور گورنمنٹ کی کوششوں کے باوجود ختم نہ ہوا تو حضرت بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے غلہ کے گوداموں کے منہ عوام کے لیے کھول دیے۔

انسان کو دُنیاوی وسائل ضرور حاصل کرنے چاہییں لیکن دُنیا کو دل میں جگہ نہیں دینی چاہیے۔ حضرت علیؓ کے قول کا مطلب یہی ہے کہ اُنھوں نے دُنیا سے محبت نہیں پالی تھی۔

سوال: کیا مراقبہ کے لیے جگہ اور وقت کی پابندی ضروری ہے؟ مجھے بھی مراقبہ کی اجازت عطا فرما دیجیے۔

جواب: مراقبہ کسی کی میراث تو ہے نہیں کہ کسی کو اجازت ملے، یا نہ ملے یہ تو رب تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کا طریقہ ہے اور رب تو سب کا ہے۔

مراقبہ ایسے وقت کرنا چاہیے جب کوئی اور کام نہ ہو تاکہ ذہن مطمئن اور یکسو ہو کر مراقبہ کر سکے۔ جہاں تک خاص مقام کی بات ہے تو یہ انسانی فطرت ہے کہ انسان جہاں کثرت سے بیٹھتا یا لیٹتا ہے وہاں اُس کے

اعصاب Relax کر جاتے ہیں۔ مراقبہ میں اعصاب کا Relax ہونا بنیادی ضرورت ہے۔ روزانہ Familiar جگہ پر بیٹھنے سے اعصاب Relax رہیں گے۔ آپ جب چاہیں مراقبہ کر لیں لیکن کوشش کریں کہ جب مراقبہ کرنے بیٹھیں تو اُس وقت کوئی اور کام نہ ہو۔

سوال: رب تعالیٰ کے اِختیار "مالك الملك" کی وضاحت کریں۔

جواب: اللہ بادشاہوں کا بادشاہ اور شہنشاہوں کا شہنشاہ ہے۔ وہ مالکِ کل اور قادرِ مطلق ہے۔ اُس کے اختیارات کلی ہیں، کوئی چیز پیچھے نہیں بچتی۔

سوال: اللہ کی طرف سے آزمائش یا امتحان کا کیسے پتا چلے گا کہ یہ پریشانی ہماری آزمائش ہے یا امتحان؟

جواب: میں تو آزمائش سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کیونکہ مجھ میں ہمت نہیں کہ کسی آزمائش پر پورا اُتر سکوں۔ میں تو ہر وقت اُس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا رہتا ہوں کہ میں بہت کمزور ہوں، تُو مجھ پر رحم فرما...... اور اللہ بہت رحیم و کریم ہے، وہ بندوں کو آزمائش میں نہیں ڈالتا، وہ گناہوں پر جلدی پکڑ نہیں کرتا اور اپنے بندوں کو معاف کرتا رہتا ہے۔

البتہ اُس وقت ٹیسٹ ضرور آ جاتے ہیں زندگی میں کہ اگر میں نے کبھی یہ کہہ دیا کہ مجھے دُنیا سے نہیں رب سے پیار ہے تو تھوڑی دیر بعد ایک آدمی دس روپے لینے آ گیا تو میری رُوح فنا ہو گئی۔

ایسے ٹیسٹ آتے رہتے ہیں اِس لیے ایسے الفاظ منہ سے نکالنے سے گریز ہی کرنا چاہیے۔ ہم پاکستانی طریقے سے کہتے رہتے ہیں ''یا اللہ! مجھے تو بس تُو چاہیے۔''

اللہ کہتا ہے اچھا میں تمھارا ٹیسٹ لیتا ہوں اور جب وہ شروع ہوتا ہے تو ذرا سی بات پر ہماری چیخیں نکل جاتی ہیں۔

1989ء میں ایک صاحب نے آ کر مجھے کہا کہ ''میں رُوحانیت کی راہ پر چلنا چاہتا ہوں۔ مجھے رُوحانی علم چاہیے۔'' میں نے کہا ''آپ کسی ایسے صاحب کے پاس جائیے جو رُوحانیت سے واقف ہوں اور آپ کو علم دے دیں۔'' لیکن وہ بضد رہے تو میں نے ایک حربہ استعمال کیا کہ اِس میں آزمائش آتی ہے اور دُنیاوی وسائل تیزی سے کم ہونے لگتے ہیں۔ فقر و فاقہ تیزی سے آتا ہے۔ وہ صاحب کہنے لگے ''دُنیاوی وسائل بہت ہیں میرے پاس، بس آپ علم دے دیجیے۔'' تب میں نے اُنھیں ایک لفظ بتا دیا کہ یہ پڑھ لیجیے، اللہ آپ کو اپنے قریب کر لے گا۔ ایک ہفتے بعد وہ صاحب دوبارہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے ''واپس لے لیجیے اپنا لفظ۔ میں تو اِس کو پڑھنے کے بعد فاقوں پر آ گیا ہوں۔''

انسان کو بہت سوچ سمجھ کر الفاظ زبان پر لانے چاہییں، باقی اللہ بہت رحیم و کریم ہے۔ اُس کی رحیمی و کریمی کا اندازہ اِس بات سے لگا لیجیے کہ مجھ جیسا گناہ گار اور سرکش اُس کی زمین پر چلتا پھرتا اور بڑے مزے سے زندگی گزارتا ہے۔ اگر وہ مجھ جیسے گناہ گار کو پالتا ہے تو آپ جیسے نیک لوگوں کو بھی سینے سے لگائے گا۔

کثافتیں دُور کرنے کے طریقے

جولوگ اللہ کی راہ پر چلنے اور اللہ کی دوستی Win کرنے میں Interested ہیں، اُن کے لیے ضروری ہے کہ وہ دس کثافتوں کے نام کاغذ پر لکھ کر انھیں اپنی زندگی سے بتدریج ختم کرنا شروع کر دیں۔ سب سے پہلے کینہ کو اپنے اندر سے دُور کرنا شروع کریں۔ جب ہم دل سے کینہ ختم کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو کاغذ سے لفظ ''کینہ'' کاٹ دیں اور پھر 'بغض' اور اُس کے بعد 'حسد' پر کام شروع کر دیں۔ جب دل کو 'بغض' اور 'حسد' سے پاک کرلیں تو کاغذ پر لفظ 'بغض' اور 'حسد' کو قلم زد کر دیں۔

چوتھی کثافت غیبت ہے۔ غیبت ہمارے معاشرے میں As a part of life قبول کر لی گئی ہے حالانکہ یہ تمام کثافتوں میں سب سے بُری ہے اور کسی طور انسان کو اللہ کے قریب نہیں جانے دیتی۔ بدقسمتی سے ہم نے اِسے Gossip اور Part- time hobby کا نام دے دیا ہے۔ میں جہاں بیٹھتا ہوں دوسروں کے عیب Discuss کرتا رہتا ہوں..... حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اور پیرانِ پیر رحمۃ اللہ علیہ جیسی ہستیوں نے مرید کی Guidance کے لیے یہی فرمایا کہ مرید کچھ نہ کرے، پہلے دس کثافتوں کو اپنے اندر سے نکالے اور اس کے بعد ان باتوں پر عمل شروع کردے جو اللہ کو بہت پسند ہیں۔

اللہ نے Dos اور Do'nts کی جو لسٹ بتائی ہے ہم اُس کے مطابق عمل کریں۔ جن کاموں کا حکم دیا گیا ہے وہ کریں اور جن سے منع کیا گیا ہے اُن سے رُک جائیں۔ ہم عموماً منع کردہ کاموں سے اجتناب کر کے سمجھتے ہیں کہ معاملہ ٹھیک ہو جائے گا لیکن ایسا نہیں ہے۔ ہمیں Dos پر بھی عمل کرنا ہوگا۔ اسی طرح دس کثافتوں کو اندر سے نکال دینا ہی کافی نہیں..... پسندیدہ اطوار کو اپنی ذات میں شامل بھی کرنا ہوگا۔

اپنی ذات میں موجود سب کثافتوں پر غور کریں اور ایک ایک کر کے انھیں اپنی شخصیت سے نکال دیں۔ اگر سب سے پہلے غیبت پر کام کریں گے تو کینہ، بغض اور حسد ختم کیے بغیر غیبت کو ختم کرنا ممکن نہ ہوگا کیونکہ غیبت جنم لیتی ہے کینہ، بغض یا حسد سے۔ جب ہمارے دل میں کسی کے خلاف کینہ ہوتا ہے تو ہم اُس کے خلاف اُس کی غیر موجودگی میں بُرے الفاظ میں گفتگو کر کے تسکین اور تسلی حاصل کرتے ہیں۔ جس سے ہم حسد کرتے ہیں اُسے Run down کر کے ہمیں بہت تسکین ملتی ہے۔ اس لیے اگر ہم نے اپنے دل سے پہلے کینہ، بغض اور حسد کو ختم کرلیا تو غیبت ختم کرنے کی کوشش رائیگاں نہیں جائے گی۔

جب کوئی شخص ہم پر تنقید کرتا ہے تو ممکن ہے کہ بظاہر تو Smiling face کے ساتھ ہم اُس تنقید کو برداشت کرلیں لیکن اس کے باوجود دل میں ایک گرہ باندھ لیں اور جہاں موقع ملے اُس تنقید کا بدلہ چکا دیں...... یہ کینہ ہے۔

لیکن جب ہم اُس مقام پر آجاتے ہیں کہ کوئی شخص ہمیں کتنا ہی بُرا بھلا کیوں نہ کہے، ہماری جڑیں کتنی ہی کاٹ دے، ہم پر کتنے ہی الزامات لگائے، ہمیں کتنا ہی نقصان پہنچائے، ہم اُسے بُرا نہیں سمجھتے بلکہ اُس کے لیے بہتر کلمات کہتے اور اللہ کے حضور اُس کے لیے دُعاگو رہتے ہیں۔ یہ رویہ اِس بات کا غماز ہے کہ اُس شخص کے خلاف ہمارے دل سے کینہ ختم ہو گیا کیوں کہ اُس کے بُرے سلوک کا ہمارے دل پر کوئی اثر نہیں آرہا کہ اُس کی بدسلوکی یاد رہ جائے..... جب بُرا سلوک یاد ہی نہیں ہوگا تو ہم بدلہ لینے کا بھی نہیں سوچیں گے۔

تھوڑی سی محنت کر کے بہت احتیاط اور التزام کے ساتھ اس پر محنت کریں تو دل سے کینہ نکل جاتا ہے۔

کینہ ختم کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص ہمیں گالی دے تو ہم دل میں سوچیں کہ شاید مجھے اندازہ نہیں ہوا کہ میں نے انجانے میں اِسے کوئی دکھ دیا ہے۔ تب انسان مسکراتے ہوئے گالی کے جواب میں کہتا ہے ''معاف کیجیے بھائی۔ اگر میری ذات سے آپ کو دُکھ پہنچا ہے تو میں دل سے معافی چاہتا ہوں۔'' یہ عمل بار بار کرنے سے ہمارے اندر سے یہ خواہش ختم ہو جاتی ہے کہ ہم گالی کے جواب میں گالی دیں..... بُرے کے جواب میں اچھا سلوک کرنا آپ ﷺ کی سنت ہے۔

اسی طرح جب کوئی شخص ہماری جڑیں کاٹتا اور ہمیں بُرا بھلا کہتا ہے تو ہم اپنے آپ کو سمجھالیں کہ یہ میری طرح کا انسان ہے۔ جس طرح مجھ سے غلطیاں اور کوتاہیاں ہو جاتی ہیں اسی طرح اس سے ہوگئیں۔ اللہ اِسے توفیق دے کہ وہ اِن غلطیوں کو نہ دہرائے۔ جب ہمیں یہ پریکٹس ہو جاتی ہے تو کسی کا بھی غیر متوقع رویہ ہمیں دُکھ نہیں دیتا۔

اسی طرح جب دل میں حسد زور مارے تو ہم اپنے آپ کو قرآن کی وہ آیت یاد دلائیں جس کا مفہوم ہے کہ ہر انسان کو وہی ملتا ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے۔ اُس شخص نے محنت اور کوشش کی اور رب تعالیٰ نے اُسے اُس کی کوششوں سے کہیں زیادہ صلہ عطا کر دیا..... یہ میری کوتاہی ہے کہ اُس سے زیادہ محنت نہ کرسکا۔

غیبت سے چھٹکارے کے لیے ہم یہ کر سکتے ہیں کہ جب کسی کی غیبت کرنے کو ہمارا جی چاہے تو ہم اُس شخص کی خوبیاں بیان کرنا شروع کر دیں۔ جب کوئی توجہ دلائے کہ اُس میں تو فلاں خامی بھی ہے تو ہم کہیں ''صاحب! یہ میرے علم میں نہیں ہے۔ اگر اُس میں یہ خامی ہے بھی تو اللہ اُس پر رحم فرما کر اُسے اس سے نجات عطا فرمائے۔'' یوں 12,15 دن کی پریکٹس کے بعد ہم غیبت سے نجات پالیں گے۔

مختلف کثافتوں سے چھٹکارے کے بعد ہم اُن عادات و اطوار پر کام شروع کر دیں جو اللہ کو بہت پسند ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ صبح ناشتے کی میز پر دن بھر کا Plan بناتے ہوئے ہم یہ بھی سوچیں کہ مجھے آج کم از کم اِتنے لوگوں کی مدد کرنی ہے۔ یہ مدد صرف پیسے سے ہی نہیں ہوتی..... مدد یہ بھی ہے کہ ہم کسی کو سڑک پار

کرنے میں Help کر دیں۔ قطار میں کھڑے ہیں تو کسی ضرورت مند کو اپنی باری دے دیں کہ بھائی آپ تھکے ہوئے لگ رہے ہیں میری باری لے لیں میں آپ کی جگہ کھڑا ہو جاؤں گا۔

آج کل کے دور میں ہم سفارش کر کے لائن میں سب سے پیچھے لگا ہوا اپنا کام سب سے پہلے کروانا چاہتے ہیں۔

مسلمان کے مذہب میں یہ کسی کی حق تلفی ہے اور بہت بڑا گناہ ہے۔ جب ہم سفارش اور رشوت کے زور پر اپنا کام دوسروں سے پہلے کروا رہے ہوتے ہیں تو اُن کی حق تلفی کر رہے ہوتے ہیں...... ہم یہ رویہ ترک کر دیں۔

جب صبح ہم فیصلہ کر لیتے ہیں کہ میں آج اِتنے لوگوں کے کام آؤں گا، دوسروں کی مدد کروں گا، اللہ نے مجھے جو مال و زر عطا کیا ہے اُسے میں لوگوں کے لیے صدقہ کروں گا۔ پھر جب انسان رات کو سونے کے لیے لیٹتا ہے تو اپنا احتساب کرتا ہے کہ صبح جو فیصلہ میں نے کیا تھا اُسے کس حد تک پورا کیا۔

مختلف کثافتوں سے دل کو پاک کرنے کے لیے بھی ہم یہی Method استعمال کر سکتے ہیں کہ ناشتے کی میز پر اپنے آپ سے وعدہ کریں کہ آج میں کسی کی بات کا بُرا نہیں مانوں گا، دل میں کدورت نہیں آنے دوں گا۔ پھر رات کو سونے سے قبل ہم خود سے پوچھیں کہ جن لوگوں نے میری مرضی کے خلاف کام کیے اُن کے خلاف میرے دل میں کچھ ہے تو نہیں۔ جن لوگوں نے مجھے گالی دی اُن کے لیے میرا دل صاف ہے یا نہیں۔

یہاں تشریف لانے والے لوگ روحانیت سے دلچسپی رکھتے ہیں اور متمنی ہیں کہ ہم کسی طریقے سے اللہ کی راہ پر چل نکلیں اور اللہ کی دوستی ہمیں نصیب ہو جائے...... وہ ان ساری باتوں پر عمل کریں جن کا ذکر ہوا ہے۔

اسلام کے بارے میں بہت سی غلط فہمیوں نے جنم لیا۔ ایک صاحب نے بہت صحیح Term استعمال کی کہ اب ہم Part-time مسلمان ہیں۔ واقعی ہم میں سے کچھ نے اسلام کو عبادات، کچھ نے ظاہری شکل و صورت اور اعمال اور کچھ نے محض حقوق العباد تک محدود کر دیا۔ ہم اِس میں سے بندگی کو Miss کر گئے حالانکہ بندگی بہت اعلیٰ مقام ہے۔ اس کے اعلیٰ مقام کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ معراج کا ذکر کرتے وقت رب تعالیٰ نے آپ ﷺ کے لیے لفظ "بندہ" استعمال کیا کہ لے گیا وہ اپنے "بندہ خاص" کو۔ رب تعالیٰ نے آپ ﷺ جو اللہ کے بعد سب سے عظیم ہیں، کے لیے "بندہ" کا لفظ استعمال کیا۔ بندگی اختیار کرنے کے بعد انسان Part-time مسلمان نہیں رہتا۔ وہ ہر لمحہ اسلام کی پابندی کرتا ہے۔ ماں باپ سے سلوک، فیملی کے ساتھ Dealing، پڑوسیوں، رشتہ داروں کے ساتھ تعلقات نوکری غرضیکہ ہر معاملے میں اسلامی احکامات کی پیروی کرتا ہے۔ وہ اسلام کو اپنی زندگی میں یوں نافذ کر لیتا ہے جیسے شٹل کاک برقعہ اوڑھا جاتا ہے۔

ایک چینل پر پروگرام کے دوران مجھ سے اینکر نے پوچھا کہ رب کے فرمان کے مطابق روزہ رکھنے سے انسان متقی ہو جاتا ہے تو پھر یہ دیکھنے میں کیوں آتا ہے کہ افطار سے تھوڑی دیر پہلے سڑکوں پر افراتفری کا عالم ہوتا ہے، ماہ رمضان میں بلیک مارکیٹنگ زیادہ ہو رہی ہوتی ہے؟ اس مہینے میں شیاطین کو زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا

ہے لیکن اس کے باوجود ایسے حالات و واقعات نظر آتے ہیں۔ اُس اینکر کو میں نے جواب دیا کہ ان واقعات اور حالات کا سبب یہ ہے کہ ہم بندگی کی طرف نہیں آتے۔ ہم عبادات پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ ابھی دو روز پہلے تک میں UK میں تھا۔ وہاں ایک مسئلہ بار بار میرے سامنے آیا کہ ایک ٹی وی چینل اور کچھ علاقے کی مساجد میں سحری کے بند ہونے کا وقت 1:15 بتایا جاتا ہے حالانکہ اصل وقت 3:20 تھا۔ یہ دراصل ایک Section of Muslims کی وجہ سے تھا۔

ایک بات یہ بھی سامنے لائی گئی کہ یہاں (UK) میں روزہ 19 گھنٹے کا ہے جو انسانی بس سے باہر ہے۔ اس لیے اسے کٹ کر کے 12 گھنٹے کا کیا جائے۔ یہ سوچ اور طریقہ غلط ہے۔ ہم بندگی کی طرف جانے کے بجائے Convenience کی طرف جانا چاہتے ہیں......

یہی وجہ ہے کہ ہم عبادات کی طرف زیادہ مائل ہو گئے۔ فرض اور نفلی عبادات ضرور کرنی چاہئیں لیکن اسلام صرف عبادات تک محدود نہیں بلکہ بہت وسیع ہے۔ اسلام میں تمام شعبہ ہائے زندگی کے بارے میں احکامات موجود ہیں۔ جب ہم ہر لحاظ سے اسلام کو اپنی زندگی پر لاگو کریں گے تو ہی اصل میں بندگی کریں گے۔

جب انسان بندگی شروع کرتا ہے تو رب تعالیٰ اُسے سینے سے لگا لیتا ہے اور اُسے اپنا دوست بنا لیتا ہے۔

سوال: سورۃ الفاتحہ کے بارے میں مختصراً بتا دیجیے۔ قرآن پاک کی کتابی صورت کا بیک گراؤنڈ کیا ہے؟

جواب: جس طرح سورۃ یٰسٓ قرآن کا دل ہے...... سورۃ الفاتحہ قرآن پاک کا مغز ہے۔ مغز...... دماغ اور نچوڑ دونوں معنوں میں ہے۔ یہ سورۃ دُعا بھی ہے...... جس راہ پر چل کر ہم نجات حاصل کر سکتے ہیں، اُسے یہ تین الفاظ میں بیان کر دیتی ہے...... صراط الذین انعمت۔

اِس سورہ میں رب تعالیٰ کی صفات رحمٰن اور رحیم کا ذکر ہوا...... 30 پاروں کی ابتدا الـــمّ سے جب کہ قرآن پاک کی ابتدا بسم اللہ الرحمن الرحیم سے ہوتی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کو عطا ہوئی...... لوحِ محفوظ پر سب سے پہلے لکھا جانے والا کلمہ یہی ہے۔ یاد رہے لوحِ محفوظ عرشِ معلیٰ پر ہے اور سمندر سے نکلنے والے موتی کی سی چمک دمک رکھتی ہے۔ لوحِ محفوظ پر نظر ڈالیں تو سب سے پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا نظر آتا ہے۔

اگر ہم رب تعالیٰ کے نام سے ہر کام کی ابتدا کرنے کی عادات ڈال لیں تو ہمیں بسم اللہ الرحمن الرحیم کے فیوض و برکات حاصل ہونے لگیں گے۔

سورۃ الفاتحہ کا آغاز بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بعد جن دو الفاظ سے ہوتا ہے وہ ہیں "الحمد للہ"...... سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔ دُعا کے دوران کچھ لوگوں کے سلسلے میں ایک بات بہت واضح طور پر سامنے آئی کہ اگر وہ دل میں "الحمد للہ" کا ورد رکھیں تو اس کے بہت عجیب و غریب اثرات اُن پر مرتب ہوں گے۔ رب تعالیٰ اس لفظ کے صدقے اپنی حمد بیان ہونے سے خوش ہو کر اُن لوگوں کو مشکل حالات سے نکال دیتا ہے اور دشمن کی دشمنی سے انھیں نجات مل جاتی ہے۔

چونکہ قرآن پاک کی ابتدا سورۃ الفاتحۃ سے ہوتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ قرآن پاک کے حوالے سے چند باتیں بیان کردی جائیں۔ مثلاً قرآن کو ترتیل (ٹھہر ٹھہر کر) اور خوش الحانی سے پڑھا جائے تاکہ خود پڑھنے والے اور سننے والے دونوں پر اِس کا اثر ہو۔ ہم عام طور پر قرآن پاک بہت روانی سے پڑھتے ہیں۔ اسی طرح ہم الفاظ کو کھینچ کر ادا کرتے ہیں جیسے اللہ اکبر کہتے ہوئے ہم اکبر کو اِتنا کھینچ دیتے ہیں کہ وہ "اَکبار" ہو جاتا ہے۔ قرآن پاک کو اُسی طرح تلاوت کرنا چاہیے جس طرح کسی پُر وقار محفل میں ایک پڑھا لکھا انسان سنجیدگی اور وقار سے گفتگو کرتا ہے۔

قرآن پاک کے حوالے سے کافی بڑی عمر میں جا کر میری دو غلط فہمیاں دُور ہوئیں۔ قرآن پاک کی دو تراتیب ہیں:

1۔ ترتیب نزولی

2۔ ترتیب کتابی

ترتیب نزولی تو وہ ہے جس کے مطابق حضرت جبرائیل علیہ السلام آپ ﷺ کے لیے وحی لایا کرتے تھے اور مختلف آیات نازل ہوتی تھیں۔ یہ ترتیب موجودہ قرآنی ترتیب سے مختلف تھی۔ آپ ﷺ نے جس جماعت کو وحی تحریر کرنے کی ڈیوٹی سونپی تھی اُسے یہ ہدایات بھی جاری کی تھیں کہ فلاں آیت کو فلاں سورہ میں فلاں جگہ پر لکھ دو۔ کاتبانِ وحی نے آپ ﷺ کی اِن ہدایات پر عمل کیا لیکن دقت یہ آئی کہ آپ ﷺ کے زمانے میں جب قرآن پاک لکھا گیا تو اُس کے لیے کھجور کے پتے، پتھر اور ہڈیاں استعمال کی گئیں۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے زمانے میں جب نبوت کے جھوٹے داعی پیدا ہوئے اور حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے اُن کے خلاف جہاد کا آغاز کیا تو اُن جنگوں میں بڑے پیانے پر حفاظ شہید ہو گئے۔ تب حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکر صدیق ؓ سے عرض کی کہ اے خلیفۃ الرسول! قرآن پاک کو کتابی شکل میں محفوظ کر دیا جائے تاکہ حفاظ کے شہید ہونے کی صورت میں بعد میں آنے والے لوگوں کو قرآن پاک کی صحیح ترتیب اور حالت کے بارے میں دقت نہ ہو۔"

تب حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے ایک صحابی حضرت زید بن ثابت ؓ کے ذمہ یہ کام لگایا۔ اُنھوں نے قرآن پاک کو کتابی صورت دی اور قرآن پاک کو کتاب کی شکل میں محفوظ کر دیا گیا۔ ہوتے ہوتے وہ اُم المومنین حضرت بی بی حفصہ ؓ کے پاس محفوظ کر دیا گیا۔ جب کبھی ضرورت پڑتی اُس قرآن پاک سے Consult کر کے اپنی تصحیح کر لی جاتی۔ حضرت عمر فاروق ؓ کے دور میں فتوحات بہت وسیع پیمانے پر ہوئیں۔ قرآن پاک اہلِ قریش کی لغت کے مطابق نازل ہوا تھا اور اہلِ قریش کے تلفظ کے مطابق اِسے پڑھا جاتا تھا...... سلطنت کے وسیع ہونے سے غیر قریش کے لیے اِسے عربی تلفظ کے ساتھ پڑھنا مشکل تھا۔ اِس لیے ابتدا میں نومسلموں کو قرآن پاک کی طرف راغب کرنے کے لیے اُنھیں ان کے Local dialect میں قرآن پاک کی تلاوت کی اجازت دے دی گئی تھی۔

لیکن ہوا یہ کہ جنگ آرمینیا میں مختلف علاقوں سے مسلمان جنگ لڑنے کے لیے آئے تو اہلِ مدینہ نے

جب اُنھیں تلاوت قرآن پاک کرتے سنا تو اُنھیں وہ لب و لہجہ اجنبی معلوم ہوا۔ تب ایک صحابیؓ نے حضرت عثمان غنیؓ کی خدمت میں عرض کی "اے خلیفۃ المومنین! اگر ہم نے یہ صورت برقرار رکھی تو قرآن بدلتا چلا جائے گا۔ اِس لیے بہتر ہے کہ اِسے اہلِ قریش کے Dialect اور لغت کے مطابق پڑھا جائے تاکہ قرآن پاک میں کسی بھی قسم کی کوئی تبدیلی نہ ہونے پائے۔ یہ بہت عقل مندانہ فیصلہ تھا۔ حضرت عثمان غنی ؓ نے حضرت زید بن ثابت ؓ کے ذمہ یہ خدمت لگائی کہ وہ اہلِ قریش کے Dialect کے مطابق قرآن پاک تحریر کریں۔ ساتھ ہی ہر جگہ یہ احکامات جاری کر دیے گئے کہ کوئی مسلمان Local dialect کے مطابق قرآن پاک نہیں پڑھے گا۔ یہ اُسی اقدام کا نتیجہ ہے کہ آج نومسلم بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ قرآن پاک میں آج تک زیر زبر تک کی تبدیلی نہیں آئی۔ اگر آپ آج بھی برٹانیکا انسائیکلوپیڈیا میں دیکھیں تو اس میں قرآن پاک کے بارے میں لکھا ہوا ہے "یہ کتاب پہلے دن سے آج تک اپنی اصلی حالت میں موجود ہے۔"

یہ قرآن پاک کی کتابی صورت کی بیک گراؤنڈ ہے۔

سوال: جب پیدائش کے وقت انسان کی قسمت لکھ دی جاتی ہے تو پھر نیک و بد کا سوال کیوں؟

جواب: جو قسمت لکھ دی جاتی ہے وہ ٹوٹل تقدیر کا Hardly پانچ سے دس فی صد ہے۔ یہ معین تقدیر یا تقدیرِ مبرم کہلاتی ہے جب کہ تقدیرِ معلق یا غیر مبرم تقدیر ہم خود بناتے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر نیک یا بد ہونا تقدیرِ مبرم میں لکھ دیا گیا ہوتا تو رب تعالیٰ ہمیں کبھی نیک ہونے کی ہدایت نہ کرتا اور صراطِ مستقیم پر چلنے کے طریقے نہ بتاتا۔ رب تعالیٰ ہمیں بہتر زندگی کی راہ کبھی نہ سکھاتا...... اُس نے یہ سب ہمیں دکھا اور بتا کر ہم پر چھوڑ دیا کہ ہم آزاد ہیں اپنی تقدیر کو جیسے چاہیں بنا لیں۔ اگر ہم مجبورِ محض ہوتے تو رب تعالیٰ کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر نہ بھیجتا اور اپنے صحائف اور کتب میں یہ نہ کہتا کہ سیدھی راہ کی طرف آؤ۔

سورۃ الفاتحة کے اہم مضامین کا خلاصہ

آج سے 46 سال پہلے 7 جولائی کو دوپہر ایک بجے میں سوئی گیس میں جب ملازم ہوا تو کسی نے ایک صاحب سے میرا غائبانہ تعارف پروفیسر کے نام سے کرایا۔ بعد میں پتا چلا کہ اُن کا اصل نام بشیر صاحب ہے۔ وہ ٹیلی کام ڈیپارٹمنٹ میں جاب کرتے تھے۔ بہت نفاست پسند تھے۔ اُن کی رائٹنگ ڈیسک پر چیزیں بہت ترتیب سے رکھی ہوتی تھی۔ انتہائی ٹھنڈے مزاج کے خاصے Pleasant آدمی تھے لیکن جب اُن کی ڈیسک پر چیزوں کو بے ترتیب کیا جاتا تو وہ بہت بھنا جاتے اور بڑے عالمانہ Comment دیا کرتے۔ آج کئی سال کے بعد میں اُنھیں یہاں اپنے سامنے بیٹھے دیکھ رہا ہوں...... بہت خوشی ہو رہی ہے۔

سوال: سورۃ الفاتحة کے اہم مضامین بیان فرما دیجیے۔

جواب: سورۃ الفاتحة قرآن کا لازمی حصہ ہے لیکن 30 پاروں کا حصہ نہیں ہے۔ 30 پاروں کی اِبتدا الم سے ہوتی ہے۔ سورۃ الفاتحة پہلے پارے سے بھی پہلے ایک علیحدہ صفحے پر ہوتی ہے۔

قرآن پاک مسلمانوں کا Written constitution ہے۔ پہلے ڈھائی پارے اصل Constitution اور باقی ساڑھے ستائیس پارے اِس Constitution کی Interpretation ہیں۔ سورۃ الفاتحة اِس Constitution کا Gist ہے۔ ہم اسے بجا طور پر قرآن پاک کا مغز کہہ سکتے ہیں۔ سورۃ الفاتحة مکی ہے۔ اِس میں ایک ہی رُکوع ہے۔ اِس میں 7 آیات ہیں اور بسم اللہ الرحمن الرحیم انہی سات آیات کا حصہ ہے۔

سورۃ الفاتحة کو پانچ مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے لیکن سب سے معروف نام ''سورۃ الفاتحة'' ہی ہے۔ لفظ ''فاتحہ'' فتح سے مشتق ہے۔ عربی میں کھلنے کو فاتحہ کہا جاتا ہے۔ اِصطلاحی معنوں میں اِس سے مراد ہے کہ یہ وہ سورہ ہے جو اسرار، رحمتوں اور برکات کو کھولتی ہے۔ اِس کا ایک اور نام ''فاتحة الکتاب'' بھی ہے یعنی یہ سورہ ایسی کتاب کو آپ کے سامنے کھول دیتی ہے جو انسان کے لیے باعث برکت و نجات ہے۔

سورۃ الفاتحة کی اِبتدا بسم اللہ الرحمن الرحیم سے ہوئی ہے۔ بے شک یہ وہ کلمہ ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کو اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی عطا ہوا۔

سورۃ الفاتحة الحمد للہ سے شروع ہوتی ہے۔ ''الحمد'' کے معنی حمد و ستائش کے ہیں لیکن ایک خاص بیک گراؤنڈ کے ساتھ۔ جب کسی کے ایسے کام، وصف یا خوبی کی تعریف کی جاتی ہے جو اختیاری ہو، اپنی مرضی اور ارادے کے تحت کیا گیا ہو تو اُس کی ستائش اور تعریف حمد کہلاتی ہے کیوں کہ صرف رب ہے جو ہر کام اپنے ارادے اور اختیار سے کرتا ہے۔ بظاہر یہ لگتا ہے کہ انسان کوئی بھی کام اپنے ارادے کے تحت کرتا ہے مثلاً آپ نے چاہا کہ میں فلاں چیز اُٹھالوں اور آپ نے وہ چیز اُٹھالی۔ وہ قوت جس سے آپ نے سوچا اور وہ چیز متعلقہ جگہ سے اُٹھائی، وہ انسان کی اپنی نہیں بلکہ اللہ کی عطا کردہ قوت ہے اس لیے انسان کی حمد نہیں بیان کی جاسکتی محض تعریف یا Appreciation کی جاسکتی ہے۔ یہ صرف رب ہے جو ارادہ کرتا ہے اور کام ہو جاتا ہے۔ یہ اُس کی اپنی قوت ہے۔ کسی نے اُسے یہ قوت عطا نہیں کی۔ اس لیے حمد صرف رب تعالیٰ کی ذات کو زیبا ہے۔ ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے، رب کی عطا ہے۔ ''الحمد للہ'' کے بعد ''رب العالمین'' کے الفاظ استعمال ہوئے...... عربی دُنیا کی سب سے زیادہ فصیح و بلیغ زبان ہے۔ اہلِ قریش کو جو فصاحت و بلاغت حاصل تھی وہ کسی اور ملک یا قوم کو حاصل نہ تھی۔ اہلِ قریش کی عربی زبان پر دسترس مثالی تھی۔ قرآن پاک اہلِ قریش کی عربی لغت کے مطابق نازل ہوا تھا۔ خلفائے راشدینؓ ایسے بیدار ذہن تھے کہ جب فتوحات کے نتیجے میں مسلم سلطنت وسیع ہوئی اور عرب کے ساتھ ساتھ عجم ممالک بھی مسلمانوں کے زیرِ تسلط آئے، یورپ میں آدھا فرانس مسلمانوں کے قبضے میں آگیا تو Dialect تبدیل ہونے کی وجہ سے عجمیوں کے لیے قرآن پاک کو اُس کے اصل تلفظ کے ساتھ پڑھنا ممکن نہ رہا۔ تب خلفائے راشدینؓ نے قرآن پاک کو اصلی صورت میں برقرار رکھنے کے لیے اِسے اہلِ قریش کے Dialect کے مطابق کتابی شکل دی اور یہ پابندی لگا دی کہ تمام لوگ اِسے اہلِ قریش کے Dialect کے مطابق پڑھیں گے تاکہ قرآن پاک میں کوئی Addition یا Alteration نہ ہونے پائے۔

''رب'' پالنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ رب کے ایک اور معنی بھی ہیں ''تربیت دینے والا''۔ وہ استعداد یا Abilities جو کسی شخص میں پیدائشی، جبلی اور فطری طور پر موجود ہوں اُنھیں Gradually develop کرتے کرتے نقطۂ عروج پر پہنچا دینا ''تربیت'' کہلاتا ہے۔ رب تعالیٰ پالنے والا بھی ہے اور تربیت دینے والا بھی۔ سورۃ الفاتحة میں لفظ ''رب'' اِن دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ قرآن پاک انسان کی تربیت کر رہا ہے، انسان میں جو Capacities اور Abilities جبلی طور پر موجود ہیں یہ اُن کو Develop کر کے نقطۂ عروج پر پہنچا دیتا ہے۔

''رب العالمین'' میں لفظ ''عالمین'' عالم سے اور عالم ''علم'' سے ہے۔ ''علم'' نشانی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ''رب العالمین'' کا مطلب ہے تمام نشانیوں کا رب، سب کو پالنے اور تربیت دینے والا۔

ہم ہوش سنبھالنے سے مرتے دم تک یہ سنتے رہتے ہیں کہ جس نے خود کو پہچانا اُس نے رب کو پہچان لیا۔ رب کو پہچاننے کے لیے جو نشانیاں چاہییں ''عالمین'' اُنہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ رب مالک ہے

ان تمام نشانیوں کا۔ "مالك يوم الدين "۔ عربی میں "مالک "Almost اُنہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے
جن معنوں میں اُردو میں...... لیکن تھوڑے سے فرق کے ساتھ۔ عربی میں "مالک" اُسے کہتے ہیں جسے اختیارِ کلی
ہو، جو اپنی ملکیت میں موجود چیزوں کو جب اور جیسے چاہے استعمال کر سکے۔

"يوم الدين" روزِ سزا و جزا اور یومِ حساب کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

سورۃ الفاتحۃ قرآن پاک کے اِبتدائی ڈھائی پاروں (سورۃ البقرہ) کا Gist ہے۔ اِن ڈھائی پاروں
میں بتایا گیا ہے کہ انسان اپنی زندگی کیسے گزارے۔ زندگی صرف عبادات تک محدود نہیں بلکہ تمام پہلو سمیٹے
ہوئے ہے۔ دقت اُس وقت ہوتی ہے جب انسان اسلام کو ایک خاص حد تک محدود کرنا چاہتا ہے۔ اِسی لیے
مغربی مفکر کہتے ہیں:

"مشرق میں مسلمان بہت دیکھے لیکن اسلام کہیں نظر نہ آیا۔ مغرب میں اسلام ہر جگہ دیکھا، مسلمان کہیں
نظر نہ آئے۔"

یہ اِسی وجہ سے ہے کہ ہم اسلام کو ایک خاص Sphere تک محدود کر کے اپنی Convenience کے
مطابق اس پر عمل کرنا چاہتے ہیں۔

علم اور معلومات

جو لفظ ہمارے رویوں کو مثبت انداز میں نہ بدل سکیں وہ علم نہیں بلکہ معلومات ہیں لیکن جو الفاظ یا معلومات
ہمارے رویوں کو مثبت انداز میں بدل دیں وہ علم ہیں۔

علم آیا کہاں سے؟

رب تعالیٰ کی Proverbial کرسی جس کا ذکر آیت الکرسی میں ہے، ساری کائنات کو محیط کیے ہوئے
ہے۔ وہ رب کی Omnipresence اور سب چیزوں پر محیط قدرت کو Explain کرتی ہے۔
رب تعالیٰ کی ایک Virtual نشست ہے جہاں بیٹھ کر شبِ معراج رب نے آپ ﷺ سے گفتگو کی
تھی...... اب آپ کے ذہن میں یہ سوال اُبھرے گا کہ یہ Virtual نشست کہاں ہے؟
ہم اذان کے بعد دُعا کرتے ہیں جس میں یہ الفاظ ہیں "اے اللہ! تو آپ ﷺ کو مقامِ محمود عطا فرما
جس کا تو نے اُن ﷺ سے وعدہ فرمایا ہے۔ بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔" یہ مقامِ محمود بھی
عرش پر ہے۔

رب تعالیٰ کی Virtual نشست کے پیچھے ہمیں لہریں مارتا ہوا نور کا سمندر دکھائی دیتا ہے۔ اِس سمندر
سے نکلنے والی مختلف نہروں میں علم کی نہریں بھی ہیں جن کی تعداد 81000 ہے۔ رب تعالیٰ نے انسان کو یہ
موقع فراہم کیا ہے کہ وہ چاہے تو یہ علوم حاصل کر لے۔ یہ اور بات کہ علم کی زیادتی سے بعض اوقات انسان
بھٹک جاتا ہے۔
علم کی زیادتی بھی بعض اوقات انسان کو بھٹکا دیتی ہے۔ یہی وہ مقام

آتا ہے۔ یہ جو اکثر و بیشتر ہم لوگ کہتے ہیں کہ گائیڈ یا مرشد کا ہونا بہت ضروری ہے تب کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ
مرشد نہ جانے کیسی ماورائی قوتوں کا مالک ہے، معاذ اللہ، کہ اُس سے منسلک ہونے کے بعد ہم حفاظتی حصار میں
آجائیں گے، معاذ اللہ، اور وہ ہمیں ہر مصیبت سے بچائے رکھے گا۔

ایسا نہیں ہے...... مرشد بھی ہماری ہی طرح رب کا محتاج بندہ ہے۔ وہ اس پر بھی قادر نہیں کہ اپنی کمر پر
بیٹھی مکھی بھی اپنی مرضی سے اُڑا سکے۔ جو اپنی حفاظت نہیں کر سکتا اور اپنی حفاظت کے لیے رب کا محتاج ہے، وہ
کسی کی حفاظت کیا کرے گا۔ ہاں اُسے مجھ پر اور آپ پر جس وجہ سے Edge حاصل ہے وہ یہ کہ اللہ نے اُسے
علم عطا کیا ہے۔

اگر مرشد کامل ہو تو وہ اپنے مرید کے تصورات کو درست رکھتا ہے اپنی ذات کے بارے میں۔ وہ اپنے
پاس آنے والوں کو سمجھاتا رہے گا کہ میں بھی اُتنا ہی رب کا محتاج ہوں جتنا تم سب۔ میں تمھارا کچھ سنوار سکتا
ہوں نہ بگاڑ سکتا ہوں...... صرف یہ کر سکتا ہوں کہ رب نے مجھے جو علم عطا کیا ہے وہ تمھیں ٹرانسفر کر دوں۔ جب
انسان علم سیکھ لے اور اُس کی زیادتی سے بہکنے لگے تو تب مرشد کام آتا ہے۔ وہ بازو سے پکڑ کر مرید کو جھنجھوڑ دیتا
ہے، جگا دیتا ہے اور اُسے گائیڈ کرتا ہے، بھٹکنے نہیں دیتا۔ مرشد کا یہی کام ہے...... یہ نہیں کہ اُس کے پاس جا کے
روتے رہیں کہ میرا یہ کام اٹک گیا، میں فلاں مصیبت میں پھنس گیا، میری فلاں دُنیاوی مشکل ہے، میں بے
ایمانی اور چوری کرنا چاہتا ہوں...... آپ دُعا کر دیجیے کہ میں اِس میں کامیاب ہو جاؤں۔ میں رشوت دے آیا
ہوں، آپ دُعا کر دیجیے کہ وہ شخص رشوت لے کر میرا کام کر دے۔ مرشد اپنی حلیمی اور بُردباری کی وجہ سے آپ
کی سب باتیں سنتا ہے اور مسکرا دیتا ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ مجھ جیسے بھٹکے ہوئے لوگوں کو یہ کہہ کر سیدھی راہ
دکھا دے کہ 'میاں جاؤ جا کر کوشش کرو، اللہ مہربانی کرنے والا ہے، وہ بہتری فرمائے گا۔' یہ کہہ کر مرشد اپنے
پاس آنے والوں کو رب کی طرف دھکیلتا ہے کہ اللہ کے بتائے راستے کی طرف چلے جاؤ۔

بات علم کی ہو رہی تھی۔ علم کے بارے میں ہم لوگ مختلف ابہام کا شکار رہتے ہیں۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ
یہ علم الکلام ہے جو انسان کو حاصل کرنا چاہیے جب کہ کچھ لوگ علم فقہ اور کچھ علم الکتاب کے حصول پر زور دیتے
ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے 81000 علوم انسان کے لیے اُتارے ہیں۔ آپ ﷺ کے فرمان کے مطابق ہر مسلمان
مرد اور عورت پر علم کا حصول فرض ہے۔ علم خواہ کوئی بھی ہو انسان کو حاصل کر لینا چاہیے لیکن جہاں کوئی انسان علم
میں Confusion کا شکار ہونے لگے وہاں وہ اپنے مرشد سے Guidance ضرور لے لے ورنہ وہ
Track سے ہٹ جائے گا۔

سوال: حاجی حافظ عالم پناہ پیر سید وارث علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ دیول شریف انڈیا کے بارے میں کچھ ارشاد فرمائیں۔
کیا وارثی سلسلہ اُنہی سے شروع ہوا؟

جواب: جناب حاجی حافظ پیر سید وارث علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ حاجی وارث پاک کے نام سے مشہور ہیں۔

سلسلہ چشتیہ صابریہ کے لوگ اُن کے معتقد ہیں۔ سلسلہ وارثیہ کی اِبتدا بھی اُنھی سے ہوئی۔ اُن کا مزار لکھنؤ سے تقریباً 35 کلومیٹر باہر دیول شریف میں ہے۔

جناب حاجی حافظ پیر سید وارث علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت بلند پایہ ولی اللہ ہیں۔ اُن کا روحانی فیض آج بھی جاری ہے۔ ان کی پارسائی اور تقویٰ کا اندازہ اس بات سے لگالیں کہ حج سے آنے کے بعد بھی اُنھوں نے احرام نہ کھولا۔ مرتے دم تک حالتِ احرام میں رہے اور اِس کے تمام Protocols کو Maintain کرتے رہے۔ یہ بات بظاہر ہمیں آسان لگتی ہے ورنہ احرام کے Protocols کو Observe اور Maintain کرنا عام انسان کے لیے آسان نہیں ہوتا۔

سوال: کیا وارثی سلسلہ فقیری لائن کا تسلسل ہے؟

جواب: بالکل یہ درویشانہ زندگی ہی کا جزو ہے۔ جن لوگوں نے سلسلہ وارثیہ میں تربیت پائی وہ بہت کمال کے پرہیزگار اور متقی ہیں۔

سوال: وارثی سلسلہ میں پیلا لباس کیوں پہنا جاتا ہے؟

جواب: اصل میں جناب حاجی وارث پاک صاحب پیلا تو نہیں کہہ سکتے ہلکا Mustard احرام باندھتے تھے اور Shoulder پر رومال بھی Light mustard کلر کا استعمال کرتے تھے۔ اُن کے ماننے والے اور مریدین اُن کو Follow کرتے ہوئے ہلکا Mustard لباس یا رومال استعمال کرتے ہیں۔

اِس میں رُوحانیت کو دخل نہیں۔ وارثی سلسلے کے بانی نے چوں کہ اِس رنگ کا لباس پہنا اِس لیے اُن کے مریدین اُن کی اتباع میں یہ رنگ پہنتے ہیں۔

سوال: آپ کے مرشد سید یعقوب علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام کے ساتھ بھی وارثی لکھا جاتا ہے۔ کیا وہ بھی وارثی سلسلے سے بیعت تھے؟

جواب: میرے مرشد صاحب بیعت تو سلسلہ چشتیہ صابریہ میں تھے لیکن تربیت کے لیے اُنھیں وارثیہ سلسلے میں بھیج دیا گیا اور ساری تربیت وارثیہ سلسلے میں ہوئی اِس لیے اُن کے نام کے ساتھ وارثی بھی لکھا جاتا ہے۔

سوال: ''رُوحانیت، سائنس، علم فلکیات اور سال 2012ء'' کتاب کے مصنف فواد صدیقی نے اپنی اُس کتاب میں 21 دسمبر 2012ء کو سب سے ہولناک دن قرار دیا ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ دُم دار ستارے کی ٹکر کے علاوہ زمین کی طرف Solar flare آئے گا اور چاند کے کچھ ٹکڑے علیحدہ ہو کر زمین سے ٹکرائیں گے۔ یہ لوحِ محفوظ پر لکھا ہے۔ تمام دُنیا میں تباہی پھیلے گی۔ سترہ ارب میں سے دو ارب آبادی بچے گی۔

جواب: ایسی پیش گوئیاں پہلے بھی بہت ہوتی رہی ہیں۔ رب تعالیٰ انھیں جھوٹا کر دیتا رہا ہے۔ میرے ایمان کے مطابق صرف رب جانتا ہے کہ کب کیا ہوگا۔ دُم دار ستارے ہوں یا بغیر دُم کے ستارے، چاند ہو یا سورج یا مجھ جیسے سرکش لوگ...... سب رب کے ماتحت ہیں اور رب کے دائرہ قدرت میں ہیں۔ صرف رب ہے جو جب جو چاہتا ہے، کرتا ہے۔ مختلف ستارے وقتاً فوقتاً زمین پر ٹوٹ کر گرتے رہتے ہیں۔ مختلف سائنس دانوں کو زمین کے مختلف حصوں سے اُن کے ٹکڑے بھی ملے ہیں جنھیں شہاب ثاقب کہتے ہیں۔ یہ روٹین کا کام ہے جو

ہوتا رہتا ہے۔ درحقیقت یہ روایت West سے چلی تھی کہ 21 دسمبر 2012ء کو قیامت آجائے گی۔ ہمارے ہاں چونکہ فیشن ہے اس لیے ہم West کی بات کو من وعن تسلیم کر لیتے ہیں۔

میں پورے یقین سے کہہ دیتا ہوں کہ 21 دسمبر 2012ء کو قیامت نہیں آئے گی کیوں کہ آپ ﷺ نے قیامت کی جو نشانیاں بیان فرمائی ہیں اُن میں سے بہت سی بڑی بڑی نشانیاں ابھی پوری نہیں ہوئیں۔ مثلاً نہ حضرت امام مہدیؑ کا ظہور ہوا، نہ دجال آیا، نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے، نہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان وہ جنگ ہوئی جو دریائے اُردن کے کنارے ہوگی۔

اِس لیے میں سمجھتا ہوں کہ 21 دسمبر 2012ء کو قیامت نہیں آئے گی۔ پھر بھی ہمیں ہر وقت رب کی پناہ مانگنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں تمام مصائب سے بچائے رکھے۔ کم از کم مجھ جیسے گناہ گار کے لیے سب سے Safe راستہ یہ ہے کہ رب سے ہر وقت اُس کا رحم مانگا جائے اور یہ دُعا کی جائے کہ یا اللہ! تو مجھے اپنی پناہ میں لے لے اور تُو مجھے ہر قسم کے آلام ومصائب سے محفوظ رکھ۔ آمین!

دس کثافتیں

جب ہم اپنی ذات پر غور کرتے ہیں کہ کس طرح ہم عالم ارواح سے عالم الاسباب میں آئے اور عالم الاسباب سے ہم عالم برزخ میں چلے جائیں گے تو پھر ہمارا ذہن اُس قوت کی طرف جاتا ہے جو دکھائی نہیں دیتی لیکن محسوس ہوتی ہے۔ وہ غیر مرئی قوت جس کا کہیں وجود نہیں لیکن ہر جگہ وجود ہے...... اُس قوت اور ذات کو کیسے پہچانا جائے!

ہم اپنے آپ کو Examine کرتے اور دیکھتے ہیں کہ کس طرح ہم ایک ناپاک قطرے سے ایک چھ فٹ کے نوجوان کی صورت میں وجود میں آگئے۔ تب احساس ہوتا ہے کہ جس قوت نے یہ سب کیا وہ سب سے زیادہ طاقت ور ہے۔ لیکن وہ قوت کیسی ہے؟ یہ جاننے کے لیے ہمیں اپنے اندر کو کھوجنا پڑے گا۔ مثلاً انسان مہربان ہے، اِس میں اللہ نے معاف کر دینے کی صلاحیت رکھی ہے۔ انسان کو غصہ آتا ہے، وہ انتقام لیتا ہے، بخی ہے۔ اسی طرح اس میں بہت سے Virtues ہیں۔ اِسی ریفرنس سے اگر ہم آگے چلتے جائیں تو ہمیں رب تعالیٰ کی صفات کا ادراک ہوتا چلا جائے گا اور اُن صفات کا عکس انسان میں نظر آنے لگے گا۔ لیکن یہ نہیں کہ اِس سے ہمیں رب کی حد کا پتا چلے گا۔ رب تعالیٰ کی قوتیں بے حد وحساب ہیں، انسان کے ساتھ اُن کا موازنہ نہیں کیا جاسکتا لیکن ایک ریفرنس ضرور ہے کہ رب کے Virtues ایسے ہوں گے کیونکہ رب تعالیٰ نے اپنے تمام Virtues کا عکس انسان میں رکھا سوائے رحمٰن کے...... رحمٰن صرف رب ہے۔ جب ہم رب تعالیٰ کو اِس ریفرنس سے دیکھیں گے تو اُسے مزید جاننے اور پہچاننے کا شوق ہمارے اندر پیدا ہوگا۔

رب کی ذات پر کبھی غور نہ کریں کہ وہ کیسا ہے...... یہ منع ہے کیونکہ انسان کی عقل اِتنی کمزور و ناقص ہے کہ رب تعالیٰ کی ذات پر غور کرنے سے انسان بھٹک جائے گا۔ رب کی صفات اور قدرت پر غور کرنے سے ہم رب کو پہچاننے لگیں گے۔

جب ہم غور کریں کہ رب اپنی صفات میں کیسا ہے تب ہمیں ایک آئینہ کی ضرورت ہوگی جس میں ہم اُس کا عکس دیکھ سکیں۔ وہ آئینہ ہمارا دل ہے اور آئینے میں کوئی شبیہ تب تک صاف دکھائی نہیں دیتی جب تک وہ صاف نہ ہو۔

انسان کے اندر ایسی دس Negative عادات یا کثافتیں ہیں کہ جب تک وہ ختم نہ ہو جائیں انسان کا دل

صاف نہ ہوگا اور جب تک دل صاف نہ ہوگا وہاں رب نہیں بسے گا۔

رب تعالیٰ پاک، صاف اور نفاست پسند ہے۔ وہ وہیں رہتا ہے جہاں Negative چیزیں نہ ہوں۔ اِن دس Negative عادات یا کثافتوں میں پہلی کثافت ''کینہ'' ہے۔ جب تک انسانی دل سے کینہ بالکل نہ نکل جائے تب تک وہاں رب نہیں بستا۔

دوسری کثافت ''بغض'' اور تیسری ''حسد'' ہے۔ اس کے بعد دو ایسی کثافتیں ہیں جو ہمیں بہت عزیز ہیں خاص طور پر اس خطۂ زمین پر رہنے والے 18 کروڑ لوگ اُنھیں بہت چاہت اور پیار سے پالتے ہیں...... وہ ہیں غیبت اور غصہ۔ غیبت کتنی بُری چیز ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگالیں کہ ایک بار ایک صحابیؓ انتہائی پریشانی کے عالم میں دوسرے صحابہ کرامؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ صحابہ کرامؓ نے اُن سے پریشانی کا سبب دریافت کیا تو انھوں نے کہا'' آج مجھ سے ایسا گناہ سرزد ہوگیا ہے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی وجہ سے کہیں میرے تمام اعمال ضائع نہ ہو جائیں اور مجھے اِس پر شدید سزا نہ ملے۔ آج میں نے اپنی Wife سے بے وفائی کی ہے۔'' یہ سن کر صحابہ کرامؓ نے فرمایا'' ہم تو آپ کی پریشانی کی شدت دیکھ کر یہ سمجھے تھے کہ شاید آپ سے کسی کی غیبت ہوگئی ہے۔''

اِسی طرح ہم غصے کو پالتے ہیں۔ میرا مشاہدہ ہے کہ جو انسان غصے میں عقل کھو دیتا ہے اور اُسے اپنی زبان پر کنٹرول نہیں رہتا وہ خواہ کتنا ہی عبادت گزار کیوں نہ ہو رب کے قریب نہیں پہنچ پاتا۔

آپ میں سے اکثر حضرات شاید یہ سوچیں کہ یہ تو پاگل پن ہے۔ اللہ ہمیں قریب کیوں نہیں کرے گا؟ وجہ یہ ہے کہ اگر میں غصہ میں ہوں اور زبان پر کنٹرول نہیں کرتا تو دل کا چاہے جتنا بھی اچھا ہوں غصے میں آکر اپنے مسلمان بھائی کو بُرا بھلا کہہ کر اُس کی دل آزاری کرتا ہوں۔ غصے سے نکلنے کے بعد میں اُس مسلمان بھائی کو جتنا بھی Compensate کرلوں لیکن اُس کا دل تو پہلے میں دُکھا چکا۔ رب کو یہ پسند نہیں ہے کہ کوئی اُس کے بندوں کا دل دکھائے۔ اُسے تو اپنے منکرین کا دل دُکھانا بھی گوارا نہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ جن لوگوں نے کسی منکرِ خدا کا بھی دل دکھایا، وہ رب کے قریب نہ جا پائے۔

اِس لیے فقیر خاص طور پر اپنا غصہ ختم کر دیتے ہیں، کسی کا دل نہیں دُکھاتے۔ وہ کسی کو No نہیں کہہ سکتے۔ حالانکہ Management میں کہا جاتا ہے کہ سب سے Effective executive وہ ہوتا ہے جو سب سے پہلے No کہنا سیکھتا ہے۔ آج سے 46 سال پہلے گورے نے مجھے یہ بات پڑھائی تھی لیکن فقیر کا طرزِ عمل اس Management سے مختلف ہوتا ہے۔ فقیر کسی کو No نہیں کہہ سکتا۔ اِس لیے نہیں کہ اُس میں اخلاقی جرأت نہیں ہوتی بلکہ اس لیے کہ وہ No کہہ کر کسی کا دل نہیں دُکھانا چاہتا۔ اُسے ڈر لگتا ہے کہ کہیں اس طرح وہ رب کی گرفت میں نہ آجائے۔

یوں دس کثافتوں میں سے چھٹی کثافت دوسروں کی دل آزاری ہے اور ساتویں کثافت کسی کے کام آنے کے بجائے اُنھیں ''No'' کہنا ہے۔

ایک اور خامی یا کثافت جو ہمیں بہت عزیز ہے وہ ہے حرصِ کلام (Tale end پر یہ تیسری خامی ہے) کہ میں بات کروں...... دوسرا نہ کرے۔

اسی طرح حرصِ طعام ہے۔ ہم کھاتے چلے جاتے ہیں۔ مجھے کالج کے زمانے کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ میرے کزن کے دوست تھے ربانی صاحب۔ وہ جب بھی ہماری طرف آ کر ٹھہرتے تو چونکہ میں فیملی میں سب سے کم عمر تھا (تب فرسٹ ایئر میں پڑھتا تھا) اس لیے میری ڈیوٹی تھی کہ اُن کو Look after کروں۔ اُنھیں نہ جانے کیسے یہ گمان ہوا کہ میں بھی اہلِ زبان ہوں۔ ایک روز ربانی صاحب مجھے کہنے لگے کہ سرفراز! چلیے ایک جگہ چلتے ہیں۔ جب ہم وہاں پہنچے تو دو صاحبان کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ ربانی صاحب اُنھیں غور سے دیکھتے رہے اور اُن کے فارغ ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ جب انتظار طویل اور کھانے کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا تو بولے ''سرفراز! ایک پنجابی اور اہلِ زبان میں اتنا ہی فرق ہے جتنا بھینس اور بکری میں۔'' میں چونکہ خود پنجابی تھا اس لیے قدرے چونک کر اُنھیں دیکھا۔ مزید گویا ہوئے کہ اہلِ زبان بکری کی طرح ہیں۔ جیسے بکری کھا رہی ہو تو ایک بار ''ہش'' کر دیں تو وہ چارہ چھوڑ دیتی ہے جب کہ بھینس تب تک کھرلی میں سے منہ نہیں نکالتی جب تک اُسے دو چار ڈانگیں نہ پڑ جائیں۔'' اُن کی یہ بات سن کر میں نے دبی زبان میں کہا ''ربانی صاحب! میں بھی پنجابی ہوں۔'' اس پر اُنھیں جھٹکا لگا، کہنے لگے ''اچھا واقعی! آپ پنجابی لگتے تو نہیں۔''

جملۂ معترضہ کے طور پر عرض کرتا چلوں کہ ربانی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ایک بہت زبردست کوالٹی عطا کی تھی۔ ایک رات جب میں اُنھیں کھانا سرو کرنے کے بعد برتن لینے اُن کے کمرے میں گیا تو پوچھنے لگے ''سرفراز صاحب! آپ کا پورا نام، والدہ کا نام، Date and place of birth کیا ہے؟'' ادب کے تقاضے کے تحت میں نے اُنھیں سب معلومات فراہم کر دیں۔ اگلی صبح جب میں ناشتا لے کر اُن کے کمرے میں گیا تو اُنھوں نے سات انچ لمبا اور 5 انچ چوڑا ایک پیپر مجھے دیا جس پر پنسل سے میرے بچپن سے لے کر 55 سال تک کی عمر کے خاص خاص واقعات درج تھے۔ میں چونکہ شروع ہی سے پامسٹری، آسٹرالوجی، تعویذ دھاگے یا جادو ٹونا پر یقین نہیں رکھتا تھا کہ میرا عقیدہ ہے کہ Foretelling رب کے سوا کوئی نہیں جانتا اس لیے میں نے اس پیپر کو توجہ سے پڑھے بغیر کہیں رکھ دیا۔

1999ء میں تین پرانی چیزیں نہ جانے کہاں سے برآمد ہو گئیں...... ٹکا، چار کوڑیاں اور ربانی صاحب والا پیپر۔ ٹکے کا قصہ کچھ یوں ہے کہ جب میں پانچویں کلاس میں پڑھتا تھا تب اپنی والدہ کے ہمراہ ایک بزرگ کے پاس گیا تھا (اب وہ حیات نہیں۔ اُن کا مزار میانی صاحب میں ہے۔) اُنھوں نے مجھے ایک ٹکا دیا تھا۔ کئی سال بعد 1999ء میں وہی ٹکا مجھے اپنی ڈریسنگ ٹیبل پر پڑا ملا...... اس پر کائی جمی ہوئی تھی۔

اسی طرح ایک بزرگ جنھیں دُنیا سے رخصت ہوئے تقریباً چھ سو سال گزر چکے اُنھوں نے مجھے چار کوڑیاں عطا کی تھیں۔ (کیونکہ اُن کے دور میں کوڑیاں بطور زر استعمال ہوتی تھیں۔) وہ کوڑیاں بھی ایک مدت کے بعد 1999ء میں مجھے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی ہوئی ملیں۔ ربانی صاحب کا پیپر بھی ایک دن وہیں سے ملا تو مجھے حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہوئی۔ اُسے دوبارہ پڑھا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس میں درج واقعات میں سے کوئی بھی واقعہ ایسا نہیں تھا جو میری زندگی میں ہوا نہ ہو۔ اُنھوں نے لکھا تھا کہ 55 سال کی عمر میں میں پاگل ہو جاؤں گا یا مجھے کوئی حادثہ پیش آئے گا اور پھر ہوا یہ کہ 55 سال کی عمر میں میں اس قدر کنگال ہو گیا کہ قریبی عزیز باضابطہ طور پر مجھے کہنے لگے ''شاہ صاحب! آپ اللہ کو پکارتے رہتے ہیں اس لیے بچ گئے ورنہ عام لوگ تو ایسے حالات میں خودکشی کر لیا کرتے ہیں۔'' ربانی صاحب انتقال کر چکے...... تلاش مت کیجیے گا کہیں نہیں ملیں گے۔ (یہ جملے از راہِ تفنن کہے گئے۔)

حرصِ طعام سے بات چلی تھی۔ حرصِ طعام رب کو پسند نہیں۔ اس میں مبتلا شخص رُوحانیت کی راہ پر نہیں چل پائے گا۔ ایک اور بُرائی یا کثافت حرصِ جاہ کی ہے۔ جس دل میں یہ خواہش ہو کہ لوگ میری عزت کریں، میری تعظیم میں کھڑے ہوں...... اُس دل میں رب نہیں بستا۔

جیسا کہ سیدنا امیر معاویہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص چاہے کہ لوگ اُس کے لیے (تعظیم میں) اُٹھ کر کھڑے ہوں، اُسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔'' (جامع ترمذی، باب ماجاء فی قیام الرجل للرجل، حدیث نمبر:2754)

حرصِ جاہ اُن دس Negative چیزوں یا خامیوں میں سے Last ہے۔ اگر ہم رب تعالیٰ کو پانا چاہتے ہیں تو ہمیں اُن دس کثافتوں سے چھٹکارا پانا پڑے گا۔ دل کو صاف کرنے کا ایک طریقہ مراقبہ بھی ہے۔ مراقبہ کے لیے ایسی جگہ بیٹھیے جہاں آپ روز بیٹھتے ہوں اور جہاں شور نہ ہو۔ Familiar جگہ پر بیٹھنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ اعصاب پر تناؤ محسوس نہیں ہوگا۔ اعصابی تناؤ یا Tension کی صورت میں مراقبہ نہیں ہوتا۔ Meditaton (مراقبہ) کے مختلف Postures ہیں۔ کچھ لوگ التحیات والے Posture تو کچھ Cross-legged posture میں بیٹھتے ہیں اور سر کو اتنا جھکا لیتے ہیں کہ تھوڑی سینہ کو Touch کرنے لگتی ہے۔

مراقبہ کرتے ہوئے ابتدا میں تصور کیجیے کہ دل کو دیکھ رہے ہیں۔ دو چار دن تو اندھیرا دکھائی دے گا لیکن مایوس نہ ہوں چند دن بعد اُسی اندھیرے میں ہلکی سی روشنی نظر آنے لگے گی اور پھر آپ کو گہرے گلابی رنگ کا چمکتا ہوا اپنا دل دکھائی دے گا۔ تب اُس پر نظر جما کر تصور کیجیے کہ اُس پر ''اللہ'' کا نام لکھا ہے۔ چند مہینوں میں آہستہ آہستہ ''اللہ'' کا نام Visible ہونے لگے گا۔ اللہ کا نام دل پر واضح ہونے کے بعد بھی اگر آپ مراقبہ کرتے رہے تو پھر یوں ہوگا کہ جیسے ہی آپ مراقبہ میں بیٹھے چند ہی منٹوں میں اللہ کا نام دل پر لکھا آنکھوں کے سامنے آ جائے گا۔ جب ایسا ہو تو سمجھ لیں کہ آپ کا مراقبہ ہو گیا۔ (میں نے کبھی مراقبہ کیا ہی نہیں۔ یہ تو پڑھی ہوئی باتیں آپ کو بتاتا جا رہا ہوں۔)

جب ہم دل پر نظر ڈالتے ہیں اور وہاں اللہ کا نام لکھا نظر آتا ہے تو اِس کا مطلب ہے کہ ہم وقتی طور پر دُنیا سے کٹ گئے ہیں، دُنیاوی پریشانیوں اور کثافتوں سے دُور ہو گئے ہیں لیکن اگر یہ دس کثافتیں یعنی کینہ، بغض، حسد، غیبت، غصہ، دوسروں کی دل آزاری، کسی کو "No" کہنا، حرصِ کلام، حرصِ طعام اور حرصِ جاہ ہوں گی تو دل صاف دکھائی نہیں دے گا۔ دل صاف نہیں ہوگا تو وہاں رب نہیں آئے گا۔

اب جو بات کہنا چاہ رہا ہوں وہ اصل موضوع سے ہٹی ہوئی ہے لیکن In the and اِس سے مل جائے گی۔

ہم پر جب کوئی مشکل آتی ہے، اپنے بچے کو کسی تکلیف یا ضرورت میں دیکھتے ہیں یا ہمارا کوئی اور دُنیاوی کام اٹکا ہوتا ہے تو ہمارے رویے ایسے ہو جاتے ہیں جو اہل اللہ کے نہیں، جو اللہ کے چاہنے والوں کے رویے نہیں ہوتے۔ ہوتا یہ ہے کہ ہم اپنی تکلیف دوسروں کے سامنے بیان کرتے ہیں۔ ہم کسی دُعا کرنے والے کی تلاش میں نکلتے ہیں اور اُس کے سامنے اپنا دُکھ بیان کرتے ہیں۔ اگر آپ گہری نظر سے یہ معاملہ دیکھیں تو اس طرح درحقیقت ہم اپنے رب کا شکوہ اور شکایت بیان کر رہے ہوتے ہیں۔ ایسے موقع پر اگر کوئی مجھ سے کہے ''سرفراز صاحب! آپ اللہ کا شکوہ بیان کر رہے ہیں۔'' میں فوراً کہوں گا ''نہیں صاحب! میں تو اللہ کا بڑا شکر گزار بندہ ہوں۔'' اِس طرح کہہ کر میں نے ایک اور غلطی کی کہ اگر میں نے شکر ادا بھی کیا تھا تو اُسے بھی میں نے کنوئیں میں ڈال دیا کیونکہ میرے ذہن میں یہ بات اٹکی ہوئی ہے کہ میں اپنے رب کا بڑا شکر گزار بندہ ہوں۔ یوں یہ بات تکبر میں چلی گئی۔ اس طرح رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔

جب ہم اپنی تکلیف میں ہائے ہائے کرتے ہیں تو اُسے دو زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک Angle تو یہ کہ اپنی زندگی کا اچھا وقت میں نے گزارا تو یہ تکلیف دہ وقت بھی مجھے ہی گزارنا ہے۔ اگر اچھا وقت میں Enjoy کرتا رہا ہوں تو بُرا وقت بھی میں ہی بھگتوں گا۔ دوسرا Angle یہ ہے کہ مشکل وقت میں زبان یا دل میں کوئی شکوہ لاتے ہوئے انسان اپنے رب سے شرمانے لگتا ہے کہ جس رب نے اِتنا عرصہ مجھے سکون اور سکھ میں رکھا، اب اُس کی طرف سے یہ تکلیف آئی ہے تو مجھے چاہیے کہ اچھے وقت کی طرح میں بُرے وقت میں بھی اللہ کا شکر ادا کرتا رہوں۔

کٹھن حالات کو ایک اور زاویے سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ سورۂ یٰس میں اللہ نے فرمایا:

پاکی ہے اُسے جس نے سب جوڑے بنائے اُن چیزوں سے جنھیں زمین اُگاتی ہے
اور خود اُن سے اور اُن چیزوں سے جن کی اُنھیں خبر نہیں۔ (یٰس:36)

آپ دیکھ لیجیے ہماری زندگی میں سُکھ ہے تو دُکھ بھی، تنگ دستی ہے تو خوش حالی بھی، کامیابی ہے تو ناکامی بھی، عزت ہے تو ذلت بھی۔ غرضیکہ ہر شے جوڑوں میں ہے۔ ہماری زندگی Positive اور Negative دونوں چیزوں سے رقم ہے۔

جب ہم کسی سے دُعا کے لیے کہتے ہیں کہ ہماری زندگی میں بس خوشیاں ہی خوشیاں ہوں تو یہ خواہش

کر کے ہم اپنی زندگی کا آدھا حصہ کاٹ کر پھینک دینا چاہ رہے ہوتے ہیں۔ ذرا سوچیے! کیا یہ Nature کے ساتھ Fiddle نہیں؟ میرے خیال میں یہ انسان کی توہین ہے کہ وہ اپنے ہی جیسے محتاج انسان کے پاس جا کر دُعا کے لیے گڑگڑائے کہ مجھے اس مشکل سے نجات دلائیں۔

جب ہم یہ رویہ ترک کر دیتے ہیں تو پھر مشکل حالات میں فوراً یہ خیال آتا ہے کہ رب تعالیٰ نے ہمیشہ مجھے اچھے حالات میں رکھا، ہمیشہ مجھے تندرست رکھا۔ یہ جو چار دن کا دُکھ یا بیماری آئی ہے تو وہ ضرور اِس سے مجھے نکال دے گا۔ بیماری میں وہ اللہ سے دُعا کرتا ہے ''یا باری تعالیٰ! تو بڑا رحیم و کریم ہے۔ تُو نے مجھے ساری عمر تندرست رکھا، مجھے یقین ہے کہ تُو اپنی رحمت کے صدقے Sooner or later یہ بیماری مجھ سے دُور فرما دے گا۔''

یاد رکھیے! ہم رب تعالیٰ کے بارے میں جیسا گمان رکھتے ہیں وہ ویسا ہی کرتا ہے۔ سو آپ اُس سے اچھا گمان رکھیے وہ اچھا ہی کرے گا۔

جب ہم مشکل حالات میں اچھا گمان رکھتے ہوئے کہتے ہیں ''یا باری تعالیٰ! تو بہت رحیم و کریم ہے۔ میں جانتا ہوں اور یہ میرا ایمان ہے کہ تو مجھے اِن مشکل حالات سے نکال دے گا کیونکہ تیری سنت یہی ہے۔'' رب بندے کے گمان کی لاج رکھتا ہے اور اُسے مصیبت سے نجات دلا دیتا ہے۔

جب ہم یہ رویہ رکھیں گے تو رب تعالیٰ کے شکر گزار بندوں میں شامل ہو جائیں گے۔ رب تعالیٰ کو ایسے بندے بہت پسند ہیں۔

اِس رویے کا ایک اور فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارا دل یا قلب اور زیادہ روشن ہو جاتا ہے۔ رب تعالیٰ کے ساتھ ہمارا پیار بڑھنے لگتا ہے اور جوں جوں یہ پیار بڑھتا ہے رب سے عشق ہونے لگتا ہے۔ اُس کی ناراضی سے انسان ڈرنے لگتا ہے۔ یہ ڈر یا خوف سزا کا نہیں ہوتا بلکہ یہ ہوتا ہے کہ میرا رب، میرا محبوب مجھ سے منہ نہ موڑ لے۔

جب انسان اللہ کے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے تو پھر وہ اُس کے چھوٹے سے چھوٹے حکم سے بھی سرتابی نہیں کرتا اِس خوف سے کہ کہیں میرا محبوب مجھ سے ناراض نہ ہو جائے۔ یہ رویہ اُسے اللہ کے اطاعت گزار بندوں کی صف میں شامل کر دیتا ہے۔ تب انسان بندگی کے اُس مقام پر چلا جاتا ہے جہاں ایک مومن فائز ہوتا ہے۔

سوال: لوگ کسی شخص میں ایک نقص دیکھ کر اُسے اُس کی پوری Personality پر Apply کر دیتے ہیں جسے ہم Over Channelisation کہتے ہیں۔ ایسا کیوں؟

جواب: یہ کام مجھ جیسے بے علم اور کم عقل لوگ کرتے ہیں ورنہ فقیروں اور درویشوں کا کہنا یہ ہے کہ کسی شخص سے نفرت نہ کرو...... وہ اچھا ہے۔ ہاں اُس نے کوئی ایک آدھ بُری عادت Pick کر لی ہے۔

درویش اور فقیر 14 سو سال پہلے بھی اِس پر کاربند تھے اور آج بھی ہیں۔ آپ ﷺ کی سنت بھی یہی

ہے کہ کسی بھی انسان سے نفرت نہ کرو۔ فقیر اس پر شدت سے عمل کرتے ہیں اور بڑے لوگوں کو زیادہ سینے سے لگاتے ہیں۔

اگر ہم دوسروں کے بارے میں صرف اپنی گواہی درست کرلیں تو قومی سطح پر 80 فی صد مسائل ختم ہو جائیں گے۔ ایک بار کالم نگار ڈاکٹر اے آر خالد نے اِسی موضوع پر میری گفتگو کی روشنی میں کالم لکھا تھا۔ ''اِصلاحِ احوال کا یک نکاتی منشور، گواہی''۔ اگر ہم اپنی گواہی درست کرلیں گے تو پھر محض ایک گواہی کی وجہ سے کسی شخص کی تمام اچھائیوں کو Condemn نہیں کریں گے۔ اوّل تو کسی کی خامی، گناہ یا کمزوری کا ذکر کیا ہی نہیں جانا چاہیے لیکن اگر ناگزیر ہو جائے تو اِن الفاظ میں کیا جائے کہ وہ بہت اچھا انسان ہے۔ اُس بے چارے سے یہ کوتاہی ہوگئی ہے کہ اُس نے ایک بڑی عادت Pick کرلی ہے۔

ایامِ جوانی میں میری ملاقات ایک صاحب دل اور صاحب علم شیرازی صاحب سے ہوئی جو جو غیر شادی شدہ تھے اور مرے کالج میں انگریزی کے پروفیسر تھے۔ وہ مجھ پر بہت مہربان تھے۔ ایک روز اُنھوں نے بتایا کہ مولانا اشرف تھانوی جب بھی سیال کوٹ آتے ہمارے گھر قیام کرتے تھے۔ جب میں پانچویں کلاس میں تھا تو اُن سے ایک سوال پوچھا ''مولانا صاحب! کافر اور مسلمان میں کیا فرق ہے؟'' اُنھوں نے اللہ اور آپ ﷺ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے میری ذہنی سطح کے مطابق جواب دیا ''بیٹا! ایک مسلمان اور کافر میں اتنا ہی فرق ہے جتنا ایک اچھے اور بڑے انسان میں...... جب بڑا آدمی کسی اچھے انسان کو نیکی کا کوئی کام کرتے دیکھتا ہے تو کہتا ہے کہ ضرور اس نیکی کے پیچھے اِس کا کوئی ذاتی مفاد چھپا ہے جب کہ نیک آدمی کسی بڑے آدمی کو گناہ کرتے دیکھتا ہے تو کہتا ہے بے چارے سے غلطی ہوگئی۔''

ہمارے Social set-up میں یہ رویہ بھی در آیا کہ ہم کسی کی ایک خامی یا کوتاہی کو پکڑ کر اُس کی پوری Personality کو Damage کردیتے ہیں۔ مسلمان یہ کام نہیں کرتا۔ وہ تو دوسروں کے عیبوں پر پردہ ڈالتا ہے۔

سوال: محبت کیا ہے؟

جواب: جب ہم کسی شخص کو اُس کی اچھی فطرت کی وجہ سے پسند کرنے لگتے ہیں تو اُس پسندیدگی کی تھرڈ ڈگری پیار یا محبت ہے۔ شروع میں Liking (پسندیدگی) Develop ہوگی پھر Infatuation اور اِس کے بعد محبت یا پیار کی Stage آئے گی۔

اچھی فطرت بڑی Relative term ہے۔ مثلاً مجھ جیسے انسان کو اُس شخص کی فطرت اچھی لگے گی جو مجھ جیسا ہو۔ نیک آدمی سے میں دُور بھاگوں گا۔ میرے دل میں اُس کے لیے Liking develop نہیں ہو گی۔ سیال کوٹ کے پروفیسر شیرازی صاحب (جن کا ابھی ذکر ہوا) سے پیرسیٹر یونیورسٹی کے ہیڈ آف کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ طفیل قریشی صاحب ملاقات کے خواہش مند تھے لیکن انھیں Appointment نہیں ملتی تھی۔ انھیں کسی نے بتادیا کہ میں شیرازی صاحب سے خاصا قریب ہوں اور جب وہ لاہور تشریف لاتے ہیں تو اُن

کے پروگرام سے آگاہ ہوتا ہوں۔ طفیل قریشی صاحب نے مجھ سے کہا کہ اُن سے ملوادیں۔ میں نے شیرازی صاحب سے ٹائم لے کر قریشی صاحب کی اُن سے ملاقات کرادی۔ لیکن کچھ عرصے بعد قریشی صاحب کی رٹ شروع ہوگئی کہ مجھے اُن سے دوبارہ ملنا ہے۔ شیرازی صاحب سے اُن کی خواہش کا جب میں نے ذکر کیا تو کہنے لگے ''لے آؤ''۔ جب میں طفیل قریشی صاحب کو شیرازی صاحب کے پاس لے کر گیا تو اُن سے کہا ''شیرازی صاحب! طفیل صاحب پہلی ملاقات میں آپ سے بہت متاثر ہوئے ہیں اس لیے اُن کا دل چاہتا ہے کہ آپ سے بار بار ملیں۔'' پروفیسر شیرازی نے کہا ''سید زادے! جو کچھ قریشی صاحب نے تمھیں میرے بارے میں کہا ہے یہ درحقیقت وہ اپنی ذات کے بارے میں کہہ رہے ہیں کیونکہ جب کوئی شخص دوسرے شخص سے ملتا ہے تو اُسے اپنی ذات کا عکس اُس میں دکھائی دیتا ہے جس طرح ہمیں آئینہ میں اپنا Image دکھائی دیتا ہے۔'' قریشی صاحب چونکہ خود بہت نیک اور بھلے آدمی ہیں اس لیے انھیں اپنی نیکی اور اچھائی کا عکس میرے اندر دکھائی دیا جس کی وجہ سے وہ دھوکا کھاگئے کہ میں اچھا ہوں۔

رُوحانی کیفیات اور بنیادوں کی تیاری

سوال: سورۃ الرحمٰن کی برکات کیا ہیں؟

جواب: سورۃ الرحمٰن کی برکات میں بیان کر دیتا ہوں لیکن میرا عقیدہ، مذہب اور مسلک جو کہتا ہے وہ برکات سے تھوڑا مختلف ہے۔ میرے مذہب کے مطابق میرے لیے یہی کافی ہے کہ یہ میرے رب کا کلام ہے۔ اس سے بڑھ کر میرے لیے کوئی برکت نہیں۔

میں اسے کیوں پڑھوں......؟

اس کا جواب یہی ہے کہ میں اِسے اپنے رب کا کلام سمجھ کر بغیر کسی غرض کے پڑھوں کہ مجھے اِس سے ملتا کیا ہے۔ جب ہمارے پیارے دُور چلے جاتے ہیں تو ہم اُن کی گفتگو ٹیپ کر کے اُسے سنتے اور اپنے دل کو بہلاتے اور سکون پہنچاتے ہیں۔ اگر رب ہمارا محبوب ہے تو سارا قرآن اُس کا کلام ہے پھر ہم اپنے محبوب کا کلام پڑھ کر اپنے آپ کو راضی کیوں نہ کریں......!

کسی ٹی وی پروگرام میں مجھ سے ایک اینکر نے پوچھا کہ قرآن پاک اور احادیث میں واضح طور پر موجود ہے کہ ماہِ رمضان میں شیاطین جکڑ دیے جاتے ہیں تو پھر اس مہینے میں چوری، بلیک مارکیٹنگ، ذخیرہ اندوزی، بے جا منافع خوری اور افطار کے وقت گھر جاتے ہوئے راستے میں دنگا فساد اور لڑائی جھگڑا کیسا؟

آج کل یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے کہ پاکستان کے تقریباً تمام ٹی وی چینلز پر سحر و افطار میں طویل دورانیے کی خصوصی نشریات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ بہت چاہت، محبت اور جذبے کے ساتھ ماہِ رمضان کے حوالے سے ٹرانسمیشن کا نام کہیں ''رمضان کریم'' کہیں ''رحمتِ رمضان'' تو کہیں ''نورِ رمضان'' رکھا جاتا ہے لیکن اس تمام چاہت اور جذبے کے باوجود ہمارے اندر کا شیطان جکڑا نہیں جاتا۔ یہ اس لیے ہے کہ ہم مذہبی کام بھی نفع اور نقصان کے بغیر کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ہم اپنے فرائض بھی تب تک ادا کرنے کے لیے تیار نہیں جب تک ہمیں یہ پتا نہ چل جائے کہ اس میں ہمیں ثواب کتنا ملے گا۔ کلامِ الٰہی درحقیقت اس لیے ہے کہ اسے پڑھا جائے، اِسے سمجھا اور اس پر عمل کیا جائے۔ اگر میں اللہ کا کلام اِسے لیے پڑھوں گا کہ اسے پڑھنے سے مجھے فلاں فلاں فوائد حاصل ہوں گے تو چونکہ میری نیت فوائد کا حصول ہے اس لیے میں قرآن پاک پر عمل کی طرف راغب نہیں ہوں گا۔

اُس اینکر کے سوال کا جواب یہ تھا کہ جب میں محض ماہِ رمضان کے فوائد حاصل کرنے کے لیے روزے رکھوں گا تو پھر میرے اندر کا شیطان جکڑا نہیں جائے گا۔ لیکن اگر میں نے یہ سوچ کر روزے رکھے کہ یہ رب کا حکم ہے ''اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے جیسا کہ تم سے پہلی اُمتوں پر فرض کیے گئے تا کہ متقی ہو جاؤ''۔ لیکن میری نظر کبھی اس پر نہ رہے گی کہ میں روزے رکھ کر اپنا فرض ادا کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھتا رہوں کہ روزے رکھنے سے میں متقی ہوا یا نہیں۔ میں نے اپنا یہ فرض بطریقِ احسن نبھایا بھی یا نہیں؟ کیونکہ اگر میں روزہ فرض سمجھ کر رکھ رہا ہوں اور اس کے تمام آداب پورے کر رہا ہوں تو پھر مجھے متقی ہو جانا چاہیے۔ اسی طرح اگر میں نے سورۃ الرحمٰن کی تلاوت یہ سمجھ کر کی کہ اس کی تلاوت سے میرا غصہ جاتا رہے، مجھ پر دُنیاوی نعمتوں کی بارش ہو جائے، مجھے عزت حاصل ہو جائے (کیونکہ اس سورہ کو پڑھنے سے یہ سب اثرات حاصل ہوتے ہیں) یا میں جس کے سامنے جا کر کھڑا ہو جاؤں وہ مجھ سے متاثر ہو جائے، اگر اس نیت سے میں نے تلاوت کی تو گویا میں نے قرآن پاک کو کلامِ الٰہی سمجھ کر نہیں پڑھا بلکہ اس کے ساتھ اُسی طرح کیا کہ جس طرح میں جاب پر جاتا ہوں تا کہ مجھے پیسے مل جائیں۔

سورۃ الرحمٰن کی Regular تلاوت کی برکات تو میں نے عرض کر دیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کون شخص اِسے کس وقت پڑھے؟ ایک نشست میں میری زبان سے یہ بات پھسل گئی کہ ہر رُوح کا اپنا ایک مخصوص حرف ہوتا ہے جسے پڑھنے سے انسان رُوحانیت کی انتہائی بلندیوں پر چلا جاتا ہے۔ بعدازاں یہ گفتگو کتابی شکل میں بھی آ گئی۔ اب میرے نام جو Maximum ڈاک ہوتی ہے اُس میں یہی خواہش ہوتی ہے کہ ''جناب! ہماری رُوح سے مطابقت رکھنے والا حرف بتا دیجیے۔'' حالانکہ یہ تو بالکل ایسے ہے کہ اگر کوئی شخص مجھے یہ بتا دے کہ یہ کار کا Accelerator ہے۔ اس پر پاؤں رکھو گے تو تم 200 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے کار چلا لو گے۔ میں ضد کروں کہ آپ مجھے بس یہ بتا دیں کہ کار کا Accelerator ہے کہاں...... حالانکہ کار تب تک 200 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے نہیں چلے گی جب تک مجھے سٹیئرنگ پر کنٹرول حاصل نہ ہو، مجھے Road sense اور Road courtesy نہ پتا چل جائے اور میری Judgment صحیح نہ ہو جائے تب تک میں Accelerator پر پاؤں رکھ کر سوائے ایکسیڈنٹ کے اور کچھ نہیں کروں گا۔

جب تک بنیادیں تیار نہ ہو جائیں پڑھائیاں کام نہیں دیتیں۔ یاد رکھیے! جب ہم گھر بناتے ہیں تو ہمارا Maximum وقت، پیسہ اور محنت بنیادوں پر خرچ ہوتی ہے۔ بظاہر یوں لگتا ہے کہ کام ہو ہی نہیں رہا لیکن جب ایک بار ہم Basic level پر پہنچ جائیں گے تو اُس کے بعد پھر بلڈنگ بڑی تیزی سے کھڑی ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ انسان کی رُوحانی کیفیت میں بھی بنیادیں تیار کرتے وقت بہت وقت اور محنت صرف ہوتی ہے۔ بغیر فاؤنڈیشن تیار کیے اگر ہم رُوح سے مطابقت رکھتا حرف پڑھیں گے تو سوائے نقصان کے کچھ حاصل نہ ہو گا۔

سوال: مرشد سے ملاقات کے بعد کبھی مرید کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اُس کے اندر کا خالی پن بھر گیا۔ ایک سکون اور اطمینان کی کیفیت ہوتی ہے لیکن کبھی ملاقات کے بعد بہت زیادہ Emptiness کا احساس ہوتا ہے۔ ایسا کیوں؟

جواب: ہم اگر اپنی زندگی پر نظر ڈالیں تو ہم سدا ایک ہی کیفیت اور موڈ میں نہیں رہتے۔ ایک ہی جذبے پر قائم نہیں رہتے۔ اِس میں Variation آتی رہتی ہے۔ انسان کا بلڈ پریشر Lunar system کے تحت بڑھتا اور گھٹتا رہتا ہے۔ انسان کی باڈی کیمسٹری میں چاند کے بڑھنے اور گھٹنے کے ساتھ Changes آتی رہتی ہیں۔ جب باڈی کیمسٹری میں Change آ گئی تو ہماری ذہنی کیفیات اور موڈ بھی بدل جائیں گے۔

بات یہاں مرشد کی نہیں ہے...... یہ مرید کی اپنی بات ہے۔ جب کوئی شاگرد اپنے اُستاد کے پاس جاتا ہے تو اگرچہ اُستاد کے بھی اپنے Mood swings ہیں، اُس کی Body chemistry بھی Change ہوتی ہے اور اُس کے جذبے بھی کم اور زیادہ ہوتے رہتے ہیں لیکن چونکہ وہ علم کے ایک مقام پر چلا گیا ہوتا ہے اس لیے اُس کو اپنی کیفیات پر کافی Control حاصل ہوتا ہے۔ اُس کے اندر کیسی ہی کیفیات کیوں نہ چل رہی ہوں وہ نارمل Behave کرے گا۔ شاگرد ابھی اُس مقام تک نہیں گیا ہوتا اِس لیے اُس کی کیفیات اُسے Overpower کر لیتی ہیں۔

مختلف ریڈیو اسٹیشن ایک ہی وقت میں اپنی نشریات جاری رکھے ہوتے ہیں۔ ہم اُن نشریات کو صرف اُس صورت میں Clearly سن پاتے ہیں جب ہمارا Receiving set اچھا ہو۔ ریڈیو اچھی حالت میں ہو تو دُور دراز کے ریڈیو چینلز بھی ہمیں واضح طور پر سنائی دیتے ہیں ورنہ Distortion آتی ہے۔

شاگرد کی Body chemistry میں Highs and lows آتے رہتے ہیں۔ جب اُس کی باڈی کیمسٹری Lows میں ہے اور وہ اپنے اُستاد کے پاس جا کر بیٹھتا ہے تو اُسے احساس نہیں ہوتا کہ میرے یہاں آنے سے مجھے کچھ حاصل ہوا ہے۔ اُسے Emptiness کی Feelings آتی ہیں۔

اس کیفیت میں اُستاد کی نسبت شاگرد کا زیادہ رول ہے۔ کسی وقت اُستاد سے ایک منٹ کی ملاقات شاگرد کو ایسا احساس دلاتی ہے کہ جیسے وہ لبالب بھر گیا۔ کیونکہ اُس کا اُستاد تو Giving end پر ہے۔ شاگرد جب بھی اُس کے پاس جا کر بیٹھے گا اُستاد اپنی گفتگو کے ذریعے اُسے علم دے گا کیونکہ رُوحانیت میں اُستاد نہ تو سرنج بھر کر علم Inject کرتا ہے نہ نوالے کی صورت میں دیتا ہے کہ یہ علم کا ٹکڑا ہے اِسے کھا لیجیے۔ اُستاد تو علم پھیلا رہا ہوتا ہے۔ اُس کی گفتگو ہمیشہ علم سے معمور ہوتی ہے۔ یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم اُس کی گفتگو میں سے علم کے ٹکڑے کس طرح چن لیتے ہیں۔

آپ کے اُستاد کی حرکات و سکنات بھی سبق لیے ہوتی ہیں۔ یہ ہم پر ہے کہ اُس سبق کو کس طرح Pick, gather and absorb کرتے ہیں۔ آپ نے اکثر و بیشتر سنا ہوگا کہ کچھ شاگرد اپنے اُستاد کے پاس سب سے بعد میں جاتے ہیں۔ وہ سب سے زیادہ علم حاصل کر کے سائیڈ پر ہو جاتے ہیں جب کہ پرانے آنے

والے شاگرد اُسی طرح بیٹھے ہوتے ہیں۔ یہ اُستاد کا نہیں شاگرد کا کمال ہے کہ اُس کا Receiving centre اتنا Strong ہے، اُس کے ادب آداب اتنے پسندیدہ ہیں کہ وہ اُستاد کے دل میں اُتر جاتا ہے۔ اُس کے Etiquette, manners، بات کرنے کا طریقہ، اُس کی Selflessness، اُس کا خلوص اور جذبہ اتنا خوبصورت ہوتا ہے کہ وہ اُستاد کے قریب ہو جاتا ہے۔ جس شاگرد کو اللہ نے یہ خوبیاں عطا کی ہیں اُس کا Receiving centre بہت Strong ہے اور وہ علم بہت تیزی سے Pick کرتا ہے۔ اپنے اُستاد یا گائیڈ کے بارے میں یہ نہ سمجھیے کہ وہ آپ کو علم دے نہیں رہا بلکہ یہ سمجھیے کہ میں اُن سے علم لے نہیں رہا۔ جب ہم اپنے آپ کو یہ یقین دلا دیں گے تو پھر ہمیں Emptiness (خالی پن) کی شکایت نہیں ہوگی۔

جب میں کلاس ٹو یا تھری میں پڑھتا تھا تو پاکستان میں بارش نہ ہونے کی وجہ سے اناج کی بہت کمی ہو گئی۔ تب ایک قصہ سنا کہ اُن دنوں مسجد کے مولانا نے نمازیوں سے فرمایا کہ" آج ہم نماز کے بعد کھلے میدان میں جمع ہو کر نمازِ استسقاء ادا کر کے بارش کے لیے دُعا مانگیں گے۔" حسبِ پروگرام اُن سب نے نمازِ استسقاء ادا کر کے جب بارش کے لیے دُعا کر لی تو اچانک مولانا صاحب نے اعلان کیا" بھائیو! مجھے سو روپے کا نوٹ یہاں گرا ہوا ملا ہے۔ جس کا ہے وہ لے لے۔" (یاد رہے یہ سو روپیہ 1952ء کا تھا) آدھے سے زیادہ نمازیوں نے دعویٰ کیا کا یہ 100 روپیہ اُن کا ہے۔ تب مولانا نے کہا" بھائیو! یہ سو روپیہ کسی کا بھی نہیں۔ میں نے خود اپنی جیب سے نکال کر اِسے یہاں پھینکا تھا۔" اب آپ خود ہی سوچ لیجیے کہ ہماری حالت جب یہ ہو کہ نماز کے فوراً بعد اپنا ایمان سو روپے میں بیچ رہے ہوں تو پھر ہماری دعاؤں میں اثر کہاں ہوگا......!

میں بھی رُوحانیت کا بہت شوقین ہوں اور چاہتا ہوں کہ رُوحانیت کے حصول کے بعد میں سڑک پر چلتے لوگوں کو مخاطب کر کے کہوں کہ بھائی تمھارے دل میں یہ ہے، تم یہ بات سوچ رہے ہو۔ اس طرح میں کسی کی چلتی کار روک دوں، کسی کو درخت سے اُلٹا لٹکا دوں، کسی کو پھونک مار کر آسمان تک اُڑا دوں۔ پھر لوگ مجھے جھک جھک کر سلام کریں، میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگائیں...... مجھے اِس سب کا بہت شوق ہے لیکن مجھ سے یہ سب ہو نہیں پا رہا۔ تب مجھے آپ جیسے کسی سمجھدار آدمی نے یہ بات سمجھائی" جناب سرفراز صاحب! یہ خصوصیات اپنے آپ کو مٹا دینے سے حاصل ہوتی ہیں۔ آپ نے تو اپنے اندر بڑے بڑے بت بنائے ہوئے ہیں اور آپ اُن بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ کہیں آپ کے اندر انا کا بت ہے تو کہیں تفاخر کا۔ کہیں آپ سمجھتے ہیں کہ مجھ سے زیادہ علم کوئی نہیں رکھتا، مجھ سے زیادہ اچھا تو کوئی نہیں، مجھ سے زیادہ عقل مند کوئی نہیں...... جب تک آپ ان بتوں کی پرستش کرتے رہیں گے کہیں پہنچ نہیں پائیں گے۔" اِس کے بعد میں نے جانا کہ جب تک میرے اندر کے بت ٹوٹیں گے نہیں، میں دس اُستادوں کے پاس بھی جا کر بیٹھ جاؤں تو مجھے کچھ حاصل نہ ہوگا...... کیونکہ جب شاگرد اُستاد کے پاس جا کر بیٹھتا ہے تو اُستاد اُسے نگاہوں سے تولتا ہے اور اپنے علم سے جان لیتا ہے کہ اُس کے شاگرد کے اندر کیا کیا بت ہیں۔ وہ اُن بتوں کو توڑنے لگتا ہے۔ انسان میں سب سے زیادہ Strong بت انا کا ہے۔ جھوٹی انا کا بت تب تک نہیں ٹوٹتا جب تک اُسے گرز نہ مارے جائیں۔ یہ Physical نہیں بلکہ

Humiliation کے گرز ہیں کہ ہر دومنٹ کے بعد اگر شاگرد پر Humiliation ہو تو پھر کہیں جا کر رفتہ رفتہ وہ بت ٹوٹتا ہے۔

Emptiness کا یہ احساس کبھی نہیں ہوگا اگر ہم اپنے اُستاد کے پاس بیٹھ کر صرف اُسے سنیں۔ اُستاد سے علم حاصل کرنے کا Keynote سننا ہے، بولنا نہیں۔ جب آپ اپنے اُستاد یا گائیڈ کی خدمت میں حاضر ہوں تو اُسے سوئیاں چبھوئیے کہ وہ بولنے پر مجبور ہو جائے۔ جتنا وہ بولے گا اور شاگرد خاموشی سے سنے گا اُتنا ہی زیادہ علم شاگرد Collect کرے گا۔ اگر شاگرد خود بولتا رہا تو اُستاد Comfortable ہو جائے گا۔ وہ آرام سے بیٹھ کر اُسے سنے گا...... نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ وہاں سے کچھ لیے بغیر اُٹھ آئیں گے۔

سوال: بارگاہِ الٰہی میں التجا، درخواست اور فریاد ہے کہ ہر وہ خیر آپ کا مقدر ہو جو اللہ کے پاس ہے اور جو ہمارے پیارے رسول آقائے دو جہاں ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں اپنے رب سے طلب فرمائی۔ ہر اُس شر سے آپ محفوظ و مامون ہوں جس سے پناہ کے لیے سرورِ کونین ﷺ نے بارگاہِ رب میں متعدد بار مختلف مواقع پر دُعا فرمائی۔ آمین۔

جواب: آمین۔ اللہ پاک یہ دُعا قبول فرمائے اور آپ کو جزا عطا فرمائے کہ آپ نے مجھ جیسے گناہ گار اور حقیر انسان کے لیے اللہ کے حضور اِتنی اچھی دُعا کی۔

سوال: ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ کچھ والدین اپنے بچوں کی وجہ سے اور کچھ بچے اپنے والدین کی وجہ سے جہنم میں جائیں گے۔ کیا یہ حدیث قوی ہے یا ضعیف؟

جواب: اسلام یا کسی بھی اِلہامی مذہب کا قانون ہو یا پھر کوئی بھی Family law ہو کسی میں بھی یہ Provision نہیں کہ باپ کی سزا بیٹے کو یا بیٹے کی سزا باپ کو دے دی جائے۔ اسلام اِس حوالے سے بہت Clear ہے۔ ہر بالغ شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے ہاں البتہ Parents بچے کے لیے اُس وقت تک ذمہ دار ہیں جب تک بچہ ہوش مند نہیں ہو جاتا۔ اُس کی تربیت کرنا، دینِ اسلام کی تعلیم دینا یا دلانا اور اُس کے لیے Ensure کرنا کہ وہ بالغ ہونے کے بعد دینِ اسلام پر جس حد تک ممکن ہو عمل کرے، یہ سب ماں باپ پر فرض ہے۔ اگر ماں باپ اِس میں کوتاہی کرتے ہیں تو وہ اِس کوتاہی کے لیے اللہ کو جواب دہ ہیں کہ جب بچہ اُن پر Dependent تھا تو اُنھوں نے اُس کی تعلیم و تربیت اِس انداز میں کیوں نہیں کی کہ وہ علمِ دین اور دوسرے علوم پر دسترس رکھتا۔ اُس کو اسلام کی سمجھ ہوتی کہ اُسے اسلام کے تحت زندگی کس طرح گزارنی ہے۔ یہ ماں باپ کی ذمہ داری ہے کہ سنِ بلوغت تک پہنچنے تک اُسے اِتنا پختہ کر دیں کہ وہ ساری عمر اسلامی اُصولوں پر چلے۔

کوتاہی کی صورت میں والدین کی پوچھ گچھ تو ہوگی لیکن جس حدیث کا ذکر آپ نے کیا ہے میں اِس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ اِس کو قوی یا ضعیف قرار دے سکوں کیونکہ میری نظر سے نہیں گزری اور میں کوئی ایسی بات کہنے کو تیار نہیں ہوں جو میرے علم میں نہیں ہے۔

سوال: آج کل پڑھے لکھے لوگوں کو جاب ملنا مشکل۔ ہو گیا ہے، رشوت، سفارش عام ہو گئی۔ مگر انسانی ضروریات جاب کے ذریعے پوری ہوتی ہیں۔ جاب کے حصول کے لیے سفارش کا Concept کیا ہے؟ یہ کس حد تک ہونی چاہیے؟

جواب: اِس سال 7 جولائی 2012ء کو میری جاب کے 46 سال پورے ہو گئے۔ اِن 46 سالوں میں میں نے بہت سی Jobs تبدیل کیں۔ ملٹی نیشنل جابز بھی کیں، گورنمنٹ سروس میں بھی رہا، پرائیویٹ سیکٹر کے لیے بھی کام کیا۔ چھیالیس سال میں کوئی جاب ایسی نہیں جو مجھے سفارش سے ملی ہو یا جس کے لیے میں نے رشوت دی ہو۔ اِسی طرح 1976ء سے میں Independent appointing authority کے طور پر کام کر رہا ہوں۔ اِتنے سالوں میں میں نے کبھی کوئی آدمی سفارش پر نہیں رکھا۔

ہمارا یہ احساس کہ سفارش کے بغیر جاب نہیں ملتی، گورنمنٹ کی حد تک تو شاید درست ہو لیکن پرائیویٹ سیکٹر میں ایسا نہیں۔ کیونکہ ٹاپ پر بیٹھے آدمی کی اپنی نوکری خطرے میں پڑ جائے گی اگر وہ سفارش پر لوگوں کو لے آیا...... کیونکہ اُسے اپنی نوکری بچائے رکھنے کے لیے رزلٹ Produce کر کے دینے ہیں۔ وہ اپنے Interest میں اُن لوگوں کو Appoint کرے گا جن میں واقعی قابلیت ہو۔

لیکن اِس سب کے بعد میں یہ بھی عرض کر دوں کہ جس جاب کے لیے ایک شخص Apply کر رہا ہے اُس سے اُس کی قابلیت زیادہ ہے۔ وہ شخص Physically and intellectually ایمان دار ہے، جاب کی تمام شرائط بہتر طریقے سے پوری کرتا ہے تو پھر Appointing authority کو یہ کہہ دینا کہ صاحب! میں نے اِس آدمی کو ذاتی طور پر پرکھا ہے اور میری رائے میں یہ شخص اِس جاب اور آپ کے ادارے کے لیے بہتر ثابت ہوگا۔ یہ سفارش جائز ہے لیکن ساتھ یہ بھی کہہ دیا جائے کہ آپ بھی اپنے سٹینڈرڈ پر اِسے پرکھ لیجیے۔ اگر یہ آپ کے معیار سے زیادہ اچھا ثابت ہو رہا ہو تو اِسے Chance دے دیجیے۔

لیکن اگر اُنیس بیس کا فرق ہے اور آپ اِس فرق کو Ignore کر کے اِس شخص کو Appoint کرانا چاہتے ہیں تو یہ گویا کسی حق دار کا حق مارنے کے مترادف ہے۔

سوال: دوسروں کا حق مارنے سے کیا مراد ہے؟

جواب: جب ہم اپنے ذاتی مفاد کو دوسرے کے مفادات پر ترجیح دینے لگیں تو اِس میں بہت Strong possibility ہے کہ ہم دوسروں کا حق مارنے لگیں۔ سب سے محتاط رویہ یہ ہے کہ دوسروں کے حق کو اپنے حق پر مقدم رکھیں۔ اگر میں آپ کے حق کو اپنے حق پر ترجیح دینے لگوں تو اِس سے دوسروں کا حق مار کر اپنا کام چلانے کی Tendency ختم ہو جائے گی۔

اگر میں قطار میں کھڑا ہوں اور میرا نمبر آ گیا ہے تو میرا حق ہے کہ اپنی باری پر کام کرا لوں لیکن اگر میں دیکھتا ہوں کہ ایک صاحب بہت بے چین ہیں اور مجھے لگتا ہے کہ اُنھیں جلدی ہے۔ میں اُن سے کہتا ہوں کہ آپ میرے نمبر پر کھڑے ہو جایئے میں پیچھے آپ کے نمبر پر چلا جاتا ہوں۔ یوں میں کسی کا حق مارنے سے بچ گیا۔

تو میں نے دوسروں کا حق مار دیا۔

بہتر یہی ہے کہ اِس احتمال کو ختم کر دیجیے کہ کہیں آپ کی وجہ سے دوسروں کی حق تلفی ہو......دوسروں کے حق، مفاد اور خواہشات کو اپنے حق، مفاد اور خواہشات پر ترجیح دے دیجیے۔ دوسروں کے آرام کو اپنے آرام پر فوقیت دے دیجیے...... حق تلفی سے بچ جائیں گے۔

سورۃ التغابن

جب میں پہلی بار اپنے مرشد سید یعقوب علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اُنھوں نے کمال مہربانی فرمائی اور چند منٹ کی پہلی ہی ملاقات میں مجھے پڑھنے کو کچھ عطا فرما دیا۔ ہر کم علم شخص کی طرح میں بھی اِس زعم میں مبتلا تھا کہ میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ یہ فطرت کے رنگوں میں سے ایک رنگ ہے کہ انسان جتنا کم علم ہوتا ہے اُسی قدر اُسے یہ زعم ہوتا ہے کہ میں بہت علم والا ہوں۔ جو شخص جتنا لاعلم ہو گا اُتنی ہی صاحبانِ علم پر تنقید کرے گا کہ اُن میں فلاں فلاں خرابی ہے۔

آپ نے دیکھا ہو گا کہ پہاڑی نالے میں مون سون کے موسم میں پانی آتا ہے۔ وہ Shallow اور اتھاہ ہوتا ہے اور ٹخنوں سے بھی کم گہرائی تک اُس میں پانی ہوتا ہے۔ اِس کے باوجود اُس کا بہاؤ کس قدر تیز ہوتا ہے اور کتنا زیادہ شور مچاتا ہے۔

ندی نسبتاً نالے سے بڑی ہوتی ہے لیکن اُس کا شور نالے کی نسبت کم ہوتا ہے۔ نہر دیکھ لیجیے۔ بڑی روانی سے بہت کم شور پیدا کیے بہتی اور زمین سیراب کرتی رہتی ہے۔ دریا میں نہر کی نسبت کہیں زیادہ گہرائی اور پانی ہوتا ہے لیکن اُس کے بہاؤ میں نہ کوئی شور ہوتا ہے نہ سیلاب کے زمانے کے علاوہ اُس میں لہریں اُٹھتی ہیں۔ سمندر جو پوری زمین کا Almost دو تہائی ہے اُس میں بڑے بڑے جہاز تیرتے ہیں اور کئی طرح کی مخلوق بستی ہے۔ ذرا سوچیے! اُس سمندر کا ٹھہراؤ اور سکون کس قدر ہے، اس کا سینہ کتنا وسیع ہے کہ بڑے بڑے جہاز ڈوب جاتے ہیں لیکن کہیں اُن کا سراغ نہیں ملتا۔ کوئی چیز گہرائی میں جتنی کم ہوتی ہے اُسی قدر زیادہ شور مچاتی ہے۔ میں بھی تب اپنے آپ کو بڑا علامہ سمجھتا تھا۔ مرشد صاحب نے جب وہ لفظ مجھے پڑھنے کو دیا تو میرے دل میں خیال آیا کہ اِسے اِتنا کم پڑھنے سے کیا فائدہ ہو جائے گا کیونکہ مرشد صاحب نے اُسے پڑھنے کا طریقہ یہ بتایا تھا کہ وضو کرتے وقت ہاتھ دھونے کے دوران اِسے پڑھنا ہے (یوں وہ لفظ بمشکل 4 یا 5 مرتبہ پڑھا جاتا تھا) ساتھ اُنھوں نے سخت تلقین کی تھی کہ اِس کے بعد دُعا نہیں مانگنی۔ تین دن تو میں نے اُن کی تلقین پر عمل کیا۔ چوتھے دن سوچا کہ دُعا مانگ کر تو دیکھوں کہ ہوتا کیا ہے۔ میں نے وضو کے دوران وہ لفظ پڑھا اور اُس کے فوراً بعد دُعا مانگی۔ اُس وقت مجھے ایک بے حد خوب صورت جگہ دکھائی دی (اس کی تفصیل میں جانا شاید مناسب نہ ہو)۔ مرشد صاحب سے عرض کی کہ ”میں نے ایسی خوب صورت جگہ دیکھی

ہے۔'' وہ چونک کر کہنے لگے'' دوبارہ بتاؤ کیا دیکھا۔'' میں نے بتایا تو سوچ میں گم ہوئے۔ پھر بولے'' دوبارہ بتاؤ کیا دیکھا۔'' جب میں نے من وعن تفصیلات دہرادیں تو پوچھا'' کیا تم نے دُعا مانگی تھی؟'' میں نے کہا ''جی!'' یہ سن کر وہ شدید غصے میں آگئے اور کہا'' پھر کیا لینے آئے ہو میرے پاس...... چلو بھاگو یہاں سے۔''

اُس کے بعد چھ مہینے میں وہاں نہیں گیا۔ اِس عرصے میں میرا ایک ذاتی کام ایسا پھنس گیا کہ اُسے ہر حال میں کروانا ناگزیر تھا۔ میں نے یہیں اِسی کمرے (212۔ جہانزیب بلاک علامہ اقبال ٹاؤن کا ڈرائنگ روم) کے اِسی کونے میں بیٹھے بیٹھے ایک روز بابا تاج الدین کی طرف رُجوع کیا تو اُن سے ملاقات ہوگئی۔ مرشد صاحب کی شکل دکھا کر مجھے کہنے لگے'' اُن کے پاس چلے جاؤ اور دعا کرالو تمھارا کام ہو جائے گا۔'' لیکن میں چوں کہ اُن کے پاس جانا نہیں چاہتا تھا اس لیے دوسرے دن دوبارہ بابا تاج الدین رحمۃ اللہ علیہ سے رُجوع کیا تو اُنھوں نے فرمایا'' یہ (سید یعقوب علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ) بہت بڑے ولی اللہ ہیں۔ اِن کے پاس جا کر اپنا مسئلہ بیان کرو۔ یہ دعا کریں گے تو کام ہو جائے گا۔'' میں چاروناچار اُن کے پاس چلا گیا تو وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ مجھے دیکھتے ہوئے Politely پوچھا'' کیسے آئے؟'' میں نے کہا'' حضور! اِدھر سے گزر رہا تھا، سوچا آپ کو سلام کرتا چلوں۔'' فرمایا'' کرلیا سلام؟'' میں نے کہا'' جی!'' کہنے لگے'' جاؤ۔'' یہ سن کر میں نے دل میں کہا میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ ایسے ہی ہوگا۔ دو دن بعد دوبارہ اُن کے پاس چلا گیا۔ کہنے لگے'' آج کیسے آئے؟'' میں نے کہا'' چائے پینے آیا ہوں'' بڑی محبت سے بولے'' ہاں ہاں ضرور۔ بیٹھو میں پلاتا ہوں۔'' چائے بنا کر مجھے دی۔ جب میں چائے پی چکا تو کہنے لگے'' اب جاؤ''۔ بغیر دُعا کرائے میں پھر واپس چلا آیا۔ تیسری بار جب اُن کے پاس گیا تو کہنے لگے'' کوئی کام ہے کیا؟'' میں نے کہا'' جی! کام تھا۔'' بابا سید تاج الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ سے تین دن ملاقات ہوتی رہی اور اُنھوں نے تینوں بار آپ کے پاس آنے کی تاکید کی تھی۔'' یہ سن کر سخت جلال میں آگئے کہ'' وہ کون ہوتا ہے کسی کے راز کھولنے والا۔ اُسے تو میں آج رات ٹھیک کردوں گا۔''

قصہ مختصر اُس دن کے بعد سے میں روٹین میں اُن کے پاس جانے لگا۔ ایک روز مہربان ہوگئے۔ فرمایا'' قرآن پاک کی سورۃ التغابن پڑھا کرو۔'' یہ دراصل اُس غلطی کی تلافی کے لیے تھی جو میں نے دُعا مانگ کر کی تھی۔

یہ قصہ سنانے کا مطلب یہ تھا کہ انسان سے جب کوئی غلطیاں کوتاہیاں یا ایسی حرکتیں سرزد ہوجائیں کہ کوئی دُعا، وظیفہ یا فریاد اللہ کے سامنے کام نہ کررہی ہو تو وہ روزانہ عشاء کی نماز کے بعد سورۃ التغابن کی تلاوت کرے۔ یہ سورۃ مدنی ہے اور اٹھائیسویں پارے میں ہے۔ یہ قرآن پاک کی 64ویں سورہ ہے۔ اِس کی 18 آیات اور دو رکوع ہیں۔ اِس سورۃ کی آیت نمبر 9 میں لفظ'' التغابن'' استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ ''غبن'' سے Derive ہوا ہے۔ آیت نمبر 9 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''جس دن تم سب کو اُس جمع ہونے کے دن جمع کرے گا۔ وہی دن ہے ہار جیت کا۔ اور جو شخص اللہ پر

ایمان لا کر نیک عمل کرے اللہ اس کی بُرائیاں دُور کردے گا اور اُسے جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔''

''غبن'' اُردو میں اُس وقت استعمال ہوتا ہے جب کوئی شخص کسی کا پیسہ غیر قانونی طور پر قبضے میں لے لے۔ ''غبن'' نہ صرف روپے پیسے کے لیے استعمال ہوتا ہے بلکہ شراکت دار (خواہ وہ زندگی، بزنس یا گھر کا شریک ہو) اگر جان بوجھ کر ایسا مشورہ دے جس سے دوسرے کا نقصان ہو تو اُس کے لیے بھی لفظ ''غبن'' استعمال ہوتا ہے۔ اگر وہ شراکت دار کا پیسہ دھوکے اور بے ایمانی سے قبضہ میں لے لے تو یہ بھی غبن ہے۔

انسان غلطیاں اور کوتاہیاں کرتا ہے اور اُن کی وجہ سے خسارے میں چلا جاتا ہے۔ سورۃ التغابن پڑھنے سے انسان کی وہ غلطیاں، خطائیں اور کوتاہیاں معاف ہو جاتی ہیں۔ اس سورہ کی تلاوت کے اثرات بہت آہستہ آہستہ سامنے آئیں گے جب کہ ہم پاکستانی لوگ ہر وقت بہت جلدی میں ہوتے ہیں۔ کمپیئر اور ڈراما آرٹسٹ شجاعت ہاشمی نے پچھلے دنوں بڑا دلچسپ واقعہ سنایا کہ سب لوگ ریلوے کراسنگ پر ٹرین آنے اور پھاٹک کھلنے کا انتظار کررہے تھے۔ اچانک دیکھا کہ ایک صاحب اپنی سائیکل سر پر اُٹھائے بلاخوف وخطر ریلوے کراسنگ کراس کررہے ہیں۔ ٹرین اُن کے سر پر پہنچ چکی تھی۔ پھاٹک پر کھڑے لوگ دم سادھے یہ سارا منظر دیکھتے ہوئے سوچ رہے تھے کہ نہ جانے کس ایمرجنسی نے اُن صاحب کو اتنا بڑا Risk لینے پر مجبور کیا کہ وہ جان پر کھیل گئے۔ الحمدللہ چند سیکنڈ کے وقفے سے اُن صاحب نے ٹرین پہنچنے سے پہلے پٹڑی کراس کرلی۔ اتنے میں پھاٹک کھل گیا۔ جب لوگ ریلوے کراسنگ سے دوسری طرف پہنچے تو دیکھا کہ وہ صاحب اردگرد سے بے نیاز بڑی فرصت سے کھڑے مداری کا تماشا دیکھ رہے ہیں اور مجمع باز کی تقریر سن رہے ہیں۔ ہماری جلد بازیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ اِس سورۃ کو پڑھنے سے اِس کے اثرات کتنی جلدی آپ کو حاصل ہوں گے۔ میں نے ڈیڑھ سال تک یہ کشٹ کاٹا تھا۔ موسم خواہ جیسا بھی ہوتا میں عشاء کے بعد کھلی جگہ یہ سورۃ پڑھا کرتا تب ڈیڑھ سال بعد مرشد صاحب نے اگلا سبق دیا۔ سورۃ التغابن میں رب تعالیٰ نے فرمایا'' ہم نے انسان کو بہت خوب صورت شکل وصورت اور متناسب جسم کے ساتھ تخلیق کیا۔'' اِس سورۃ میں کفار کو مخاطب کرکے فرمایا گیا کہ'' یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اِنھیں مار کر دوبارہ زندہ نہیں کریں گے...... آپ ﷺ اِنھیں کہہ دیجیے کہ ہم اِنھیں ضرور اُٹھائیں گے...... تب اِن کا نامۂ اعمال اِن کے سامنے پیش کیا جائے گا اور یہ اُس نامۂ اعمال کو جھٹلا نہیں سکیں گے۔''

''کافروں نے کہا کہ وہ ہرگز نہ اُٹھائے جائیں گے تم فرماؤ کیوں نہیں میرے رب کی قسم تم اُٹھائے جاؤ گے پھر تمھارے کوتک تمھیں جتا دیے جائیں گے اور یہ اللہ کو آسان ہے۔'' (التغابن:7)

اِس سورۃ کی آیت نمبر 15 میں اللہ نے مال اور اولاد کو انسان کے لیے آزمائش قرار دیا۔

"تمھارے مال اور تمھارے بچے جانچ ہی ہیں اور اللہ کے پاس بڑا ثواب ہے۔"

یہ سچ ہے کہ انسان اپنی اولاد کے لیے سب کچھ کر گزرتا ہے اور اولاد کے فائدے کے لیے غلط صحیح اور حرام حلال میں تمیز نہیں کرتا۔ ایک اور کوتاہی جو اکثر انسان سے سرزد ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنے اہلِ خانہ کے لیے سچ کو تبدیل نہ بھی کرے تو اُسے چھپا لیتا ہے تاکہ اہلِ خانہ اور اولاد کو اُس سچ کی وجہ سے نقصان نہ ہو۔ یہ سب باتیں بروزِ قیامت ہمارے سامنے آجائیں گی...... اور جس اولاد کے لیے ہم نے یہ سب غلط کام کیے ہوں گے وہ اولاد اُس روز کام نہ آئے گی۔

جو لوگ محض زبانی نہیں بلکہ دل سے رب کو چاہنے والے ہیں وہ رب تعالیٰ کی طرف سے آنے والی ہر مصیبت، مشکل، آفت، تنگی، مفلسی اور غربت کو اتنی خوب صورتی اور خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہیں کہ اُن کے قریبی لوگوں کو بھی پتا نہیں چلتا کہ وہ کس حال میں ہیں۔ آپ نے ایسے صاحبانِ ایمان کو دیکھا ہوگا جو دشمنوں کے نرغے میں کھڑے ہونے کے باوجود مسکرا رہے ہوتے ہیں حالاں کہ جانتے ہیں کہ اگلے ہی لمحے وہ قتل کر دیے جائیں گے۔ یہ وہ مبارک لوگ ہیں جنھیں اپنے رب پر ایسا بھروسا ہے کہ موت کو بالکل سامنے دیکھ کر بھی اُن کے ذہن میں یہ خیال رہتا ہے کہ میرا رب میرے ساتھ ہے۔ اگر مجھے مرنا ہے تو یہ موت میرے رب کی طرف سے بھیجی گئی ہے جس سے مفر ممکن نہیں۔ اگر اُس نے بچانا ہے تو میں دشمنوں کے نرغے سے بچ کر نکل جاؤں گا۔ رب پر اِس بھروسے کی وجہ سے اُس کے چہرے پر نہ کوئی فکر و ملال ہوتا ہے اور نہ ہی وہ دشمن سے Compromise کرتا ہے۔ ہم کبھی جب تنہائی میں بیٹھے ہوں تو بہت گہرائی سے واقعۂ کربلا کا جائزہ لیں۔ میرا ذہن بار ہا اُدھر گیا (میں سنی العقیدہ ہوں لیکن سمجھتا ہوں کہ اِن ہستیوں سے پیار کرنا تمام مسلمانوں کے لیے واجب ہے۔) میدانِ کربلا میں جو کردار حضرت امام حسینؓ نے دکھایا وہ آج تک نہ کسی نے دکھایا نہ کوئی قیامت تک دکھا سکے گا۔

ہمارے بچوں میں سے کسی کو اگر سوئی بھی چبھ جائے تو ہم جان دے کر بھی اُسے سوئی کی اُس چبھن سے نجات دلانے کی کوشش کرتے ہیں جب کہ میدانِ کربلا میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ضعیف العمر انسان اپنے ہاتھوں سے اپنے جوان بیٹے کو تیار کرتا ہے۔ یہ جاننے کے باوجود کہ اکیلا بچہ دس ہزار فوج کے مقابل جا رہا ہے، اُس کی شہادت یقینی ہے...... زندہ واپس نہ آئے گا...... اُسے گھوڑے پر سوار کر کے بھیجتا ہے اور پھر جوان بیٹے کو شہید ہوتے دیکھتا ہے...... لیکن پھر بھی نہ کوئی شکوہ نہ آنسو نہ ملال اور نہ کوئی تسبیح یا وظیفہ۔ جب بیٹا شہید ہو جاتا ہے تو بڑے حوصلے سے اپنے ہاتھوں سے اُس کی لاش اُٹھا کر لاتا ہے۔ پھر بھانجے، بھتیجوں کو اپنے ہاتھوں سے تیار کر کے بھیجتا اور ان کی شہادت کا نظارہ دیکھتا ہے۔ آخر میں خود گھوڑے پر سوار ہو کر دشمن کی فوج کی طرف جاتا اور شہید ہو جاتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھیں اپنے رب پر اس درجے کا بھروسا ہے کہ اپنا سب کچھ رب پر قربان کر دیتے ہیں کہ میرا رب یہی چاہتا ہے۔ جب انسان کو اپنے رب پر اس درجے کا بھروسا ہو جاتا

ہے پھر وہ اُس مقام پر آجاتا ہے کہ جہاں اُسے پریشانیاں اور تکلیفیں پریشان نہیں کرتیں جب کہ ہماری زندگی میں ذرا سی مشکلات آجائیں تو ہم پریشان ہو جاتے ہیں۔

مجھے ایک مدت سے فجر کی نماز کے بعد سونے کی عادت ہے۔ فجر کی نماز پڑھ کر جائے نماز پر ہی سو جاتا ہوں۔ ماضی میں چوں کہ دفتر جانے سے پہلے مرشد صاحب کے پاس حاضری دینا ہوتی تھی اس لیے پونے دو گھنٹے سونے کا معمول ہے۔ ایک روز جب میں نمازِ فجر کے بعد جانماز پر سو رہا تھا تو Wife نے مجھے کندھے سے ہلا کر جگایا کہ ایک مصیبت زدہ خاتون آپ سے ملاقات کے لیے تشریف لائی ہیں اور وہ مسلسل رو رہی ہیں۔ میں اُٹھ بیٹھا اور Wife سے کہا "آئیے میرے ساتھ آپ بھی اُن خاتون سے مل لیجیے۔" حالاں کہ میں اپنے پاس آنے والوں کی Privacy کا خیال رکھتا ہوں لیکن اُس روز وجہ ذرا مختلف تھی اور وہی ہوا۔ میں نے خاتون سے مسئلہ دریافت کیا تو کہنے لگیں "شاہ صاحب! میرے سالن میں مکھی گر جاتی ہے۔" میری Wife یہ سب سن کر خاصی حیران ہوئیں۔ کچھ عرصے بعد ایک اور خاتون صبح سویرے آگئیں۔ اُس روز بھی میں نے Wife سے کہا۔ "آپ بھی آجائیے، دیکھیے کہ اِنھیں کیا تکلیف ہے۔" وہ خاتون کہنے لگیں "شاہ صاحب! مجھے اُلٹے سیدھے خواب دکھائی دیتے ہیں جن کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔"

اب ذرا غور کیجیے کہ ہمارا یہ عالم ہے کہ بجائے تدبیر کر کے مسائل سلجھانے کے (مثلاً مکھیوں سے بچنے کے لیے کوئی Insecticide سپرے کر لیا جائے) ہم منہ اندھیرے لوگوں کے پاس بھاگے جاتے ہیں کہ صاحب دُعا کر دیں کہ سالن میں مکھی نہ گرا کرے۔ اِسی طرح ہم خوابوں سے یوں خوف زدہ ہو جاتے ہیں کہ جیسے معاذ اللہ خواب ہی زندگی کو کنٹرول کر رہے ہیں۔

جن مسلمانوں نے عروج پایا وہ اِن واہموں سے دُور تھے۔ جب ہم اِن واہموں کا شکار ہونے لگے تو ذلت و رُسوائی ہمارے مقدر میں لکھ دی گئی۔

خوشیوں کی طرح تکلیفیں بھی زندگی کا حصہ ہیں۔ رب تعالیٰ نے زندگی کو یونہی بنایا ہے کہ اِس میں ہم مختلف قسم کے غم دیکھیں گے، ہر طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑے گا اِس لیے ہم زندگی کو یہ سوچ کر ہنسی خوشی قبول کر لیں کہ اس میں راحتیں بھی آئیں گی اور دُکھ بھی۔ لوگوں سے ہم فیض بھی پائیں گے اور اُنھی سے دھوکا بھی کھائیں گے۔

جب ہم زندگی کے ہر معاملے کو اس ایمان اور بھروسے کے ساتھ دیکھیں گے کہ ہمارا رب ہمارے ساتھ ہے۔ جب تک وہ زندہ و قائم ہے اور الحمدللہ وہ زندہ و قائم رہنے والا ہے پھر ہمیں کاہے کی فکر۔ یہ ایمان اور بھروسا ہمیں بے نیاز کر دیتا ہے اور ہم دوسرے لوگوں کے سامنے جا کر گڑگڑانے اور اُن کے سامنے دُکھ بیان کرنے سے بچ جاتے ہیں۔ اگر آپ کے لیے ممکن ہو تو سورۃ التغابن عشاء کی نماز کے بعد پڑھیے۔ اس میں یہی سبق ہے کہ زندگی کو As It is قبول کر لیجیے۔ اِس سورہ کی آیت نمبر 11 میں بتایا گیا ہے کہ انسان کو کوئی ایذا نہیں آتی سوائے اللہ کی طرف سے......

"کوئی مصیبت نہیں پہنچتی مگر اللہ کے حکم سے اور جو اللہ پر ایمان لائے اللہ اُس کے دل کو ہدایت فرمائے گا اور اللہ سب کچھ جانتا ہے۔" (التغابن:11)

اگر زندگی میں رب کی طرف سے کوئی تکلیف آگئی ہے تو پھر ہم اُس کے سامنے سرِ تسلیم خم کیوں نہ کر دیں، اُسے ہنستے مسکراتے قبول کیوں نہ کر لیں اور کہیں "یا باری تعالیٰ! یہ تُو ہی تو ہے جس نے ساری عمر مجھے اچھے حال میں رکھا۔ اگر یہ چار دن کی تکلیف آگئی ہے تو مجھے پورا یقین ہے کہ تُو اِسے بھی جلد ہی مجھ سے ٹال دے گا......" اور بے شک رب اُس تکلیف کو ختم کر دیتا ہے۔ عشاء کی نماز کے بعد سورۃ التغابن پڑھنے سے بہت کچھ حاصل ہو جائے گا۔ اِس سے بنیادیں تعمیر ہو جائیں گی۔ حروفِ مقطعات یا رُوح سے مطابقت رکھتا ہوا کوئی حرف، لفظ، تسبیح یا وظیفہ پڑھنے کا فائدہ تب تک نہ ہوگا جب تک بنیادیں تعمیر نہ ہو جائیں۔ سورۃ التغابن کی تلاوت سے یہ بنیادیں تعمیر ہو جائیں گی اور اِس کے بعد جب ہم کوئی وظیفہ پڑھیں گے تو اُس کے فوائد صحیح رنگ میں سامنے آئیں گے۔

سوال: سورۃ التغابن کھلے آسمان تلے کھڑے ہو کر پڑھی جائے یا تنہائی میں؟

جواب: میں سورۃ التغابن کھلے آسمان تلے پڑھتا رہا ہوں...... کھڑے ہو کر نہیں بلکہ بیٹھ کر۔ اگر آپ کے لیے ممکن ہو تو آپ اسے تنہائی میں پڑھیے...... بہت تیزی سے پڑھنے کے بجائے ترتیل سے پڑھیے۔ کوشش کیجیے کہ کھلی فضا میں بیٹھ کر پڑھ لیں لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو بند کمرے میں پڑھ لیجیے۔ بہت فوائد حاصل ہو جائیں گے۔

سوال: کیا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم والے وظیفہ کی مانند سورۃ التغابن پڑھنے کے فوراً بعد بھی سونا ضروری ہے؟

جواب: عشاء کی نماز مکمل کرنے کے بعد آپ سورۃ التغابن پڑھ لیجیے۔ اس کے بعد معمول کے مطابق قرآن پاک کی تلاوت کر لیجیے۔ سورۃ التغابن پڑھنے کے بعد کسی سے بات کیے بغیر سونے کی کوئی پابندی نہیں۔ یہ پابندی صرف بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے وظیفے کے لیے ہے کہ اگر کسی کو اس وظیفہ کے لیے عشاء کا وقت Suit کرتا ہے تو وہ وظیفہ پڑھنے کے بعد بات کیے بغیر کچھ دیر کے لیے سو جائے۔

سوال: اسلام میں نظر لگنے کا Concept کیا ہے؟

جواب: اسلام میں نظر لگنے کا Concept موجود ہے لیکن معلوم نہیں کیوں میرا رب کے بارے میں عقیدہ بڑا جاہلانہ ہے۔ میں رب تعالیٰ اور آپ ﷺ پر جہالت کی حد تک بھروسا کرتا ہوں۔ میں تو اُن لوگوں میں سے ہوں کہ ضرورت پڑنے پر ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی سے چھلانگ لگا دوں گا اِس ایمان کے ساتھ کہ میرا رب مجھے بچا لے گا۔ اس جاہلانہ بھروسا کی وجہ سے میں نے کبھی نہیں سوچا کہ جادو، تعویذ یا نظر لگنا بھی کوئی چیز ہے۔

جب یہاں (212۔ جہانزیب بلاک علامہ اقبال ٹاؤن) سوموار کو دُعا ہوتی تھی تو میرے ایک دوست اور مہربان اپنی دوستی اور مہربانی کے مظاہرے کے لیے ہر سوموار کو تشریف لاتے اور گیٹ کے پاس کونے میں

میرا ایک پتلا جس میں سوئیاں چبھی ہوتیں اور ایک ہنسلی کی ہڈی جس پر لکھا ہوتا کہ اس کو موت آجائے، اس کو فلاں فلاں ہو جائے، دبا جاتے۔ میں دُعا سے فارغ ہو کر جب نکلتا تو احساس ہوتا کہ یہ چیزیں یہاں دبی ہوئی ہیں۔ اُنھیں نکالتا اور Dustbin میں پھینک کر گھر روانہ ہو جاتا۔ میرے نزدیک تو ان چیزوں کی بس اتنی ہی Value ہے کہ اُنھیں دیکھ کر قہقہہ لگایا جائے اور اُٹھا کر Dustbin میں پھینک دیا جائے۔ ایک بار میں یونیورسٹی روڈ پر کینال برج کے سگنل پر کھڑا تھا کہ اچانک میری گاڑی کی ونڈ سکرین خون سے بھر گئی۔ لوگوں نے شور مچا دیا کہ جادو ہو گیا، جادو ہو گیا۔ میں نے کہا "آپ اپنی اپنی گاڑیوں میں تشریف رکھیے۔ کچھ نہیں ہے یہ۔" واشرز چلا کر سکرین کے وائپرز سے اُس خون کو کچھ صاف کیا اور دفتر چلا آیا۔ وہاں ڈرائیور گاڑی کی سکرین دھوتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ میں نے کہا "لاؤ میں خود ہی اِسے دھو لیتا ہوں۔" اللہ کا کرم ہے آج بھی آپ کے سامنے زندہ سلامت بیٹھا ہوں۔

بھائی! میں تو اِن قصوں میں نہیں پڑتا۔ اِن سب کا وجود ہے لیکن شاید رب پر بھروسا ان سب چیزوں سے زیادہ طاقت ور ہے۔ نظر، جادو، تعویذ، گنڈے، ٹونے...... یہ سب چیزیں رب تعالیٰ کے سامنے بے کار ہیں۔

میرا اُس آیت پر بہت بھروسا ہے کہ کوئی کسی کو فائدہ نہیں پہنچا سکتا اگر رب نہ چاہے اور کوئی کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا اگر اللہ نہ چاہے۔ جب رب تعالیٰ نے یہ وعدہ کر لیا مجھ سے تو پھر مجھے کس چیز کا ڈر یا خوف! اِ‌گر کوئی مجھے سر سے پاؤں تک بھی اِن چیزوں میں دفن کر دے تو میں اِن سب سے آرام سے نکل جاؤں گا کیوں کہ میرا رب تعالیٰ موجود ہے مجھے اِن سب سے بچانے کے لیے۔ آپ ﷺ کی نظرِ عنایت ہے اپنی پوری اُمت پر۔ آپ ﷺ کے ہوتے ہوئے ڈر کس بات کا۔

سوال: سود (Interest) کی ایک خاص Percentage کو بعض علما کرام نے جائز قرار دیا ہے۔ کیا یہ درست ہے؟

جواب: جب اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں واضح طور پر فرما دیا کہ سود لینے اور دینے والا اور سود کے کاروبار میں مدد دینے والا مجھ سے کھلی جنگ کرتا ہے تو پھر Percentage خواہ کچھ بھی ہو وہ جائز نہیں۔ جہاں کھلے احکامات ہوں وہاں مسلمان کو تاویلات میں جانے کی ضرورت نہیں البتہ جو احکامات قرآن و سنت میں واضح نہیں وہاں اِجتہاد سے کام لیا جاتا ہے۔

چوں کہ سود کے بارے میں احکامات بالکل Clear ہیں اس لیے سود کو کسی بھی صورت جائز قرار نہیں دیا جا سکتا خواہ اِس کی Percentage 0.1 ہی کیوں نہ ہو۔

میں علمائے کرام کو جھٹلا نہیں رہا۔ وہ مجھ سے کہیں زیادہ علم رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے یہ تاویل اس لیے نکالی کہ سود اِس لیے منع کیا گیا کہ اِس سے انسانوں کی Exploitation (اِستحصال) ہوتی ہے۔ اِس لیے علما اُس Level تک سود کی Percentage کی اجازت دے دیتے ہیں جس Level تک Exploitation نہ ہوتی ہو۔ لیکن میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ جو قرآنی احکامات Clear ہیں اُن میں تاویلات نہیں نکالی جا سکتیں۔ سود خواہ کسی بھی قسم کا ہو، حرام ہے۔

نفس سے جنگ

ہمارے ہاں بہت تیزی سے عقائد میں تبدیلیاں آرہی ہیں اور وہ بھی اِس یقین کے ساتھ کہ یہ تبدیلیاں بالکل درست ہیں۔ یہ رُجحان اور رویہ بعض اوقات انسان کو Upset کر دیتا ہے۔ لوگ صاحب دُعا کے پاس جاتے ہیں تو اِس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ پڑھنے کے لیے کچھ دے دیجیے۔ اگر اُن صاحب نے صحیح گائیڈ کرتے ہوئے کہہ دیا کہ آپ سونے سے پہلے اور اُٹھنے کے بعد تلاوت قرآن پاک کر لیا کیجیے تو وہ برجستہ کہتے ہیں ''وہ تو ٹھیک ہے لیکن آپ کچھ پڑھنے کے لیے دے دیجیے۔'' یہ رویہ انسان کے عقائد میں تبدیلی کو ظاہر کر رہا ہے کہ جہاں انسان یہ سوچنے لگے کہ قرآن پاک پڑھنے سے میرے دُنیاوی مقاصد حاصل نہیں ہوتے بلکہ یہ تو کسی وظیفے سے حاصل ہوں گے۔ مجھے غیر ملکیوں سے Interaction کا کچھ Experience ہے Even ہندو سے بھی اگر کہہ دیا جائے کہ قرآن پاک کی تلاوت کر لیجیے تو وہ کہے گا کہ ضرور کر لوں گا۔ لیکن مجھے عربی نہیں آتی اِس لیے اگر ہندی میں قرآن پاک مل جائے تو پڑھ لوں گا۔ جب کہا جائے کہ ہندی کے بجائے عربی میں ہی قرآن پاک پڑھنا پڑے گا تو وہ کہتا ہے کہ کوئی حل بتائیے۔ یہ نہیں کہے گا کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ آپ اُسے رومن ہندی میں قرآن پاک لکھ دیں تو کچھ Effort کے بعد وہ قرآن پاک کی تلاوت روانی سے کرنے لگے گا۔

اِسی طرح کچھ Americans سے جب قرآن پاک پڑھنے کو کہا گیا تو اُن کا جواب یہ تھا کہ ہم پڑھ لیں گے کیوں کہ وہاں قرآن پاک رومن انگلش میں مل جاتا ہے۔ یہ سب لوگ کبھی یہ نہیں کہتے کہ نہیں صاحب! آپ ہمیں کوئی وظیفہ بتا دیجیے۔

قرآن پاک صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ سب کے لیے ہے اور سبھی اِس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ قرآن پاک کی فضیلت، برکات اور اثرات اِتنے زیادہ ہیں کہ انسانی ذہن اُن کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ جب صاحب دُعا ہمیں قرآن پاک پڑھنے کی تاکید کر رہا ہوتا ہے تو وہ دراصل ہماری دُنیا و آخرت سنوارنے کی بات کر رہا ہوتا ہے۔ قرآن پاک کی تلاوت انسان کو رب سے ملا دیتی ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ کو رب تعالیٰ نے خواب میں بتایا تھا کہ مجھ تک پہنچنے کا آسان راستہ قرآن پاک کی کثرت سے تلاوت ہے۔

دُنیاوی مقاصد کا حصول تو بہت معمولی سی بات ہے۔ قرآن پاک کی تلاوت سے انسان رب تعالیٰ تک

جا پہنچتا ہے۔ دُنیاوی مقاصد کا زیادہ تعلق ضروریات کی نسبت ہمارے نفس سے ہے۔ انسانی جسم میں موجود سات لطائف میں سے ایک لطیفہ نفس ہے۔ عجیب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی جسم میں نفس کو قلب کے بالمقابل رکھا۔ حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا ''ولایت کے حصول کا آسان طریقہ کیا ہے؟'' جواب آیا ''اپنے نفس سے لڑو۔''

دُعا کے دوران ایک اور سوال اکثر لوگ پوچھتے ہیں کہ نماز میں دھیان نہیں رہتا۔ حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ نے اس کا بھی جواب دیا تھا کہ جس شخص کو نماز میں لطف نہیں آتا اور یکسوئی حاصل نہیں ہوتی اُسے چاہیے کہ وہ اپنے نفس سے لڑے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اوائل عمر میں ایک بار جب میں نے سوچا کہ میں رات کا کافی حصہ عبادت میں گزاروں گا تو نفس نے بہکانا شروع کر دیا تاکہ نصف شب عبادت میں نہ گزر سکے۔ تب میں نے نفس کو مخاطب کر کے کہا کہ تم مجھے رب تعالیٰ کی طرف رُجوع نہیں کرنے دے رہے لہٰذا اب میں تمھیں یہ سزا دوں گا کہ ایک سال تک تمھیں پانی نہ پینے دوں گا۔ پھر میں نے ایک سال تک پانی نہیں پیا بلکہ دوسری خوراک سے یہ ضرورت پوری کرتا رہا۔

میں اپنے مرشد قبلہ سید یعقوب علی شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن کے عادات و اطوار اور حرکات کا بغور مطالعہ و مشاہدہ کیا کرتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ دن بھر میں محض ایک آدھ گھونٹ پانی پیتے تھے البتہ چائے کے پندرہ بیس کپ پی لیا کرتے۔

مئی جون کے روزوں میں میں نے مشاہدہ کیا کہ افطار کے وقت صرف ایک Teaspoon فروٹ چاٹ اور دو Teaspoon چنے کی چاٹ کھاتے۔ اِس کے بعد دو گھونٹ پانی پیتے...... پھر چائے بنا کر پی لیتے۔ میں یہ سب دیکھا کرتا۔ ہمیں چائے پلانے کے بعد اپنے خادم سے کہتے کہ جاؤ روٹیاں لے آؤ۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ کھانا کھائیں گے لیکن ہمیں کھانا Serve کرنے کے بعد خود آرام سے بیٹھے رہتے۔ شروع میں جب میں نے کہا ''حضور! آپ نہیں کھا رہے۔'' کہنے لگے ''میں سحری میں کھا لیتا ہوں۔'' ماہِ رمضان میں رات تراویح شروع ہونے تک میں وہاں بیٹھا رہتا لیکن دیکھا کہ اُنھوں نے پانی نہیں پیا۔ اِس کے بعد تقریباً دو سال گزرے تو خود میں نے Realise کیا کہ میں 24 گھنٹوں میں صرف ایک کوارٹر گلاس پانی پینے لگا ہوں۔ لیکن اُن دنوں جو لطف آیا وہ پہلے کبھی نہ آیا تھا۔ (یہ مت سمجھیے گا کہ میں عبادت میں لطف کی بات کر رہا ہوں۔ عبادت تو آج تک میں کر ہی نہیں پایا۔ ایسی توفیق کبھی نہ ہوئی کہ میں رب کو پکار لیتا) وہ عجیب سرور کے دن تھے۔ ساڑھے چار سال تک میں دن بھر میں ایک کوارٹر گلاس پانی پیتا رہا لیکن اس کے بعد جب روزے آئے تو دسویں روزے کو مجھے ڈی ہائیڈریشن ہو گئی اور مجھے ہسپتال جانا پڑ گیا۔

مرشد صاحب اور مجھ جیسے گناہ گار، دُنیادار آدمی میں یہی فرق تھا کہ وہ اِتنے نیک عبادت گزار آدمی

نہ اُن کے پاس Airconditioning کی Facility نہ دیگر سہولیات...... اس کے باوجود نہ جانے کب سے وہ بغیر پانی کے زندگی گزار رہے تھے۔ اُن کی زندگی کی آخری سانس تک میں نے اُنھیں زیادہ پانی پیتے نہیں دیکھا۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے نفس کو پانی سے روک کر جو سزا دی تھی اس کی مصلحت بہت بعد میں سمجھ آئی کہ زیادہ پانی پینے سے انسان میں سستی اور کاہلی آتی ہے...... نیند زیادہ آنے لگتی ہے۔ جب کم پانی پینے سے عبادت میں Concentration بڑھ جاتی ہے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے نفس کو بہت صحیح سزا دی کیوں کہ پانی کم پینے سے عبادت میں دل لگنے لگتا ہے اور یک سوئی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایسے میں جب انسان رب تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو دھیان مکمل طور پر اُسی کی طرف ہوتا ہے۔ (آپ یہ مت سمجھیے گا کہ میں آپ کو Suggest کر رہا ہوں کہ پانی کم پییں...... جیسا کہ ابھی میں نے بتایا کہ میں نے جب ایسا کیا تو مجھے Dehydration ہو گئی...... یہ کام صرف نیک لوگوں کے کرنے کے ہیں...... مجھ جیسے گناہ گاروں کے کرنے کے نہیں۔)

اکثر لوگ ایک اور سوال پوچھتے ہیں کہ رُوحانیت کیسے حاصل ہو۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے فرمان کے مطابق ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اپنے نفس سے لڑا جائے۔ دوسرا طریقہ بھی حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے ہی بتایا تھا کہ کم کھانا کھایا جائے۔

مرشد صاحب کو دیکھ کر یہ بات سمجھ آ گئی۔ اُن کا معمول یہ تھا کہ رمضان کے مہینے میں صرف سحری میں روٹی کھاتے جب کہ ماہِ رمضان کے علاوہ صرف رات کے کھانے میں ایک روٹی کھایا کرتے۔ صبح ناشتے اور لنچ میں ایک کپ چائے لیتے۔ مرشد صاحب کے جسم پر گوشت نہیں تھا صرف ہڈیوں پر کھال منڈھی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا یہ تو نیکی کے لیے کرتے ہیں میں سمارٹ رہنے کے لیے یہ عمل شروع کر دوں۔ مرشد صاحب کی نقل میں روزانہ شام کو صرف ایک روٹی کھانا شروع کر دی۔ زندگی اتنی مزے کی ہو گئی کہ میں نے رب تعالیٰ سے دُعا کرنا شروع کر دی "یا باری تعالیٰ! مہربانی فرما اور مجھے ہفتے میں ایک روٹی پر لے آ۔ میں ہفتے میں ایک روٹی کھاؤں اور میرا گزارہ ہوتا رہے۔" مجھے معلوم نہیں تھا کہ رات کو تنہائی میں بیٹھ کر میں جو دُعا کرتا ہوں وہ کہیں اور بھی مانیٹر ہو رہی ہے۔ یہ دُعا کرتے ہوئے مجھے مہینا ڈیڑھ مہینا ہوا تھا کہ ایک دن جب میں دو تین لوگوں کے ہمراہ مرشد صاحب کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو وہ اُن لوگوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے (مرشد صاحب نے براہِ راست مجھ سے کبھی ایسی بات نہ کہی تھی۔ وہ دوسروں کو مخاطب کرتے لیکن دراصل مجھے بات کہہ رہے ہوتے تھے) "میں تمھیں ایک مزے کی بات بتاؤں۔ آدمی ایک خاص طریقے سے صرف ایک نوالہ روز کھائے تو نہ اُس کے جسم میں کمزوری ہوتی ہے نہ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بنتا ہے۔ اس ایک نوالے سے روز اتنی توانائی مل جاتی ہے کہ آدمی بڑے مزے کی زندگی گزار لیتا ہے۔" اُنھوں نے وہ طریقہ بھی بتا دیا جسے سن کر میں نے ایک روٹی کے بجائے روزانہ شام کو ایک نوالہ کھانا شروع کر دیا۔ اور واقعی اُس ایک نوالے سے پیٹ

بھر جاتا تھا حالاں کہ میرے بچپن میں والدہ صاحبہ نے بار بار روٹی کھانے پر اپنے جالندھری لہجے کی پنجابی میں کہا تھا "اوئے تیرا پیٹ آ...... یا بے ایمان دی قبر...... کہ بھر دا ای نہیں۔"

بلاشبہ یہ پیٹ بے ایمان کی قبر ہی ہے لیکن حیران کن طور پر اُس ایک نوالے سے پیٹ بھر جاتا تھا...... نہ کمزوری محسوس ہوتی...... نہ وزن کم ہوا نہ توانائی کم ہوئی۔ اُس زمانے میں میری Waistline 32 انچ تھی۔ چوں کہ سرکاری وردی پہننا پڑتی تھی اس لیے Trousers کی بیلٹ سے پتا چل جاتا تھا۔ ایک نوالہ کھانے کے باوجود Waistline 32 انچ ہی رہی۔ ایک نوالے والے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے ابھی چھ مہینے ہی گزرے تھے کہ مرشد صاحب سے جوتے پڑ گئے۔ ہوا یوں کہ میں مرشد صاحب کے پاس بیٹھا کھانا کھا رہا تھا تو اُن کے خوف سے ایک نوالے کے بجائے آدھی روٹی کھا لی۔ کہنے لگے "یہ تم میری نقل کرتے ہو۔ ابھی تمھاری عمر کا وہ حصہ نہیں آیا کہ تم ایک نوالہ کھاؤ" تب اُنھوں نے مجھے دو روٹیاں کھلا دیں۔ اس طرح ایک نوالہ والی روٹین اُنھوں نے ترک کرا دی اور میں دوبارہ ایک روٹی پر شفٹ ہو گیا اور اب تک وہی روٹین چل رہی ہے۔ آہستہ آہستہ وقت نے بتایا کہ میں تو گناہ گار، دُنیا دار اور سیاہ کار شخص ہوں، یہ تو نیک لوگوں کے کام ہیں۔

بات رُوحانی ترقی سے چلی تھی کہ کم سے کم کھانے سے زندگی کا لطف بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح اگر انسان کھینچ تان کر اپنی نیند پونے دو گھنٹے یا دو گھنٹے پر لے جائے تو رُوحانی ترقی بہت تیز ہو جاتی ہے۔ تیسرا مزے کا کام یہ ہے کہ انسان خاموش بیٹھے اور غور و فکر میں ڈوبا رہے۔ غور و فکر والے طریقے پر میں نے عمل کیا تو (رُوحانیت تو مجھے کیا ملتی تھی) ایک بڑا زبردست فائدہ ہوا کہ لوگ مجھے عقل مند سمجھنے لگے۔ میں محفل میں بیٹھا آنکھیں بند کیے سیر کیا کرتا۔ تب اہلِ محفل مجھے اسکالر سمجھتے اور میری خاموشی سے متاثر ہوتے جس کا میں بہت مزا لیتا۔ غور و فکر کرنے سے نت نئے نکتے کھلتے ہیں۔ آیات پر غور کرنے سے نئے نئے معانی سمجھ میں آتے ہیں۔

اولیائے کرام نے نیک لوگوں کی یہ نشانی بتائی ہے کہ وہ کم کھاتے، کم سوتے اور کم کلام کرتے ہیں...... یہ تینوں خوبیاں واقعی انسان کو Pay off کرتی ہیں۔

وہ دس کثافتیں جو انسان کو رُوحانی ترقی میں آگے نہیں بڑھنے دیتیں اُن میں حرصِ طعام اور حرصِ کلام بھی ہیں۔ ان کثافتوں کے دور ہونے سے نماز میں زیادہ دل لگتا ہے اور انسان غور و فکر میں ڈوبا رہتا ہے۔

قرآن پاک کی تلاوت سے بات شروع ہوئی تھی۔ تلاوت قرآن پاک سے ہمیں دُنیاوی لالچ اور پریشانیوں سے چھٹکارا مل جاتا ہے۔ اگر ہم نے یہ سیکھ لیا کہ ہم زندگی کو ویسے ہی قبول کر لیں جیسی کہ وہ ہے تو تفکرات، بے چینی اور پریشانی ختم ہو جاتی ہے۔ ہم بس اپنی ڈیوٹی پوری کرتے رہیں، اپنی صلاحیتوں اور عقل و فہم کے مطابق کوشش کر کے اپنا فرض ادا کرتے رہیں تو زندگی بہت آسان ہو جائے گی۔ پھر ہمیں کسی صاحب دُعا، تعویذ لکھنے والے یا لوٹا پھیرنے والے کے پاس جانے کی ضرورت نہیں رہتی...... پھر ہم اپنی دُنیا میں مست رہتے ہیں۔

پُرانی بات ہے مشکل حالات میں اگر کبھی ہمارا Colleague خوش نظر آتا تھا تو ہم اُسے کہا کرتے "تم کیا بھوکے گورے کی مانند پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے سیٹی بجاتے پھر رہے ہو؟" جب انسان زندگی کو As it is قبول کر لیتا ہے تو وہ واقعی سیٹی بجانے لگتا ہے۔ مثلاً روٹی نہیں مل رہی...... وہ کہتا ہے ٹھیک ہے ایسے ہی زندگی گزرے گی...... جب اللہ مناسب سمجھے گا روٹی دے دے گا۔ کپڑے پھٹے ہوئے ہیں...... تو کہتا ہے کوئی بات نہیں رب تعالیٰ جب چاہے گا مجھے اچھی پوشاک عطا کر دے گا۔ اگر محنت کے باوجود ترقی نہیں ہو رہی تو سوچتا ہے کہ یقیناً میری محنت اور کوشش میں کسر ہے۔ رب جب چاہے گا ترقی دے دے گا۔ اس طرح کی سوچ سے زندگی بہت آسان ہو جاتی ہے۔

ایک درخواست دوبارہ کرنا چاہوں گا کہ جہاں دُعا ہوتی ہے وہاں بچوں کو نہ لے کر جایا کریں۔ ہم من حیث القوم بے عملی کا شکار ہیں اور محنت کو شجرِ ممنوعہ سمجھ کر اُس سے دُور رہتے ہیں۔ نوبت یہاں تک آ گئی ہے کہ جاب کے لیے Apply کرنے سے پہلے میں لوٹا پھیرنے والے کے پاس جا کر کہتا ہوں کہ آپ مجھے بتائیں کہ یہ جاب مجھے ملے گی یا نہیں۔ اگر تو مل جائے گی تو میں درخواست Submit کرتا ہوں اور اس کے لیے تگ ودو کرتا ہوں ورنہ کیا ضرورت ہے۔ جب ہم بچوں کو دُعا والی جگہ پر لے جاتے ہیں تو بچے بھی اس بے عملی کا شکار ہونے لگتے ہیں کیوں کہ اُن کے ناپختہ ذہن میں یہ بات بیٹھ جائے گی کہ محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے، دُعا کرانے سے کام ہو جائے گا...... یوں وہ زندگی میں کوئی مقام حاصل نہیں کر پائیں گے۔

مسلمان بہت پریکٹیکل ہوتا ہے۔ وہ عملی محنت اور بھرپور جدوجہد پر یقین رکھتا ہے۔ اُسے اپنے رب پر بھروسا ہوتا ہے کہ رب کے فرمان کے مطابق انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے۔ چوں کہ رب اپنے وعدے کا بڑا پکا ہے اور وہ اِس کے خلاف نہیں کرتا اِس لیے مجھے پہلے بھرپور کوشش اور محنت کرنی ہے اور پھر دُعا "یا باری تعالیٰ! اپنی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کے مطابق میں نے مقدور بھر محنت کر لی۔ اب میں اس معاملے کو تیرے سپرد کرتا ہوں تو مجھے اس کا وہ نتیجہ عطا فرما جو میرے مفاد میں بہترین ہے۔"

بچوں کو دُعا والی جگہ پر لے جانے کی غلطی مت کیجیے بلکہ اُن سے کہیے کہ رب کے حکم پر چلو۔ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو دیکھو وہاں پہلے عملی جدوجہد ہے اور پھر دُعا۔ اس لیے بیٹا پہلے محنت کرو پھر دُعا کرائیں گے۔

سوال: یہ کیسے پتا چلے گا کہ خواہش قلب کی ہے یا نفس کی؟

جواب: یہ Differentiate کرنا بہت آسان ہے۔ اگر تو خواہش اللہ کے بتائے ہوئے Dos کے مطابق ہے تو قلب کی ہے۔ اگر Don'ts کے حوالے سے ہے تو نفس کی ہے۔ ایسی خواہش کو فوری طور پر دبا دینا چاہیے۔

سوال: What are UFOs?

جواب: UFO دراصل Unidentified Flying Object کا مخفف ہے۔ اسے بعد میں اُڑن طشتری کا نام دیا گیا۔ ایک زمانے میں روزانہ اخبار میں آیا کرتا کہ فلاں علاقے میں بہت سی اُڑن طشتریاں دیکھی

گئیں۔ تب اس کے بارے میں بہت سی Myths اور کہانیاں پھیلا دی گئیں کہ شاید یہ کسی اور Planet کے لوگ ہیں جو زمین پر آنا چاہتے ہیں اور ان کے جہاز اُڑن طشتریوں کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ پھر یہ بھی سننے میں آیا کہ Developed countries کی ایئر فورس کے جیٹ ایئر کرافٹس نے اِن اُڑن طشتریوں کا پیچھا کرنے کی کوشش کی تو یہ ہاتھ نہیں آئیں۔ بعد کے وقت نے ثابت کیا کہ دونوں سپر پاورز اور ایک دو Developed countries اصل میں مصنوعی سیاروں کے چکر میں Satellite پر تجربات کر رہے تھے۔ جو UFOs فضا میں چھوڑے گئے وہ دراصل تجرباتی Rockets یا Satellites تھے۔ اُن کو خفیہ رکھنے کے لیے اُنھوں نے مختلف کہانیاں اِتنے بڑے پیمانے پر پھیلائیں کہ لوگوں کو یقین ہو گیا کہ شاید مریخ کے لوگ اِن اُڑن طشتریوں کے ذریعے زمین پر آنا چاہ رہے ہیں۔ لیکن بعد میں جب Satellite launch ہونا شروع ہو گئے تو اِس کے ساتھ ہی اُڑن طشتریاں نظر آنا بند ہو گئیں اور Russia اور امریکہ نے Satellite خلا میں چھوڑ دیا۔ پھر فرانس اور برطانیہ نے بھی اپنے Satellite خلا میں چھوڑے Weather Satellite اور Communication سیٹلائٹ Launch کر دیے گئے۔ اب ہم انھیں UFO نہیں کہتے۔

عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ Developed countries اپنے تجربات پر پردہ ڈالنے کے لیے اِس طرح کی Stories پھیلا (Circulate) دیتے ہیں اور لوگ ان Stories کو As it is buy کر لیتے ہیں اور اُن پر یقین کر لیتے ہیں۔

1955-56ء میں لندن کے آدھے حصے میں بڑی شدید آندھی آئی۔ ستر فیصد گھروں کی چھتیں یا دیواریں گر گئیں۔ کہا گیا کہ یہ کوئی Unknown weather pattern تھا۔

1998ء میں یہ بات واضح ہو گئی۔ کسی برطانوی شہری کی زبان سے یہ راز عیاں ہو گیا کہ درحقیقت برطانیہ نے یہ دیکھنے کے لیے تجربہ کیا تھا کہ اگر کوئی ایٹم بم گرا دیا جائے تو اُس سے Defence کیسے ممکن ہے؟ اُنھوں نے اِس کا حل یہ ڈھونڈا کہ جہاں ایٹم بم گرا ہے اُس کے تھوڑے فاصلے پر اگر کوئی اور طاقت ور بم Blast کر دیا جائے یا کسی اور طریقے سے Vacuum create کر دیا جائے تو اُس Area کی تمام ہوا اُس Vacuum کو Fill کرنے کے لیے بہت تیزی سے Rush کرے گی اور Radioactive ذرات کو وہاں سے Wash کر دے گی۔ 1955-56ء میں نصف لندن میں جو ہوا چلی وہ 100 میل فی گھنٹہ تھی۔ یہ ایک تجربہ تھا۔ اِس قسم کے تجربات کرتے وقت مختلف سٹوریز Circulate کر دی جاتی ہیں تاکہ Secrecy پر پردہ پڑا رہے۔

سوال: جنات اور Other dimensions کو دیکھنے کے لیے کوئی تسبیح بتا دیجیے۔

جواب: معین اختر نے ایک بار یہ Joke سنایا تھا کہ ایک غریب آدمی نے تربوز خریدا اور گھر آ کر جب اُسے کاٹا تو اُس میں سے جن برآمد ہوا اور بولا "کیا حکم ہے میرے آقا؟" غریب آدمی نے کہا "تم مجھے ایک عالی شان

گھر بنا دو۔" جن یہ فرمائش سن کر آنکھیں پھاڑتے ہوئے بولا" پاگل ہوئے ہو کیا؟ اگر میں گھر بنا سکتا تو خود تربوز میں رہتا کیا؟"

جناب اگر مجھے کوئی ایسی تسبیح آتی ہوتی تو دو چار جنات کو قبضے میں کر کے مزے کی زندگی نہ گزار لیتا۔ آپ ان قصوں میں مت پڑیے۔ جنات، مؤکلات یا Other dimension مخلوق ہمارے کسی کام کی نہیں۔ اُن سے کام لینا بددیانتی ہے۔ ہم وہ کام کیوں نہ کریں جو ہمیں رب تعالیٰ سے قریب کر دے۔

سوال: کیا ہم آپ ﷺ کے لیے قربانی کر سکتے ہیں؟

جواب: آپ ﷺ کے بارے میں نے پڑھا ہے کہ آپ ﷺ دو جانوروں کی قربانی فرماتے تھے۔

حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عید قربان کے دن دو خصی چتکبرے بکرے ذبح کیے جب اُنھیں قبلہ رُو لٹایا تو فرمایا میں نے خود کو اس ذات کی طرف متوجہ کیا جس نے زمین و آسمان پیدا کیے۔ میں دین ابراہیمی پر ہوں۔ ہر بے دینی سے الگ ہوں۔ مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔ یقیناً میری نماز، میری قربانی، میری زندگی، میری موت رب العلمین کے لیے ہے اُس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے اسی کا حکم ملا اور میں اطاعت گزاروں میں سے ہوں۔ الٰہی یہ میری طرف سے اور میرے اس اُمتی کی طرف سے جو قربانی نہ کر سکے۔ (ترمذی بحوالہ مشکوۃ المصابیح، حدیث 687)

حضرت احنشؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ کو دیکھا کہ آپ دو بکرے قربانی دیتے تھے میں نے عرض کیا یہ کیا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا مجھے رسول اللہ ﷺ نے وصیت فرمائی کہ میں آپ کی طرف سے بھی قربانی کیا کروں۔ لہٰذا میں نبی کریم ﷺ کی طرف سے قربانی کرتا ہوں۔ (مشکوۃ شریف، حدیث 688)

میرے خیال میں تو آپ ﷺ کے لیے قربانی دے دی جائے۔ میں خود بھی ہر سال آپ ﷺ کے نام مبارک پر قربانی دیتا ہوں لیکن میں مفتی نہیں ہوں کہ اس پر کوئی فتویٰ دے سکوں۔

آپ کسی Qualified مفتی سے اس بارے میں فتویٰ لے لیجیے۔

سوال: درود شریف کا دور صغیر اور دور کبیر کیا ہے؟

جواب: ہم انہی قصوں میں بھٹکتے اور پریشان ہوتے رہتے ہیں۔ یاد رکھیے! کسی وظیفے کا دور صغیر یا دور کبیر پورا کرنا نفلی عبادت ہے۔ اگر ہم فرض عبادت میں کوتاہی کریں اور نفلی عبادت میں Excel کرتے رہیں تو ہم سے پوچھ گچھ ہوگی اور سزا ملے گی۔ میں نفلی عبادت سے منع نہیں کر رہا لیکن پہلے ہم اپنے فرائض پورے کریں پھر نفلی عبادات پر توجہ دیں۔ آپ درود شریف ضرور پڑھیے۔ اگرچہ آپ ﷺ کو ہمارے درود کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ ﷺ ان چیزوں سے بہت بلند ہیں لیکن اپنے اظہار تشکر کے لیے ہم آپ ﷺ پر درود بھیجا

کریں کہ یا رسول ﷺ! ہم آپ ﷺ کے تہ دل سے شکر گزار ہیں کہ آپ ﷺ نے خود تکلیفیں اٹھائیں اور اللہ کا پیغام As it is ہم تک پہنچایا۔ بے پناہ دشواریاں Face کر کے اللہ کے پیغام کا عملی نمونہ ہمیں دے دیا۔ آپ ﷺ نے ہم پر جو احسان کیا اُس کے لیے ہم آپ ﷺ کے تہ دل سے احسان مند ہیں۔ آپ ﷺ پر درود بھیجنا سنت رب بھی ہے اس لیے ہم بھی درود شریف پڑھیں لیکن دور صغیر یا دور کبیر کے چکر میں نہ پڑیں۔

دور صغیر یا کبیر پورا کرنا Advanced level کی باتیں ہیں۔ پہلے ہم اپنے فرائض تو پورے کر لیں۔ حقوق اللہ سوائے شرک کے معاف ہو جائیں گے لیکن حقوق العباد معاف نہیں ہوں گے۔ پہلے ہم ان حقوق کو پورا کر لیں۔ اس کے بعد واجب اور نفل عبادات کی طرف جائیں تو پھر ہمیں اُس کے فوائد بھی ملیں گے اور پوچھ گچھ سے بھی ہم بچے رہیں گے۔

اکتسابِ فیض

سوال: سورۂ سبا کے فضائل وخصائل بیان فرما دیجیے۔

جواب: سورۂ سبا کے دیگر خصائل تو شاید میں عرض نہ کرسکوں لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ اگر کوئی شخص سورۂ سبا لمبے عرصے تک Regularly پڑھتا رہے تو اُس کی رُوحانی ترقی وعلم کے لیے Foundations تعمیر (Build) ہو جاتی ہیں۔

سورۂ سبا مکی ہے۔ آپ ﷺ کی نبوت کے چوتھے یا پانچویں سال میں سورۂ سبا نازل ہوئی۔ اس کی 54 آیات ہیں۔ آیت نمبر 15 میں ''سبا'' کا لفظ استعمال ہوا اِس لیے اِسے سورۂ سبا کہتے ہیں۔

سورۂ سبا کی اِبتدا رب تعالیٰ کی حمد وثنا سے ہوتی ہے۔ حمد وثنا کے بعد کچھ آیات میں قیامت کے وقوع پذیر ہونے کا بیان ہے کیونکہ اُس وقت کفار قیامت کے برپا ہونے کا اِنکار کرتے اور مذاق اُڑاتے تھے۔

اِس سورہ میں رب تعالیٰ نے اپنے علیم وخبیر ہونے کا بیان کیا کہ زمین وآسمان میں جو چیز بھی نیچے سے اُوپر اور اُوپر سے نیچے جاتی ہے اُس سے رب تعالیٰ بخوبی واقف ہے۔

اِس سورہ کے اثرات یوں مرتب ہوتے ہیں کہ انسان کی رُوح پر جمع شدہ کثافت دُور ہو جاتی ہے۔ ہم میں سے اکثر لوگ اِس جستجو میں رہتے ہیں کہ اُنھیں حروفِ مقطعات یا رُوح سے مطابقت رکھنے والا کوئی لفظ یا حرف پڑھنے کو مل جائے۔ یہ جستجو اور خواہش کرتے وقت ہم بھول جاتے ہیں کہ Foundations تیار کیے بغیر ہم اِن سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا پائیں گے۔ نمازِ عشاء کے بعد سورۂ سبا تواتر اور باقاعدگی سے پڑھی جائے تو تقریباً ڈیڑھ سال کے عرصے میں Foundations تیار ہو جاتی ہیں اور پھر انسان رب تعالیٰ کی طرف ایسا راغب ہوتا ہے کہ بخوشی اُس کی عبادت کرنے لگتا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو یہ سورہ پڑھ لیجیے۔

سوال: مرشد کی ہدایت پر جب مرید کسی بزرگ کے مزار پر Periodically حاضر ہوتے ہیں تو کیا یہ سچ ہے کہ وہ صاحبِ مزار اُس مرید کو Direct فیض دینے کے بجائے اُس کا حصہ اُس کے مرشد کو دے دیتے ہیں؟ یوں مرید کو اُن بزرگ سے فیض اپنے مرشد کے Through ملتا ہے۔

جواب: اصل میں رُوحانی علم وفیض، مرشد وغیرہ جیسی اِصطلاحات کے بارے میں ہم بھی لوگ (معہ میرے) غلط فہمیوں کا شکار ہیں۔ نہ جانے ہم نے رُوحانی فیض اور مرشد کو کیا سمجھ لیا ہے! ہم نے اُنھیں مافوق الفطرت ہستی بنا دیا ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

جب ہم کسی صاحبِ علم کے مزار پر حاضری دیتے اور کلامِ الٰہی کی تلاوت کرتے ہیں اور اُس کے بعد رب کے حضور عرض کرتے ہیں ''یا باری تعالیٰ! میں نے تیرا جو کلام پڑھا اسے تیرے اور تیرے رسول ﷺ کے حضور بطور نذر پیش کرتا ہوں، تُو اِسے قبول فرما لے اور اِس کا ثواب میری طرف سے آپ ﷺ کی رُوحِ مبارک کی خدمت میں بطور نذرانہ پیش کر دے اور اِس کا ثواب تمام پیغمبروں، اولیائے کرام اور دُنیا سے رخصت ہو جانے والے تمام مسلمانوں کی ارواح بالخصوص اپنے اِس نیک بندے جو یہاں آرام فرما ہے کی رُوح کو بخش دے۔'' تو ہماری درخواست پر رب تعالیٰ اِس تلاوت کا ثواب اپنی رحمت کے صدقے اُس صاحبِ مزار کی رُوح کے نامۂ اعمال میں لکھ دیتا ہے۔ یاد رکھیے! مرحوم خواہ جتنے بھی بلند مرتبہ پر فائز ہو دُنیا سے چلے جانے کے بعد اُس کا اعمال کے سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے نامۂ اعمال میں خود ثواب یا گناہ میں اضافہ کرنے پر قادر نہیں رہتا۔ جب کوئی شخص اُس صاحبِ مزار کے نامۂ اعمال میں ثواب لکھواتا ہے تو اُس کی انفارمیشن اُسے دے دی جاتی ہے۔ تب وہ رُوح خوش ہو کر اللہ کے حضور دُعا کرتی ہے ''یا اللہ! جس شخص نے میرے ساتھ یہ نیکی کی تُو بھی اُس کے ساتھ احسان کا سلوک کر۔''

رہ گیا اِکتسابِ فیض کا معاملہ...... تو جب کوئی شخص کسی صاحبِ علم کے ہاتھ پر بیعت ہوتا ہے تو اُس کا نام صاحبِ علم کے Scroll میں اُس کے نام کے نیچے لکھ دیا جاتا ہے۔ قیامت کے روز جب حساب کتاب شروع ہوگا، اُس وقت کے آغاز تک یہ نام وہاں لکھا رہے گا۔ حساب کتاب شروع ہوتے ہی یہ نام اُس Scroll سے مٹا دیا جائے گا۔ اُس وقت آپ کے مرشد آپ کی کوئی سفارش یا مدد نہ کر سکیں گے۔ تب آپ کے مرشد وہ نہیں کر پائیں گے جو آپ سوچتے ہیں۔ صرف آپ ﷺ ہی کی ذاتِ مبارکہ ہے جو اپنی اُمت کی شفاعت کر سکے گی۔ یہ صرف آپ ﷺ ہی کی ذاتِ مبارکہ ہے جو شفاعت کر سکتی ہے۔

آپ کے مرشد کا کام صرف یہ ہے کہ تربیت کے ذریعے آپ کو زندگی کی آلائشوں اور اُلجھے راستوں سے نکال کر اُس Point پر لا کھڑا کریں جو صراطِ مستقیم کی اِبتدا ہے۔ اِس کے بعد اُن کے پاس آپ کے لیے علم کا جو حصہ ہے وہ آپ کے حوالے کر کے کہتے ہیں کہ میرے پاس تمھارا جو حصہ تھا وہ میں نے تمھیں دے دیا۔ اب جتنی محنت کرو گے اِس راستے پر آگے بڑھتے جاؤ گے ورنہ راہ کھوٹی ہو جائے گی۔

یہ مرشد صاحب کا ٹوٹل کام ہے جس کے بارے میں ہم طرح طرح کی خوش فہمیوں میں مبتلا ہیں اور مرشد کو وہ درجہ دے دیتے ہیں جس کی قدرت صرف اور صرف رب تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

نہ مرشد آپ کو مصیبت سے نجات دلانے پر قادر ہیں نہ نقصان کر سکتے ہیں۔ وہ تو خود اللہ کے محتاج بندے ہیں۔ مرشد اگر کچھ کر سکتے ہیں تو وہ راہنمائی اور ٹریننگ ہے۔

That's all, nothing more than this.

باقی آپ کی محنت ہے۔ جو کچھ پڑھنے کو مل گیا اُس میں محنت کرتے رہے تو اعمال نیک ہو جائیں گے اور آپ ترقی کرتے چلے جائیں گے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ مرشد آپ کو کندھوں پر بٹھا کر سرپٹ دوڑتے چلے جائیں۔

اگر کوئی صاحبِ علم آپ کو نوازنا چاہتے ہیں تو وہ اِس بات کے محتاج نہیں کہ پہلے وہ آپ کا حصہ آپ کے مرشد صاحب کو دیں اور مرشد صاحب اُس میں سے اپنی کمیشن کاٹ کر آپ کو وہ حصہ عطا کریں۔

اگر کوئی صاحبِ علم آپ پر مہربان ہو گئے تو آپ پر عنایت کر دیں گے اور آپ کو حصہ مل جائے گا البتہ اُس کی اطلاع آپ کے مرشد کو ضرور مل جائے گی اور مرشد کا دل اتنا بڑا ضرور ہونا چاہیے کہ وہ اِس کو ہضم کر جائیں۔

سوال: کبھی کبھی بہت شدت سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ دُنیا کھیل تماشا ہے اور ہم پتلیاں...... یا یہ دُنیا ایک بساط ہے اور ہم اِس پر سجے ہوئے مہرے جن کی Placement تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ پتلی اور مہرہ ہونے کا احساس اندر ہی اندر عجب خالی پن اور بے بسی کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ ایسا سمجھنا گستاخی تو نہیں؟

جواب: جب انسان کا Mind اس بات پر Clear ہوتا ہے کہ آقا کون، مالک کون...... قادرِ مطلق کون......! میری حیثیت کیا ہے......! تو پھر Confusions نہیں آتے۔ لیکن جب ہم اپنے Mind میں Clear نہیں ہوتے تو پھر ایسے Confusions آتے ہیں۔ ہم وہ ہیں جنھوں نے اپنی ذات کے بارے میں بہت سے بت گھڑ لیے ہیں۔ ہم انھیں نہ صرف اپنی ذات کے اندر پالتے رہتے ہیں بلکہ اُن کی پوجا کرتے رہتے ہیں۔ کہیں انا، کہیں علم، کہیں عزت دار ہونے کا بت بنا کر ہم اُس کی پوجا کرتے ہیں۔ کہیں ہم نے عاجزی کے تکبر کی پوجا کی ہے۔ اور یہ تکبر سب سے بڑا ہے۔ جن بتوں کو ہم اپنے اندر گھڑ کر پالتے اور اُن کی پوجا کرتے ہیں یہ ہمیں چیزوں کی اصل تہ تک نہیں جانے دیتے۔ یہ جو ''میں'' کا بت ہے یہ انسان کو احساس دلاتا ہے کہ میں کیا ہوں......؟ ایک شطرنج کا مہرہ! جسے جب رب چاہے آگے کر دے، جب چاہے پٹوا دے۔ اِس احساس سے ''میں'' کا بت لرزتا ہے اور انسان کو لگتا ہے جیسے وہ اندر سے خالی ہو گیا۔

اگر ذہن میں یہ بات Clear ہو کہ میرا خالق ہی میرا مالک بلکہ مالکِ کل اور قادرِ مطلق ہے۔ اُس کے سامنے میری بساط تو ایک مہرے کی بھی نہیں۔ وہ صرف مجھے ہی نہیں پوری کائنات کو پالتا ہے۔ میرا رول محدود ہے۔ ایک Limited sphere کے اندر مجھے کام کرنا ہے۔ جس مقصد کے لیے مجھے پیدا کیا گیا ہے مجھے وہ مقصد پورا کرنا ہے۔ میری تکمیل اُس کے ہاتھ میں ہے جو قادرِ مطلق ہے۔ وہ جہاں چاہے گا مجھے استعمال کرے گا۔ جہاں چاہے گا مجھے ڈھیل دیے رکھے گا۔ جب یہ سارے Concepts (تصورات) Clear ہو جاتے ہیں تو اِس کے بعد جب ہم دیکھتے ہیں کہ کوشش کے باوجود ہمارے کام نہیں ہو رہے، ہم مشرق کی طرف Move کرتے ہیں اور سفر مغرب کی طرف طے ہوتا ہے تو پھر ہم جان لیتے ہیں کہ ہمارا مالک یہی چاہتا ہے۔ کیونکہ جب تک ہمارے دماغ میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ میں کچھ نہیں۔ رب ہی سب ہے۔ یہ اُس کی عنایت ہے کہ وہ مجھے ڈھیل دیتا ہے اور کچھ اختیارات بخش دیتا ہے لیکن یہ ڈھیل، اختیارات اور ناز کا اُٹھایا جانا سب اُس کی عطا ہے جسے وہ جب چاہے Withdraw کر سکتا ہے۔ یہ سب میرا استحقاق نہیں ہے۔ یہ ساری باتیں جب انسان کے ذہن میں Clear ہو جائیں تو پھر اُس کے اندر خالی ہونے اور بے بسی کا احساس پیدا نہیں ہوتا۔ جب بھی ذہن میں بے بسی کا خیال آئے یا خلا کا احساس ہو تو اُس خلا کو پُر کرنے کے لیے اپنے آپ

سے کہیں کہ میں کون ہوں؟ میری حیثیت ہی کیا ہے! اے میرے رب! سب تُو ہی تُو ہے۔ تُو جو چاہتا ہے کرتا ہے جیسے چاہتا ہے مجھے استعمال کرتا ہے۔ میں تیرا بندہ، تیری تخلیق ہوں۔ اتنی سی بات سے بے بسی کا احساس اور خلا پُر ہو جائے گا۔ بس ''میں'' کا بت اپنے اندر سے نکال دیجیے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ بت مشکل ہی سے نکلتے ہیں۔

سوال: گھر میں اگر ماں، بہن، بیوی یا بیٹی نماز نہ پڑھے تو اُن پر کس حد تک سختی کی جائے کہ وہ نماز باقاعدگی سے ادا کرنے لگیں۔

جواب: صاحب! نہ کسی نے مجھ پر سختی کی نہ میں نے کسی کو سختی کرتے دیکھا۔ میں نے تو سختی سے دوسروں کو دُور بھاگتے دیکھا ہے قریب آتے نہیں۔ اگر کوئی شخص نماز پڑھتا ہے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ اُسے دیکھ کر دوسرے لوگ نماز نہ پڑھیں کیونکہ جب نماز کے انعامات ملتے ہیں تو پھر ہر ایک کا دل چاہتا ہے کہ میں بھی یہ انعامات حاصل کروں۔ سختی سے انسان میں ضد پیدا ہوتی ہے اس لیے اولیائے کرام کبھی کسی کو نصیحت یا تلقین نہیں کرتے تھے لیکن اِس کے باوجود اُن کے پاس آنے والے خود بخود عبادت گزار ہو جاتے تھے۔

بھائی! سختی اور ڈنڈے کو کسی الماری میں رکھ کر تالا لگا لیجیے۔ سنت پر عمل کیجیے اور لوگوں کو پیار محبت سے اللہ کی راہ کی طرف لائیے۔ اگر انسان باعمل ہے تو اُس کی زبان میں تاثیر ہو گی اور اُس کی زبان سے ادا ہونے والی ہر بات دل میں اُترتی چلی جائے گی اس لیے سختی سے دُور رہیے۔

سوال: آپ اکثر کہتے ہیں فقیر سے علم حاصل کرو۔ یہ علم لدنی ہے، وظائف کا عمل یا دانائی کی باتوں کا علم؟

جواب: ایک زمانے میں اُردو کا محاورہ پڑھا تھا...... موئی ڈرا موت سے موت سامنے کھڑی۔ میں وظائف اور عملیات کی بات سے جس قدر دُور بھاگتا ہوں اُسی قدر یہ سامنے کھڑی دکھائی دیتی ہے۔

فقیر سے آپ کو علم لدنی ملے گا۔ علم لدنی تمام دیگر علوم کا احاطہ کرتا ہے۔ جس شخص کو علم لدنی حاصل ہو گیا اُسے تمام علوم از خود عطا ہو جاتے ہیں۔ اولیا، اہلِ فقر یا صاحبانِ علم کے پاس علم لدنی ہی ہوتا ہے بس ڈگری کا فرق ہے۔

جب ہم فقیر سے ملتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح اُس سے علم بٹور اور ٹھگ لیں تو وہ علم لدنی ہی ہوتا ہے۔ جب علم لدنی کا حصہ ہمیں ملتا ہے تو ہمارے اندر عجیب و غریب تبدیلیاں آنے لگتی ہیں۔

اکثر صاحبان سوال کرتے ہیں کہ علم ملے گا تو کیا ہو گا؟ ہم تو پچھلے 45 سال سے وہیں کے وہیں بیٹھے ہیں۔ اُن کا مطلب ہوتا ہے کہ ابھی تک یہ نہیں ہوا کہ میں نے کسی شخص پر غصہ کیا ہو اور وہ بھسم بن گیا ہو۔

بھائیو! علم لدنی سے کوئی ایسی تبدیلی نہیں آتی۔ علم لدنی سے تو انسان میں عاجزی پیدا ہوتی ہے۔ کسی صاحب نے پوچھا کہ یہ عاجزی کیا ہوتی ہے؟ میں نے جواب دیا کہ انسان کسی کے سر کا Hat بننے سے پہلے اپنے آپ کو وہ Footmat بنا لے جس پر پاؤں صاف کر کے لوگ کمرے میں داخل ہوتے ہیں تاکہ کارپٹ خراب نہ ہو۔ جب کوئی انسان Footmat بن جاتا ہے تو رب تعالیٰ اُسے لوگوں کے سر کا Hat بنا دیتا ہے۔ وہ

صاحب کہنے لگے" آپ وضاحت کیجیے کہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔" میں نے کہا" فرض کریں کسی نے آپ کو گالی دی تو آپ خندہ پیشانی سے برداشت کر گئے۔ کسی نے جاتے جاتے جوتا مار دیا۔ آپ نے ایک لمحے کو اُس کی طرف استفہامیہ انداز میں دیکھا کہ یہ کیا؟" اُس نے کہا میرا دل چاہ رہا تھا کسی کو جوتا مارنے کو۔" یہ سن کر آپ بولے Thank you very much...... آیندہ بھی جب دل چاہے، جوتا مار لیجیے گا۔" یہ وضاحت سن کر اُن صاحب نے بڑی خوب صورت بات کہی جو مجھے بہت پسند آئی کہ" شاہ صاحب! آپ کی سب باتیں بجا لیکن میں بزدل نہیں کہلانا چاہتا۔"

علم لدنی ملنے سے انسان میں عاجزی پیدا ہوتی ہے اور دُنیا کی محبت دل سے نکل جاتی ہے۔ پہلے اُسے دوسروں پر خرچ کرنا مشکل لگتا تھا۔ علم حاصل ہونے کے بعد دوسروں بالخصوص اپنے مخالفین پر بھی بے دریغ خرچ کرنے لگتا ہے۔ پہلے چھوٹے چھوٹے مسائل اُسے پریشان کر رہے ہوتے تھے۔ علم حاصل ہونے کے بعد بڑے بڑے مسائل بھی وہ ہنس کر ٹال دیتا ہے۔ پہلے وہ چھوٹی سی مصیبت پر ہائے ہائے کرنے لگ جاتا تھا اب بڑی مصیبت پر بھی مسکراتا پھرتا ہے۔ پہلے ذرا سی Problem کے حل کے لیے لوگوں سے مشورہ کرتا پھرتا تھا۔ علم ملنے کے بعد بڑے سے بڑے مسئلے سے واسطہ پڑنے کے بعد اگلے ہی لمحے اُس کے ذہن میں حل آ جاتا ہے۔

علم لدنی سے انسان کو فہم و فراست عطا ہوتی ہے۔ فہم و فراست مومن کا طرۂ امتیاز ہے اِسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا" مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور کی مدد سے دیکھتا ہے۔" علم لدنی ملنے کے بعد انسان کو رب تعالیٰ کی بینائی حاصل ہو جاتی ہے۔

مجھے زندگی میں بہت سے مستند اولیائے کرام سے ملنے کا اتفاق ہوا (یہ اور بات کہ میں کسی سے استفادہ نہ کر سکا کیونکہ میری علم حاصل کرنے کی نیت ہی نہ تھی۔) میں نے کبھی کسی ولی اللہ کو اپنی جسمانی ساخت میں اپنے آپ سے علیحدہ نہیں پایا۔ بظاہر وہ میری ہی طرح کے انسان تھے۔ بظاہر میری ہی طرح زندگی گزارتے تھے لیکن جب اُن کے سامنے کوئی مسئلہ رکھا جاتا تو ایک لمحے میں جو حل وہ بتاتے اُس سے اُن کی اُس فہم و فراست کا پتا چلتا تھا جو علم لدنی کے نتیجے میں اُنھیں حاصل ہوئی تھی۔

کتب میں اولیائے کرام کے بارے میں واقعات پڑھ کر ہم غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں اور اُنھیں کرامات کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں حالانکہ اولیائے کرام، کرامات سے دُور بھاگتے ہیں کیونکہ یہ اُن کی راہ کھوٹی کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

فقیر کو دُعا کرنے کی مشین نہ سمجھیے بلکہ یاد رکھیے! فقیر سے دُعا کرانے کے بھی ڈھنگ ہیں (آداب نہیں کہہ رہا)۔ سمجھ دار لوگ فقیر کو کمال انداز میں ٹھگتے ہیں۔ وہ فقیر کے پاس جاتے ہیں لیکن مجال ہے کہ کبھی اپنا مسئلہ بیان کریں۔ فقیر پوچھے بھی تو کہتے ہیں بس جی آپ کو دیکھنا اور سلام کرنا تھا۔ اب اجازت دیجیے۔

ہم اپنی طرف دیکھیں تو ہمیں وہ آدمی پسند آئے گا جو ایک لمحہ ضرورت سے زائد ہمارے پاس نہ بیٹھے، جو

ہمیشہ مسائل لے کر ہمارے پاس نہ آئے بلکہ جب بھی ہم سے ملے ہنسا کر چلا جائے۔ اس لیے کہ مسائل تو ہمارے بھی بہت ہیں۔ مسائل لے کر آنے والا ہمیں اور بھی غمگین کر گیا۔ اس لیے ایسا شخص ہمیں نہیں بھائے گا۔ فقیر کو بھی وہی شخص اچھا لگے گا جو آیا اور ہنسا کر چلا گیا۔

میں ایک بار جناب حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے مزار پر حاضری کے لیے ترکی گیا۔ وہاں جانے سے ڈھائی ماہ قبل ہی میں نے ایک A4 سائز کا پیپر لے کر دُعائیں لکھنا شروع کر دیں حتیٰ کہ ڈھائی سو دُعائیں لکھ ڈالیں۔ جب وہاں گیا تو جا کر سلام عرض کیا، فاتحہ پڑھی۔ اس دوران اُن سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے عرض کیا "جناب! میں پاکستان سے حاضر ہوا ہوں۔ یہ ایک آدھ دُعا تو میرے لیے کر دیجیے۔" اُنھوں نے خوش دلی سے فرمایا" ہاں کہو۔" میں نے عرض کیا" ڈیڑھ سو شلوار قمیص سفید رنگ کی مل جائے۔" اُنھوں نے کہا" اچھا دُعا کر دیتا ہوں۔" اِس کے بعد میں نے اگلی فرمائش کی اور دُعا کے لیے عرض کر دی۔ اُنھوں نے کہا" اچھا۔" حتیٰ کہ میں ایک ایک کر کے 250 ویں نمبر کی دُعا پر جب پہنچا تو اُنھوں نے اینٹ دے ماری" تم نے مجھے کمپیوٹر سمجھ رکھا ہے کہ کمپیوٹر کا بٹن دبایا اور جواب آ گیا!"

بات کرنے کا مقصد یہ ہے کہ فقیر لوگ بار بار کی فرمائشوں سے چڑ جاتے ہیں۔ کسی زمانے میں جب میں ترکی جاتا تو حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے پاس حاضری نہ دیتا۔ ایک بار ایک صاحب ترکی جا رہے تھے۔ اُنھوں نے مجھ سے پوچھا" کہاں کہاں جاؤں۔" میں نے اُنھیں مختلف جگہیں Suggest کر دیں۔ اُنھوں نے حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا نام لیا تو میں نے کہا" چھوڑو وہاں کیا جانا۔" اس واقعے کے دو ماہ بعد سرکاری کانفرنس کے لیے ترکی گیا تو کانفرنس ختم ہونے کے اگلے دو دن کی پیشگی چھٹی لے لی تاکہ TA/DA claim کر کے اپنی تنخواہ میں حرام شامل نہ کروں۔ کانفرنس ختم ہونے کے بعد سرکاری ڈیوٹی تو ختم ہو گئی اس کے بعد اگرچہ سرکاری خرچ پر وہاں رہنے کی Provision تو موجود تھی لیکن میں اس طرح نہیں رہتا۔ ذاتی خرچے پر استنبول کے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں آ گیا۔ صبح ناشتے کے لیے ہدایات دے رہا تھا کہ پیچھے کندھے سے آواز آئی۔" السلام علیکم! (یہ وہی صاحب تھے جنھیں میں نے حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے مزار پر جانے سے روکا تھا۔) ارے آپ یہاں؟" میں نے کہا کہ کانفرنس کے سلسلے میں آیا تھا اب یہاں ذاتی Stay ہے۔ کہنے لگے" آج جمعہ کہاں پڑھنے کا ارادہ ہے!" میں نے کہا" ابھی کاؤنٹر سے پوچھ لیتے ہیں کہ مسجد کہاں ہے؟" کاؤنٹر پر بیٹھی خاتون انگریزی کی اُتنی ہی ماہر تھی جتنا میں ترکی زبان کا۔ بڑی مشکل سے بس اتنی سمجھ آئی کہ وہ ایوب ایوب کہہ رہی ہے۔ اِتنے میں ایک صاحب آئے اور اُنھوں نے اُن خاتون سے Turkish میں دریافت کر کے ہمیں انگریزی میں بتایا کہ حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی مسجد میں 12 بجے جمعہ شروع ہو گا۔ (وہ لوگ حضرت ابو ایوب انصاریؓ کو صرف ایوب کہتے ہیں۔) گھڑی دیکھی تو بہت کم وقت رہ گیا تھا۔ ہم گاڑی میں بیٹھے اور سیدھے مسجد پہنچے۔ چونکہ اب میں وہاں چلا ہی گیا تھا تو آداب اور Etiquette تو Observe کرنے ہی تھے۔ اِس لیے سب سے پہلے حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

سلام کیا اور فاتحہ پڑھی۔ فاتحہ کے دوران اُنھوں نے جو مہربانی کا سلوک میرے ساتھ کیا وہ اِتنا کمال تھا کہ میں پانی پانی ہوگیا۔ پھر خیال آیا کہ اگر یہ اِتنے عظیم نہ ہوتے تو میزبان رسول ﷺ کیوں ہوتے! وہ جو میں نہ خود حاضر ہوتا تھا نہ اُن صاحب کو آنے دیا تھا۔ میرے اس رویے کے باوجود حضرت ابوایوب انصاریؓ نے میرے ساتھ اِنتہائی اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کیا اور ثابت کر دیا کہ ''تم میں اور مجھ میں بس اِتنا ہی فرق ہے کہ تم نہ خود میرے پاس آتے تھے نہ دوسروں کو آنے دیتے تھے۔ اب جو آئے ہو تو دیکھ لو کہ میں تمھارے ساتھ کیا سلوک کر رہا ہوں۔'' جب میں نے اُن سے اجازت مانگی کہ جمعہ کی نماز پڑھنی ہے۔ تو انھوں نے فرمایا کہ ایک منٹ ٹھہر جاؤ۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ نہ جانے اب میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے کہ اِتنے میں ایک انتہائی بوڑھا شخص آیا جس نے ساڑھے چھ سات کلو چابیاں اُٹھائی ہوئی تھیں۔ اُس نے میرے کندھے پر Tap کر کے کہا کہ میرے ساتھ آؤ۔ تب میں نے Link کرلیا کہ ایک منٹ رُکنے کو کیوں کہا گیا تھا۔ وہ مجھے لے کر ایک دیوار کے پاس جا رُکا۔ دیوار میں موجود سوراخ میں چابی لگائی تو پتا چلا کہ بظاہر دیوار دکھائی دینے والا وہ حصہ دراصل طاقچہ ہے جس کو اِس طرح Paint کیا گیا ہے کہ وہ دیوار کا حصہ لگتا ہے۔ اُس بوڑھے شخص نے لائٹ آن کی تو اُس طاقچے میں آپ ﷺ کے پائے مبارک کا Impression تھا جس پر سونے کا خول چڑھا ہوا تھا۔ اللہ کی مجھ پر یہ بھی عنایت ہے کہ آپ ﷺ سے متعلق کوئی چیز دیکھ کر ایک سیکنڈ میں مجھے پتا چل جاتا ہے کہ یہ اصلی ہے یا نہیں۔ اُس نے طاقچہ کھولا تو مجھے پتا چل گیا کہ یہ آپ ﷺ ہی کے پائے مبارک کا Impression ہے۔ میں وہاں فاتحہ پڑھ کر جب واپس آنے لگا تو اُس شخص نے مجھے گردن سے پکڑا اور میرا سر اُس طاقچے میں کر کے کہا ''اسے Kiss کرو۔''

میں نے کہا ''اچھا Thank you very much جناب۔''

حضرت ابوایوب انصاریؓ واقعی اِس قابل تھے کہ میزبانِ رسول ﷺ ہوتے۔ اگر فقیروں سے کچھ مانگا نہ جائے تو وہ حضرت ابوایوب انصاریؓ کی طرح مہربانیاں کرتے ہیں۔

مرشد، مرید اور راہِ سلوک

سوال: آیاتِ سجدہ میں سجدہ کا بیک گراؤنڈ کیا ہے؟

جواب: قرآن پاک دراصل احکامات کا مجموعہ ہے۔ زیادہ پڑھے لکھے لوگوں کے الفاظ میں بات کریں تو قرآن مسلمانوں کے لیے Constitution ہے...... ایک انسان کو زندگی کیسے گزارنی ہے، اُس کے ذمہ کون سے حقوق ہیں، دوسروں کے ذمہ اُس کے کون سے حقوق ہیں، اُس کی Self-respect کیا ہے اور دوسروں کی Self-respect جس کا اُس نے احترام کرنا ہے وہ کہاں سے شروع ہو جاتی ہے۔ قرآن پاک اِن سب کا احاطہ کرتا ہے۔

قرآن پاک مسلمانوں کا ایسا آئین ہے جس کے مطابق اُنھیں زندگی گزارنی ہے۔ قرآن پاک میں جہاں سجدہ کا لفظ آیا ہے اُسے ہم سجدہ کا حکم تصور کرتے ہیں اور حکم کی تعمیل میں فوراً سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ علما اِس حوالے سے کچھ چھوٹ دیتے ہیں کہ اگر آپ فی الفور سجدہ نہیں کرتے تو تلاوت ختم کرنے کے بعد کرلیں۔ لیکن میرے ذاتی خیال میں حکم کی فوری تعمیل ہونی چاہیے اور سجدہ کا لفظ پڑھتے ہی ہمیں فوراً سجدہ ریز ہونا چاہیے۔

سوال: کشف کا حصول کیسے ممکن ہے؟

جواب: علم کا ملنا...... اور علم کے ساتھ ساتھ کچھ اور عنایات کا عطا ہونا...... یہ سب بہت Organised طریقے پر ہوتا ہے اور بہت Systematic ہے۔ ایسا نہیں کہ مجھ جیسا گناہ گار، دُنیا میں کلیتہً ڈوبا ہوا شخص سو کر اُٹھے تو صاحبِ کشف بن چکا ہو...... اِس کے پیچھے تو بڑا لمبا سفر ہوتا ہے جو آدمی طے کر کے آ رہا ہوتا ہے۔ چاہے اُس کے علم میں ہو یا نہ ہو...... چاہے وہ effort Deliberate ہو یا Unconscious effort ہو...... اِس سفر میں جب آدمی رب کی عبادت کرتا ہے تو اُس کے ذہن میں نہ جہنم کا ڈر ہوتا ہے نہ جنت کا لالچ، نہ اچھا بننے کا شوق نہ بُرا شمار کیے جانے کا خوف۔ وہ تو صرف یہ سوچ کر رب کی عبادت کرتا ہے کہ چوں کہ میرا رب لائق عبادت ہے اِس لیے میں اُس کی عبادت کروں۔ اس کے ساتھ اگر اللہ توفیق بخش دے اور انسان کے دل میں جذبۂ احسان مندی پیدا ہو جائے تو وہ سوچتا ہے کہ میرا رب مجھ پر بے پناہ

عنایات کرتا ہے۔ وہ چیزیں بھی عطا کرتا ہے جو میرے علم میں نہیں ہوتیں اِسی لیے میں شکر گزاری کے طور پر اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہو جاؤں۔

جب اللہ تعالیٰ کی توفیق سے انسان اِس طرح اللہ کی عبادت کرتا ہے اور یہ بھی سوچتا ہے کہ میرا رب مجھ پر اِنتہائی مہربان ہے، میرا سب سے بڑھ کر محسن ہے، اس لیے جتنی بھی رب کی مخلوق ہے انسان، جمادات نباتات، حیوانات...... اُن کے ساتھ مہربانی کا سلوک کرنا چاہیے۔ پھر انسان سب پر مہربان ہو جاتا ہے۔ وہ اس جذبے کے ساتھ عبادت جاری رکھتا ہے کہ میرا رب اِتنا عظیم اور مہربان ہے کہ اُس کا شکر ادا کیا جانا چاہیے اور شکر گزاری کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اُس کے حضور سجدہ ریز ہوا جائے۔

زندگی میں اونچ نیچ آتی رہتی ہے۔ ایسے مواقع بہت Frequently آتے ہیں جہاں وہ React کر سکتا ہے لیکن React کرتا نہیں کہ یہ میرے رب کی مخلوق ہے۔ مہربان رب کے حضور اِظہارِ تشکر کے طور پر مجھے رب کی مخلوق پر مہربانی کرنی ہے۔ تب انسان اپنے ساتھ ہونے والی غلطیوں کو نہ صرف ہنس کر معاف کر دیتا ہے بلکہ ایسے ظرف کا مظاہرہ کرتا ہے کہ کسی کو غلطی پر شرمندہ نہیں ہونے دیتا حتیٰ کہ غلطی کرنے والا یہ سمجھتا ہے کہ اُس سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہی نہ تھی۔ تب انسان دوسروں کے کام اِس خوب صورتی سے آتا ہے کہ خدمت لینے والا سمجھتا ہے کہ خدمت قبول کر کے میں نے اِس شخص پر احسان کیا۔

وہ دوسروں کے حقوق اِتنی خوب صورتی سے ادا کرتا ہے کہ کسی کو یہ احساس تک نہیں ہونے دیتا کہ اُن کے ذمہ بھی اُس کے حقوق ہیں۔ وہ گلے شکووں سے زبان بند کر لیتا ہے کہ آپ ﷺ کی سنت ہے۔ وہ اپنے حقوق Demand نہیں کرتا لیکن دوسروں کے حقوق بلا مطالبہ ادا کر دیتا ہے۔

یہ لمبا سفر ایک طویل مدت میں وہ طے کرتا ہے۔ اِس سفر میں وہ Shocks کو Absorb کر لیتا ہے اور Shake نہیں کرتا...... نہ ہی React کرتا ہے حتیٰ کہ یہ رویہ پہلے اُس کی Habit اور پھر Second nature بن جاتا ہے۔ پھر وہ بغیر کسی Conscious effort کے اِسی طرح Behave کرتا چلا جاتا ہے۔

بے لوث اور بے غرض عبادات کے نتیجے میں انسان کے اندر رب تعالیٰ کے اَن گنت احسانات کے تلے دبے ہونے کا احساس پختہ ہو جاتا ہے۔ وہ رب کے بندوں کے ساتھ یہ سوچ کر بھی بہتر اور احسان کا سلوک کرتا اور اُن کی زیادتیاں معاف کر دیتا ہے کہ یہ اُسی رب کے بندے ہیں جس کا میں بندہ ہوں۔ پھر وہ وقت آتا ہے کہ رب تعالیٰ انسان میں وسیع ظرف پیدا کر دیتا ہے، اُسے صاحب کشف کر دیتا ہے۔ یوں وہ دوسروں کے احوال کشف میں دیکھنے لگتا ہے۔ کشف میں رب تعالیٰ اُسے یہ اطلاع بھی دیتا ہے کہ یہ شخص جو اِس وقت تمھارے گھٹنوں کو ہاتھ لگا رہا ہے یہ درحقیقت باہر کھڑا تمھیں گالیاں دے رہا تھا اور جو شخص آ کر یہ بتا رہا ہے کہ میں تہجد پڑھ کر آ رہا ہوں وہ دراصل گانے سن کر تمھارے پاس آیا ہے۔ صاحب کشف کو رب تعالیٰ حقیقت دکھا دیتا ہے لیکن اِس کے باوجود وہ اپنے پاس آنے والوں پر کبھی اِس کو عیاں نہیں کرتا کیوں کہ کشف اس لیے نہیں کہ صاحب کشف دوسروں کے راز دیکھ کر اپنی رائے بدل لے۔ مثلاً صاحب کشف کسی کو نیک سمجھتے تھے لیکن

کشف میں پتا چلا کہ وہ تو چوری کرتے ہیں۔ یہ سب جان لینے کے باوجود بھی صاحب کشف کی رائے اُس شخص کے بارے میں متاثر نہیں ہوتی کیوں کہ اگر ایسی معلومات اُس کی رائے پر اثر انداز ہوگئیں تو وہ صاحب کشف نہیں رہے گا۔ کشف ملتا ہی اُس وقت ہے جب انسان اِتنے بڑے ظرف کا مالک ہو جائے کہ سب دیکھنے کے باوجود اُسے اپنی رائے پر اثر انداز نہ ہونے دے۔

ہم لوگ حروفِ مقطعات اور کشف و کرامات کے بارے میں غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں اور اُن سے نکل نہیں پا رہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ شاید کوئی وظیفہ پڑھنے سے ہم صاحب کشف و کرامت اور ولی اللہ بن سکتے ہیں...... ایسا قطعاً نہیں۔ ہم نہ جانے یہ کیوں سوچتے ہیں کہ ولی اللہ ہونے کے بعد کوئی شخص مافوق الفطرت ہستی ہو جائے گا...... ایسا نہیں ہے۔ وہ پہلے جیسا ہی رہے گا۔ ولی اللہ اپنی ذمہ داریاں اُسی طرح نبھائے گا کیوں کہ اگر وہ اُن میں کوتاہی کرے گا تو اُس کے لیے جواب دہ ہے۔ ولی اللہ اپنے فرائض کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ لوگوں کے ساتھ Light way میں بات بھی کرتا ہے، مزدوری بھی کرتا ہے، اُسے بھی گرمی، سردی لگتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اُس میں ضبط اور برداشت اِتنا بڑھ جاتا ہے کہ وہ موسموں کی شدت یا حالات کی تنگی کی شکایت نہیں کرتا کیوں کہ اُسے اچھی طرح معلوم ہے کہ موسموں کا تغیر و تبدل اور درجۂ حرارت اِتنا Severe ہونا میرے مالک کی طرف سے ہے۔ وہ عظیم ہے اور میں اُس کا حقیر سا بندہ۔ مجھے کوئی حق نہیں کہ اُس کی طرف سے آنے والے کسی تغیر پر اُنگلی اُٹھا سکوں۔ جو انسان یہ بات سمجھ جاتا ہے وہ ہر مصیبت کو ہنس کر جھیل جاتا ہے۔ وہ چہرے پر ناگواری کا تاثر تک نہیں آنے دیتا صرف اس لیے کہ یہ مصیبت میرے رب کی طرف سے آئی ہے۔ جب اچھا وقت تھا تب تو میں نے کسی سے نہیں کہا کہ یہ اچھا وقت مجھ پر کیوں آیا ہے...... اب یہ جو چار دن کی تنگی آگئی ہے تو پھر میں کیوں ہائے ہائے کرتا پھروں۔

ولی اللہ ایک عام آدمی کی طرح سب کچھ محسوس کرتا ہے لیکن رب کے بارے میں اُس کا تصور اور رب کے ساتھ اُس کا تعلق بہت خوب صورت ہوتا ہے کہ رب کے مجھ پر بے پناہ احسانات ہیں۔ ایک وہی تو ہے جس نے ہمیشہ مجھے اچھے حال میں رکھا، تن درستی کی نعمت سے نوازے رکھا...... اب اگر چند دنوں کی تنگی یا بیماری آگئی ہے تو پھر کیوں واویلا کرتا پھروں۔ احسان مندی کا تقاضا یہی ہے کہ مشکل وقت کو خندہ پیشانی سے گزار لوں۔

ولی اللہ دیکھنے میں مجھ جیسا گناہ گار اور سیاہ کار نظر آئے گا۔ وہ دوستوں سے ایسے ہی ملے گا جیسے مجھ جیسا گناہ گار شخص ملتا ہے۔ وہ اِسی طرح لوگوں میں بیٹھ کر بات کرے گا...... اُن کی سنے گا، اپنی سنائے گا۔

ہم نے ولی اللہ کا ایک یہ تصور بھی قائم کر لیا کہ کوئی اُس کے برابر نہیں بیٹھ سکتا۔ وہ مسند پر بیٹھتا ہے اور اُس سے ملاقات کے خواہش مند زمین پر...... یہ طریقہ خلافِ سنت ہے۔ آپ ﷺ کبھی محفل میں نمایاں ہو کر نہیں بیٹھے، کبھی سڑک پر نمایاں ہو کر نہیں چلے۔ آپ ﷺ نے جب کبھی سفر میں پڑاؤ کیا تو ساتھیوں کے ساتھ برابر کام کیا۔ کبھی مخدوم بن کر مسند پر نہیں بیٹھے۔ ولی اللہ اِسی سنت کی پیروی کرتا ہے۔

ولی اللہ مقامِ تقویٰ پر فائز ہوتا ہے۔ اُس تقویٰ کے نتیجے میں عطا ہونے والے علم اور فہم و فراست کی وجہ

سے وہ ہم سے مختلف ہوگا۔ یہ چیزیں اُس وقت تک حاصل نہیں ہوتیں جب تک بنیادیں مضبوط نہ ہوں۔ میں لاکھ حروفِ مقطعات پڑھتا رہوں اگر میری بنیادیں ہی نہیں بن پائیں تو مجھے یہ پڑھائی کوئی فائدہ نہیں دے پائے گی۔ اُس عمارت کی پچاسویں منزل کیسے بنے گی جس کی بنیادیں ہی تعمیر نہ کی گئی ہوں۔

حروفِ مقطعات کے فوائد اُسی وقت ملتے ہیں جب انسان عبادات کی تمام اغراض چھوڑ دیتا ہے حتیٰ کہ جنت کا لالچ اور جہنم کا خوف بھی ترک کر دیتا ہے۔ وہ اپنے رب کو لائقِ عبادت سمجھنے لگتا ہے اور اظہارِ تشکر کے لیے رب کے حضور گڑگڑاتا ہے۔ دوسروں کے ساتھ اُس کا سلوک ایسا ہو جاتا ہے کہ میرا کسی پر کوئی حق نہیں لیکن سب کے حقوق مجھ پر ہیں جو مجھے ادا کرنے ہیں۔ مجھے کسی سے کچھ نہیں لینا۔ مجھے تو بس اپنے رب سے لینا ہے۔ جب انسان یہ بھول جائے کہ دوسروں کے ذمہ میرا کوئی حق بھی ہے تب اُس پر عنایات برستی ہیں۔ اُن عنایات کی کوئی حد ہے نہ حساب۔ کشف و کرامات کا حصول تو بہت معمولی سی بات ہے۔

سوال: کیسے پتا چلے کہ مرید کو مرشد کی توجہ حاصل ہو رہی ہے یا نہیں؟ اُس کو Monitor کیا جا رہا ہے یا نہیں؟

جواب: میں ان چیزوں سے بہت دُور رہتا ہوں۔ میرے علم میں نہیں کہ مرشد ہوتا کیا ہے اور مرشد کی توجہ کیا رنگ دکھائے گی۔ میں تو بس اِس پر یقین رکھتا ہوں کہ مالی کا کام پانی دینا ہے اور مالک کا کام پھل پھول لگاتا ہے۔

اگر میں کسی کو مرشد مان لوں تو میں اُنھیں اِس لیے مرشد نہیں مانوں گا کہ مجھے اُن سے کیا ملے گا اور میرے اندر کیا تبدیلیاں واقع ہوں گی۔ میں تو اِس لیے اُنھیں مرشد مانوں گا کہ میرا دل بغیر کسی کی Canvassing کے یہ کہتا ہے کہ یہ انسان تقویٰ کے بلند مقام پر ہے۔ اللہ نے اپنی عنایات سے اِسے علم عطا فرمایا ہے۔ اگر میں اِس صاحبِ تقویٰ کے پاس بیٹھا رہا...... اس نے کچھ نہ بھی کیا اور اِس سے کچھ اور نہ بھی ملا تو کم از کم یہ تو ہوگا کہ میں اپنے جواری ساتھیوں میں بیٹھ کر جوا کھیلنے، Gossip کرنے اور دوسروں کا مذاق اُڑانے کی بری عادات سے بچ گیا۔ مجھے یہ یقین ہے کہ اگر Magnet کے پاس ناکارہ لوہے کا ٹکڑا کچھ عرصہ پڑا رہے تو وہ از خود Magnet میں بدل جاتا ہے۔

بزرگ کہتے ہیں کہ اگر گھر سے بھوکے جاؤ گے تو آگے بھی کھانا نہیں ملے گا۔ بھرے پیٹ کے ساتھ جاؤ گے تو ہر جگہ کھانا Serve ہو جائے گا۔ جب انسان بھوک کے ساتھ مرشد کے پاس جاتا ہے تو کچھ حاصل نہیں کر پاتا لیکن جب یہ سوچ کر گیا کہ یہ صاحبِ علم و تقویٰ و نظر ہے، اِس لائق ہے کہ اِس کی عزت کی جائے، اِس کے پاس بیٹھا جائے تب علم حاصل ہو جاتا ہے۔

اگر آپ کو مرشد ملا ہے تو یہ مت دیکھیے کہ آپ کو وہاں سے کیا مل رہا ہے، کتنا مل رہا ہے، کب مل رہا ہے۔ اُن کے پاس صرف یہ سوچ کر جائیے کہ ہم لوہے کا ایک ناکارہ ٹکڑا ہیں اور یہ صاحب بہت بڑے Magnet ہیں۔ اگر ان کے قریب پڑے رہے تو کسی روز خود بھی Magnet ہو جائیں گے۔ یاد رکھیں! Magnet جان بوجھ کر لوہے کو Magnet نہیں بناتا، صرف اُس کے پاس پڑا رہنے سے لوہا Magnet بن جاتا ہے۔

سوال: آپ کے پاس بہت سے لوگ دُعا کے لیے آتے ہیں...... کچھ باقاعدگی سے اور کچھ کبھی کبھار...... کیا اُن سب کا آپ کے ساتھ مرید اور مرشد کا تعلق ہے؟

جواب: اِسے میں Joke of the century ہی کہہ سکتا ہوں۔ میرے پاس آنے والے اپنے حسنِ ظن کی وجہ سے مجھے اچھا انسان سمجھتے ہیں۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ مرشد کیا ہوتا ہے اور مرید کسے کہتے ہیں تو پھر میں مرشد کا رول کیسے ادا کروں گا۔ میں نیک انسان نہیں ہوں۔ مرشد تو کوئی نیک آدمی بنے گا۔

سوال: اگر مرشد اپنے مرید کو Monitor کر رہے ہوں اور مرید سے جانے انجانے میں کوئی بہت بڑی Mistake ہو جائے تو کیا اُسے Monitoring سے نکال دیا جاتا ہے اور مرشد کی توجہ مرید پر نہیں رہتی؟

جواب: جو آدمی مرشد کے مقام پر فائز ہو گیا اُس کا ظرف بہت بڑا ہو جاتا ہے۔ میں نے جتنے فقیروں کو دیکھا، اُن کے بارے میں کتب میں پڑھا، ذاتی تجربہ بھی یہی ہے کہ فقیر گناہ گار کو سینے سے لگاتے ہیں۔ یہ بات کبھی کسی کو سمجھ نہ آئی کہ میرے مرشد سید یعقوب علی شاہ صاحب نے مدت سے اپنے پاس آنے والے تمام لوگوں کو ایک طرف کر کے مجھے کیوں اپنے سینے سے لگا لیا۔ چوں کہ اصل بھید میں جانتا ہوں اس لیے مجھے کبھی خوش فہمی نہیں رہی۔ یہ تو اولیائے کرام کی سنت ہے کہ وہ گناہ گاروں کو سینے سے لگاتے ہیں۔ اُن کے پاس آنے والے سبھی نیک لوگ تھے...... لیکن جوں ہی مجھ جیسا گناہ گار شخص اُن کے پاس گیا، اُنھوں نے مجھے سینے سے لگا لیا۔ ویسے جوتے بہت بار پڑ جاتے تھے...... نکال بھی دیا کرتے تھے۔ چوں کہ یہ نہیں فرمایا ہوتا تھا کہ دوبارہ نہیں آنا اِس لیے تھوڑی دیر جا کر گاڑی میں بیٹھا رہتا اور پھر اُن کے پاس چلا آتا...... سلام کرتا۔ وہ میرے سلام کا جواب دیتے، بیٹھنے کو کہتے اور اپنے ہاتھوں سے ایک کپ چائے بنا کر دیتے۔ کبھی یہ نہ کہتے کہ پھر کیوں آ گئے ہو؟

مرشد کے درجے پر فائز لوگ بہت بڑے ہوتے ہیں۔ کسی نے کیا کہہ دیا، کیا کر دیا، کس سے کون سا گناہ سرزد ہو گیا...... یہ سب وہ Ignore کرتے رہتے ہیں۔ اِس لیے آپ اطمینان رکھیے، اگر وہ واقعی آپ کے مرشد ہیں تو کبھی آپ کو مانیٹرنگ لسٹ سے خارج نہیں کریں گے۔

سوال: راہِ سلوک پر چلتے چلتے کبھی جانے انجانے میں کوئی ایسی غلطی ہو جاتی ہے کہ یوں لگتا ہے کہ جیسے ریورس گیئر لگ گیا ہو۔ اِس ریورس گیئر سے کیسے بچا جا سکتا ہے؟ کیا ریورس گیئر کی Feelings بلاوجہ بھی ہو سکتی ہیں؟

جواب: آپ نے یقیناً سمندر دیکھا ہوگا۔ کنارے پر کھڑے ہو کر اُسے دیکھیں تو بہت گہرا لگتا ہے۔ میلوں میں اُس کی گہرائی ہوتی ہے۔ اِتنی Depth کے بعد اُس میں لہریں نہیں اُٹھنی چاہییں لیکن اتنی گہرائی کے باوجود اُس میں لہریں اُٹھتی اور بنتی رہتی ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

ہر چیز کا ایک Life cycle ہے...... مارکیٹنگ میں ہمیں پڑھایا جاتا ہے کہ ہر پراڈکٹ حتیٰ کہ انسان کا

بھی ایک Life cycle ہے...... مثلاً درخت میں کیڑا لگتا ہے...... اُس کے پتے مرجھا جاتے ہیں، پھر تازہ پتے آجاتے ہیں۔ پھل میں کیڑا لگتا ہے، نیا پھل بھی آجاتا ہے۔ موسم تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ ایک ہی موسم اور دن میں ٹمپریچر Vary کرتا رہتا ہے۔ ٹھہراؤ کہیں نہیں۔ یہ کائنات اِسی لیے Dynamic ہے کیوں کہ اس میں کہیں ٹھہراؤ نہیں۔ یہی اس کی رنگینی و خوب صورتی ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ نہروں میں دو چار میل کے فاصلے پر رکاوٹیں بنادی جاتی ہیں کیوں کہ وہاں سکون سے پانی بہہ رہا ہوتا ہے۔ اگر یہ بہاؤ اِسی سکون سے جاری رہے تو دس پندرہ میل کے بعد Flow ختم ہو جائے گا۔ پانی کے بہاؤ کو بہتر بنانے اور تیز کرنے کے لیے دو چار میل کے فاصلے پر نہر میں رُکاوٹیں کھڑی کردی جاتی ہیں۔

راہِ سلوک ہو یا دُنیا کی راہ...... جب تک اِس میں Variation نہ ہوگی، اِس کا Flow قائم نہ ہوگا۔ اس میں یکسانیت پیدا ہو جائے گی اور یکسانیت موت ہوتی ہے۔ یہ اُتار چڑھاؤ، موڈ کی تبدیلی، کبھی Normal، کبھی Abnormal، کبھی Gain اور کبھی Loss کا احساس اِسی لیے پیدا ہوتا ہے کہ بہاؤ تیز ہو سکے۔ انسان یکسانیت سے بچ جائے۔ اُس پر موت کی کیفیت طاری نہ ہونے پائے۔ یہ کیفیات اور احساسات نارمل ہیں۔ اس راہ میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس لیے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔

سوال: جب کوئی طالب الٰہی رُوحانیت کی دُنیا میں قدم رکھتا ہے تو اُسے لگتا ہے کہ اُس کے Grey areas کو White areas میں تبدیل کیا جارہا ہے لیکن گزرتے وقت کے ساتھ تبدیلی کا عمل قدرے سست پڑتا دکھائی دیتا ہے۔ ایسا کیوں؟

جواب: اگر آپ بُرا نہ مانیں اور گستاخی کی اجازت دے دیں تو ''طالب الٰہی'' کے بجائے ''طالبِ قربِ الٰہی'' کہہ لیجیے کیوں کہ خود کو طالب الٰہی کہنے والا جرأت مند آدمی میری نظر سے نہیں گزرا۔

جب انسان صاحبِ علم کے پاس جاتا ہے اور اُسے علم عطا ہوتا ہے تو آپ نے بالکل صحیح کہا کہ کیفیت یہی ہوتی ہے کہ اُسے لگتا ہے کہ میرے اندر بڑی تیزی سے مثبت تبدیلیاں آرہی ہیں...... لیکن کچھ عرصے بعد وہ سمجھتا ہے کہ شاید اب مجھ پر صاحبِ علم کی توجہ نہیں رہی، میری تربیت اُس محنت سے نہیں کی جارہی حالاں کہ ایسا نہیں ہوتا...... دیکھیے! آپ جون کے مہینے میں تپتی دھوپ سے جیسے ہی ایئر کنڈیشنڈ روم یا پنکھے والے کمرے میں داخل ہوتے ہیں تو ایک دم آپ کو سکون کا بہت واضح احساس اور فرق محسوس ہوتا ہے۔ لیکن اِسی ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھے بیٹھے جب آپ کو پندرہ یا بیس منٹ ہو جاتے ہیں تو آپ کہتے ہیں کہ گرمی ہے تھرموسٹیٹ کو ذرا Low degree پر سیٹ کردیں۔ وہی ٹمپریچر جس نے ہمیں باہر سے آنے پر اِتنا سکون دیا تھا وہ ہمیں گرم محسوس ہونے لگتا ہے۔

جب کوئی مجھ جیسا گناہ گار، دُنیا دار شخص کسی صاحبِ علم کے پاس جاتا ہے اور وہ مجھے عبادت، نیکی اور اللہ کی راہ پر لگاتا ہے تب ابتدا مجھے جلتی دھوپ سے ایئر کنڈیشنڈ روم میں آجانے کی ٹھنڈک اور راحت کا احساس

ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بعد جب میں آہستہ آہستہ اس نیکی اور عبادت کا عادی ہو جاؤں گا تو پھر مجھے وہ واضح فرق محسوس نہیں ہوگا۔ پھر اُس سے اگلے Level یا حد کی Change ہی میں محسوس کر پاؤں گا۔ حالاں کہ علم اس وقت بھی مل رہا ہوتا ہے۔

رُوحانیت کی راہ میں مشکل یہ ہے کہ اِس میں انسان اپنی Progress کو Judge نہیں کرسکتا کیوں کہ اُسے Judge کرنے کے لیے کوئی Yardstick، بیرومیٹر یا Altimeter نہیں ہے۔

جب ہم بائیسکل، کار یا موٹر سائیکل پر سفر کرتے ہیں تو ہمارے پاس اپنی سپیڈ کا آئیڈیا کرنے کے لیے سائیڈ پر لگے Poles یا درخت ایک ریفرنس کے طور پر موجود ہوتے ہیں۔ جس سپیڈ سے وہ پیچھے گزرتے دکھائی دیتے ہیں اُسی رفتار سے ہمیں اپنے آگے بڑھنے کا آئیڈیا ہو جاتا ہے۔ جہاز عام طور پر اوسطاً 850 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے Fly کر رہا ہوتا ہے۔ آپ Window سے باہر دیکھیں تو جہاز اپنی جگہ ساکن نظر آتا ہے کیوں کہ اُس کے اطراف میں سپیڈ بتانے کے لیے کوئی Object یا ریفرنس موجود نہیں ہوتا۔ لیکن اگر کوئی اور جہاز پاس سے گزرے تو دو تین سیکنڈ جب تک وہ جہاز یا Object نظر آتا ہے اپنے جہاز کی Speed کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

رُوحانیت میں آپ کے پاس کوئی ایسا ریفرنس نہیں ہوتا جس کو Coordinate مان کر آپ ریفرنس لے لیں کہ میں یا دوسرا شخص کتنی تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ درحقیقت ایسا نہیں ہوتا۔ سفر جاری ہوتا ہے۔ راہ سلوک پر چلنے والا شخص ایک Constant اور Continuous process سے گزر رہا ہوتا ہے اس لیے آپ فکر نہ کیجیے۔

مثبت رویہّ اور شکرگزاری

سوال: رب تعالیٰ کو اپنا کون سا Attribute سب سے زیادہ پسند ہے؟
جواب: رب تعالیٰ کو اپنا غفور الرحیم اور رحمٰن ہونا سب سے زیادہ پسند ہے۔ رحمٰن رب کی وہ صفت ہے جس کا عکس کسی انسان میں نہیں حالانکہ رب کے اکثر دیگر Attributes کا ہلکا سا عکس انسانوں میں پایا جاتا ہے۔
سوال: تیسرا کلمہ سنت الٰہی کے بارے میں ہے۔ کیا تیسرے کلمہ کا ورد کر کے بھی رب تعالیٰ کا شکر ادا کیا جاسکتا ہے؟
جواب: اللہ کی تمام صفات سنت الٰہی ہیں۔ اُس کی سنت کسی ایک شے تک محدود نہیں۔ تیسرا کلمہ ضرور پڑھیے۔ یہ باعث برکت و عزت ہے۔ اس کے بہت سے فضائل ہیں۔

جہاں تک رب تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی بات ہے تو دل سے صرف اِتنا جملہ کہہ کر بھی اُس کا شکر ادا کیا جاسکتا ہے "یا اللہ! تیرا شکر ہے۔" جب دل سے شکر ادا کیا جاتا ہے تو لہجے اور الفاظ میں عجیب عاجزی اور زور ہوتا ہے۔ اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو کر بھی اُس کا شکر ادا ہو جاتا ہے۔ جب انسان اپنے رب کو اپنا خالق، مالک، آقا، محسن اور پالنے والا مانتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ مہربان رب کا حق ہے کہ میں اُسے سجدہ کروں تو ایسا سجدہ ادائیگی شکر بن جاتا ہے۔

میرے نزدیک شکر کا سب سے اچھا انداز وہ ہے جہاں انسان اپنی عزیز ترین شے بخوشی دوسروں کے حوالے کر دیتا ہے یہ سوچ کر کہ یہ بھی اُسی رب کا بندہ ہے جس کا میں بندہ ہوں۔ ایسے میں جب انسان کوئی شے دوسروں کو دے رہا ہوتا ہے تو اُس کے دل میں نہ یہ خیال آ رہا ہوتا ہے کہ میں کسی کے کام آ رہا ہوں اور نہ یہ کہ میں کسی کی ضرورت پوری کر رہا ہوں۔ وہ صرف یہ سوچتا ہے کہ میرے پاس جو کچھ بھی ہے یہ میرے رب کا عطا کردہ ہے۔ اس شخص نے میرے سامنے اپنی ضرورت بیان کی ہے اس لیے مجھے چاہیے کہ میں رب کے عطا کردہ مال میں سے اس کی ضرورت کی چیز اسے دے دوں۔

اگر انسان اس سے بھی اگلے مقام پر جانا چاہے تو اپنی خون پسینے کی کمائی اللہ کے اُن بندوں پر خرچ کر دے جن کے بارے میں اُسے گمان ہے کہ یہ میرے دوست نہیں۔

میرے نزدیک اس سے بھی اگلا درجہ یہ ہے کہ اللہ کے بندوں کی خدمت اس انداز میں کی جائے کہ

بقول داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ "خدمت لینے والا یہ سمجھے کہ اُس نے آپ سے خدمت کرا کر آپ پر احسان کیا ہے۔"

اس موقع پر بھی دل میں ذرہ بھر یہ خیال نہ آئے کہ میں نے کسی کی مدد کی، کسی کے کام آیا یا کوئی نیک کام کیا ہے۔ دوسروں کی خدمت کرتے اور اُنھیں کچھ دیتے وقت اگر انسان کی آنکھیں شرمساری سے جھکی ہوں اور انداز ایسا ہو کہ گویا کچھ دے کر اُسے شرمندگی ہو رہی ہے تو یہ شکر گزاری کا بہترین انداز ہے۔

سوال: ہم زاد کیا ہے؟
جواب: ہم زاد کے لیے مختلف Terminologies استعمال ہوتی ہیں جن میں سے کچھ ہندو Spirituality سے Influenced ہیں۔ ہم زاد بہت وسیع المعنی لفظ ہے۔ ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ انسانی جسم میں موجود رُوح ہم زاد ہے۔ انسان عبادات کرتے اور نیکی کے راستے پر چلتے چلتے اُس مقام پر آ جاتا ہے جہاں اس کا Biological system اتنا پاورفل ہو جاتا ہے کہ وہ اُس کے ذریعے کام لینے لگتا ہے مثلاً آپ صبح چار بجے اُٹھنا چاہتے ہیں تو اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ مجھے صبح چار بجے جگا دینا۔ اور پھر ہوتا یہ ہے کہ چار بجے سے چند سیکنڈ پہلے آپ بیدار ہو جاتے ہیں۔ سائنس دان اسے Biological clock کہتے ہیں۔

اگر انسان Positive thinking اور قوتوں کا مالک ہے اور وہ کار چلا رہا ہو، اُس کا دھیان کہیں اور ہو..... کافی فاصلے پر اگر کوئی رُکاوٹ ہو یا کسی شخص کے کار کے نیچے آنے کا خدشہ ہو تو اُس شخص کی توجہ وقت سے پہلے ہی اُس رُکاوٹ یا شخص کی طرف مبذول ہو جائے گی۔ اِسی طرح ہمارا کوئی عزیز میلوں دُور تکلیف میں ہو تو ہمیں یہاں بیٹھے بیٹھے گھبراہٹ ہو گی کہ کوئی بڑا حادثہ ہونے والا ہے۔ لیکن اگر انسان کے اندر کچھ صلاحیتیں اور قوتیں Develop ہو جائیں تو اُسے Clearly پتا چل جاتا ہے کہ فلاں شخص اس وقت مشکل میں ہے..... سائنس نے اِسے "ہم زاد" کا نام دیا ہے۔

تصوف میں ایک ایسا مقام بھی آتا ہے جہاں انسان اپنی رُوح کو خود دیکھنے لگتا ہے۔ کچھ لوگ اسے بھی ہم زاد کہتے ہیں۔ رُوحانیت میں کہا جاتا ہے کہ خاکی جسم کی طرح انسان کا ایک مثالی جسم بھی ہوتا ہے جو عبادات و اعمال کے نتیجے میں توانا یا کمزور ہوتا ہے۔ کچھ لوگ اسے ہم زاد کہتے ہیں۔ سائیکولوجیکل سائنس اِسے چھٹی حس کا نام دیتی ہے۔ آپ اِسے کچھ بھی کہہ لیجیے۔ دراصل ہر انسان کے اندر مخفی یا سوئی ہوئی قوتیں ہوتی ہیں۔ جب ہم اُنھیں مثبت سوچ، نیکی اور عبادات کے نتیجے میں جگا لیتے ہیں تو لوگ اُنھیں ہم زاد کا نام دے دیتے ہیں۔ یہ قوتیں اِسی صورت میں بیدار ہوتی ہیں جب انسان اِس قدر مثبت ہو جاتا ہے کہ اُس کے ذہن میں کوئی منفی خیال نہیں آتا۔ کینہ، حسد، بغض، غصہ یا رنج نہیں ہوتا۔ اُس کا دل آئینے کی طرح چمکتا رہتا ہے۔ اُس میں نہ حرصِ کلام ہوتی ہے نہ حرصِ طعام، نہ حرصِ مال نہ حرصِ دُنیا..... نہ ہی اچھا کہلانے کی حرص۔ وہ تو بس ایک بات جانتا ہے کہ میں بُرا ہوں، دوسرے سب اچھے ہیں۔ میں سیاہ کار ہوں، دوسرے سب نیک ہیں۔ ہر آدمی مجھ

سے Superior ہے اس لیے وہ قابلِ احترام ہے۔ اس مثبت سوچ کے بعد انسان سب کی عزت و احترام کرتا ہے اور متواضع ہو جاتا ہے۔ چونکہ وہ دوسروں کو اچھا سمجھ کر اُن سے پیار کرتا ہے اس لیے اُن کی خدمت کے لیے ہر وقت کمر بستہ رہتا ہے۔ وہ کسی کی غلطی پر گرفت نہیں کرتا۔ میں اپنے ماتحتوں سے ایک جملہ کہا کرتا ہوں۔

Don't point out the mistakes, correct them.

مثبت سوچ (Positive thinking) کے بعد انسان کسی کی غلطی کو Point out کرنے کے بجائے Correct کرنے لگتا ہے اور کہیں اُس غلطی کا ذکر نہیں کرتا۔

اس طرح یک طرف تو انسان کے رویے میں یہ ساری تبدیلی آتی ہے تو دوسری طرف اُس کے اندر رب کے لیے شکرگزاری اور احسان مندی کا جذبہ بڑھتا رہتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ رب میرا مالک ہے، بغیر مجھ سے کوئی توقع اور غرض رکھے مجھے پالتا ہے، میری حفاظت کرتا ہے، مجھے Look after کرتا ہے۔ جو اِتنا عظیم ہے وہ یقیناً لائقِ عبادت ہے۔ تب انسان پورے جذبے اور دل سے رب کی عبادت کرتا ہے۔ اِس جذبے اور رویے سے انسان کے اندر سوئی ہوئی قوتیں بیدار ہونے لگتی ہیں۔ تب وہ ایسی باتیں کرنے لگتا ہے جو دوسروں کے لیے باعثِ حیرت ہوتی ہیں لیکن سمجھدار اور Guided لوگ اِن بیدار قوتوں کو دیکھ کر بہکتے نہیں کہ میں ولی اللہ بن گیا بلکہ وہ اصل خواہش اور منزل پر نظر رکھتے ہیں کہ مجھے رب چاہیے۔ جب اُن کی خواہش ہی رب ہوتا ہے تو وہ اِن قوتوں کے بیدار ہونے سے Distract نہیں ہوتے۔ نہ یہ کہتے اور سوچتے ہیں کہ یہ مجھ میں کیسی کمال قوتیں جاگ گئی ہیں کہ اب میں جو کہتا ہوں، پورا ہو جاتا ہے، جو سوچتا ہوں، وہ ہو جاتا ہے۔ نہ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ مجھ پر کتنی سختیاں آتی ہیں، فاقے سے رہتا ہوں یا خوش حالی میں۔ دُنیا میرے ساتھ زیادتی کر رہی ہے یا احسان کا سلوک۔ اِن سب باتوں سے بالاتر ہو کر اُس کی نظر صرف اِس بات پر جمی ہوتی ہے کہ مجھے رب مل جائے، میرا رب مجھے اپنے قریب کر لے۔

اگر آپ نے ہم زاد کو قابو میں کرنا ہے تو اِس کے لیے آپ کو اِن سب راہوں سے گزرنا ہوگا۔ سب سے پہلے اپنے اندر تبدیلی لائیں۔

بہت سے سادہ لوح، معصوم اور اچھے لوگ میرے بارے میں دھوکا کھا جاتے ہیں کہ شاید میں کوئی اچھا، نیک یا علم رکھنے والا انسان ہوں۔ اِسی لیے وہ مجھ سے ولایت پر چلنے کا راستہ پوچھتے رہتے ہیں۔ میں اُن سے بھی یہی کہتا ہوں کہ صاحب! پہلا کام یہ کر لیجیے، کہ کوئی شخص آپ کی خواہ کتنی ہی جڑیں کاٹ رہا ہو، توہین کر رہا ہو، نقصان پہنچا رہا ہو، آپ اُسے کبھی برا نہ سمجھیے۔

دوسرے قدم پر یہ کیجیے کہ ساری دُنیا مجھ سے بہتر ہے، سب انسان مجھ سے بہتر ہیں۔ وہ نیک ہیں میں بُرا ہوں، اُن سب سے حقیر ہوں۔ اس سے اگلا قدم یہ ہے کہ میرا کسی پر کوئی حق نہیں لیکن سب کے حقوق مجھ پر ہیں اور مجھے وہ حقوق ادا کرنے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ انسان کسی سے توقع نہیں رکھتا اور کسی سے کچھ مانگتا

نہیں اور خوفِ خدا کے تحت جب اُسے دوسروں کے حقوق کی ادائیگی یاد رہتی ہے تو وہ دوسروں کے حقوق قربانی دے کر بھی ادا کرتا ہے۔ جب انسان یہ سب کچھ Successfully کر لے تو پھر اگلے قدم پر ہر لمحہ وہ اللہ کے ساتھ گفتگو میں مصروف رہے۔ اِس کا فائدہ یہ ہوگا کہ جب انسان ذہنی طور پر رب کی طرف متوجہ رہے گا تو رب بھی اُس کی طرف متوجہ رہے گا اور اُس پر عنایات کی بارش شروع ہو جائے گی۔ لیکن اس سلسلے میں یہ یاد رکھیے کہ یہ سب کہنا تو بہت آسان ہے لیکن پہلے ہی قدم پر انسان کو جھٹکے لگنا شروع ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں اُسے ہر لمحہ یہ یاد رکھنا پڑتا ہے کہ یہ شخص مجھے جیسا سمجھتا ہے شاید میں ایسا ہی ہوں۔ جو شخص مجھے گالی دے کر چلا گیا، قصور اُس کا نہیں میرا ہے۔ یہ خاصا دشوار عمل ہے۔

جب آپ کو رب مل جاتا ہے اور اُس کا قرب حاصل ہو جاتا ہے تو پھر یہ کائنات آپ ہی کی ہے۔ پھر آپ کے کہنے سے پہاڑ بھی اپنی جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ شفٹ ہو جاتا ہے۔

سوال: سورۂ یٰس کو قرآن پاک کا دل کیوں کہا جاتا ہے؟ سورۂ یٰس کو روزانہ پڑھنے کی فضیلت کیا ہے؟

جواب: حدیثِ مبارکہ کے مطابق سورۂ یٰس قرآن پاک کا دل ہے۔ ہم مسلمانوں کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ چونکہ یہ آپ ﷺ کا فرمان ہے اِس لیے غلط ہو ہی نہیں سکتا۔

سورۂ یٰس کے فضائل میں عرض کر دیتا ہوں لیکن خدا کے لیے اِسے اِس نیت سے نہ پڑھیے گا کہ سورۂ یٰس کو کثرت سے پڑھا جائے تو رب انسان کو مصیبتوں اور مسائل سے نکال دیتا ہے۔

آپ اِس سورہ کو یہ سوچ کر پڑھیے گا کہ یہ آپ ﷺ کو اتنی پسند ہے کہ آپ ﷺ نے اسے قرآن کا دل قرار دیا۔ اِس طرح آپ کو اِس سورہ کے فیوض تو مل ہی جائیں گے، اِس کے ساتھ ساتھ عرشِ معلیٰ پر آپ کی عقیدت بھی رجسٹر ہو جائے گی کہ آپ نے اِسے آپ ﷺ کی پسندیدہ سورہ سمجھ کر تلاوت کیا۔

سوال: کشف القبور کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے؟

جواب: آپ کے گھر میں تین ملازم ہیں۔ پہلا ملازم کام بھی جانفشانی سے نہیں کرتا اور آئے روز نت نئی فرمائشیں بھی کرتا ہے۔ دوسرا ملازم تن دہی سے اپنے فرائض تو سرانجام دیتا ہے لیکن مقررہ وقت سے ایک منٹ بھی زیادہ ڈیوٹی کرنا پسند نہیں کرتا۔ تیسرا ملازم تنخواہ، وقت، حالات اور اپنی طبیعت کی پروا کیے بغیر آپ کی بے لوث خدمت اور آپ سے پیار کرتا ہے۔ اِن تینوں میں سے آپ کو وہی ملازم بھائے گا جو آپ کی محبت میں آپ کی خدمت کرتا ہے۔ اِس لیے آپ اُسے جو Due ہے اُس سے زیادہ دیں گے۔ جب ہم رب کو محبت سے پکارتے ہیں تو ہمیں اِس سے غرض نہیں ہوتی کہ اُس نے ہمیں کس حال میں رکھا، کیا دیا، کیا نہیں دیا، کون سی ضرورت وقت پر پوری ہوئی اور کون سی ضرورت وقت پر پوری نہیں ہوئی، کون سی دُعا قبول ہوئی اور کون سی دُعا قبول نہیں ہوئی۔

جب انسان بے غرض ہو کر محبت سے رب کو پکارتا ہے تو پھر اُس پر رب کی طرف سے انعامات اور رحمتوں کی بارشیں ہوتی ہیں..... ایسی رحمتیں اور انعامات جو سنبھالے نہیں جاتے۔ لیکن اگر اُس نے یہ سوچ کر رب کی

عبادت کی کہ مجھے کشفِ القبور یا کشفِ شخصی حاصل ہو جائے تو پھر اُسے کچھ نہ مل پایا۔ ملتا اُنہی کو ہے جو رب کو اس لیے پکارتے ہیں کہ وہ اُس کے احسان مند بھی ہوتے ہیں اور اُس سے پیار بھی کرتے ہیں۔

وظیفہ پڑھنے سے کشف القبور مل بھی گیا تو کیا حاصل ہو جائے گا۔ مثلاً اگر کسی شخص کو اس طرح کشف القبور حاصل ہو جائے اور وہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ یا حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ جیسے بلند مقام اولیاء اللہ کے مزار پر جا کر کھڑا ہو جائے اور اس دوران اُس کی اُن سے ملاقات ہو بھی جائے تو ملے گا کیا؟ کیونکہ وہ تو من دیکھتے ہیں تن نہیں۔ اگر من میرے جیسا میلا ہے تو وہ کیا دیں گے! اگر وہ دے بھی دیں تو وہ شخص سنبھالے گا کیسے؟ جھولی ہی چھیددار ہو تو عطا اُس میں کہاں ٹھہرے گی۔

اہم یہ نہیں کہ کسی کو کشف القبور یا Over all کشف حاصل ہو جائے۔ اِس سے تھوڑے عرصے کے لیے دکان داری تو چ جائے گی لیکن پھر اصلیت کھل کے سامنے آ جائے گی۔ اِس لیے میری گزارش تو یہی ہے کہ بھائی! اِن باتوں کا خیال چھوڑ دیجیے۔ کشف القبور، کرامات اور وظائف کو حاصل کر کے کیا لینا۔ بس اِس بات پر نظر رکھیے کہ رب مجھے اپنا بنا لے...... اِسی میں سب کچھ آ جائے گا۔

سوال: میں سورۂ طٰہٰ کس طریقے سے پڑھوں کہ میرا Confidence level بہتر ہو جائے۔

جواب: قرآن پاک کی کوئی سورہ پڑھنے کا کوئی خاص Procedure یا طریقہ نہیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ انسان قرآن پاک پڑھتا رہے۔

میری ناقص معلومات کے مطابق سورۂ طٰہٰ پڑھنے سے Self-confidence build نہیں ہوتا البتہ اگر اِسے خالص محبت سے صرف اللہ کا کلام سمجھ کر تلاوت کیا جائے تو خاصے انعامات ملتے ہیں۔ یہ میری General statement ہے۔ صاحبِ سوال اگر اپنا نام بتا دیتے تو اُن کے لیے particularly عرض کر دیتا۔ اگر سورۃ البقرہ کا ساتواں رکوع سات بار نمازِ تہجد کے بعد پڑھا جائے تو اِس سے Self-confidence بہتر ہو جائے گا جب کہ سورۂ طٰہٰ پڑھنے سے جلال بہت آئے گا جس میں ہم پاکستانی پہلے ہی Self-sufficient ہیں۔ اس لیے غصے اور جلال کو مزید اکٹھا کر کے کیا لیں گے؟ بہتر تو یہی ہے کہ قرآن پاک پڑھنے سے ہمارے اندر عفو و درگزر کی صفت پیدا ہو جائے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاقِ حمیدہ میں بے حد نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ ہم برداشت، درگزر اور معاف کر دینے کی خوبی اپنا لیں۔ ہم بہت ہنس کر دوسروں سے گفتگو کر رہے ہوتے ہیں لیکن جیسے ہی کوئی ہم پر تنقید کرتا ہے تو ہمارا رنگ ڈھنگ ہی بدل جاتا ہے۔ ہم اپنی ذات پر ہونے والی تنقید کو خوش دلی سے برداشت کرنا سیکھ جائیں بلکہ اِس تنقید کو قبول کر کے ہمیں اپنے آپ کو Correct کرنا بھی آ جائے۔

انسان میں Self-confidence تب آتا ہے جب اُسے یہ پتا چلتا ہے کہ اِس میں کچھ ہے...... چاہے وہ علم ہو، دولت، عہدہ یا جسمانی قوت۔ باطن کی آنکھیں کھلنے سے فہم و فراست پیدا ہو گی، علم بڑھے گا جس سے انسان کا Cofidence بھی Build up ہو جائے گا۔

رب پر یقین

سوال: اسلام پر جب مشکل وقت آتا ہے تو فقیر کو درگاہ سے باہر نکلنا چاہیے جیسا کہ حضرت مجددِ الفِ ثانی رحمتہ اللہ علیہ نے اکبر کے خلاف جدوجہد کی۔ اب جب کہ Kharji'ites نے اسلام کو بدلنے کی کوشش کی ہے تو فقیر کیوں چپ ہیں؟

جواب: مجھے نہیں معلوم کہ اسلام کی شکل کہاں تبدیل کی جا رہی ہے اور جن کو آپ نے Kharji'ites کہا ہے وہ کون ہیں۔

حضرت مجددِ الفِ ثانی رحمتہ اللہ علیہ کے دور میں اکبرِ اعظم نے نئے دین کی طرح ڈال دی تھی۔ دینِ اکبری کے نام سے اُن کے عقائد مشہور ہوئے...... یہ اسلام کی کھلی تحریف تھی۔ اسلام میں ہر صدی کے بعد مجدد اور ہزار سال کے بعد مجددِ کامل آتا ہے۔ حضرت مجددِ الفِ ثانی رحمتہ اللہ علیہ اسلام کے ظہور کے ایک ہزار سال بعد آئے تھے وہ ایک Coincidence تھا یا پھر اللہ کے نظام میں طے شدہ بات تھی کہ اسلام کے ایک Millennium بعد حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ تشریف لائے۔ میرے خیال میں اسلام کے مختلف مکاتبِ فکر میں فروعی معاملات تو ہیں لیکن تحریف نہیں ہے۔

فقیر اُسی وقت عملی جدوجہد اور جہاد کرے گا جب بڑے پیمانے پر تحریف ہو گی۔ اگر کہیں ایسی تحریف ہو رہی ہے یا اسلام کا چہرہ بگاڑا جا رہا ہے تو صاحبِ سوال اِس حوالے سے تفصیلات سے آگاہ کر کے میری معلومات میں اضافہ کریں میں شکر گزار ہوں گا۔ سوال کے دوسرے حصے کا جواب بھی عرض کروں کہ حضرت مجددِ الفِ ثانی رحمتہ اللہ علیہ مجددِ کامل کے مقام پر فائز تھے۔ اگر کوئی جدوجہد کے لیے نکلے گا تو فقیر ہی نکلے گا...... میں کہاں سے آؤں گا۔

سوال: ہم اللہ پر بھروسا کرنا کیوں نہیں سیکھ پاتے؟ جب ہم جانتے ہیں کہ رب سب جانتا ہے تو ہم اُس کو ماننے اور اللہ پر بھروسا کرنے کے لیے خود کو Tame کیوں نہیں کرتے؟ ہم شاہ صاحب پر تو بھروسا کرتے ہیں مگر اللہ پر نہیں۔ ایسا کیوں؟

جواب: آخری بات جو آپ نے فرمائی، یہ وہی ہے جو میں اکثر و بیشتر اپنے پاس آنے والوں سے عرض کیا کرتا ہوں کہ ہم اللہ کے ایک بندے پر تو اندھا یقین رکھتے ہیں، رب پر بھروسا کیوں نہیں کر لیتے۔ رب پر بھروسا

کرنے سے اپنے جیسے رب کے محتاج بندوں کے پاس جانے سے ہماری جان چھوٹ جاتی ہے لیکن میری یہ بات کسی کو پسند نہیں آتی۔

ہم اللہ پر بھروسا کرنا کیوں نہیں سیکھ جاتے؟ ماننے اور بھروسا کرنے کے لیے خود کو Tame کیوں نہیں کر لیتے؟

اس کی کئی Psychological reasons ہیں۔ جب قومیں Transition میں ہوتی ہیں، اُن کی سوچ اور رویوں میں تبدیلی آ رہی ہوتی ہے، ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف اُن کا سفر جاری ہوتا ہے تو چونکہ کوئی بھی شے جو Transition میں ہو وہ فوراً Attacks کے لیے Vulnerable ہو جاتی ہے اس لیے جب قومیں Transition میں ہوتی ہیں تو کسی زمانے میں جو چیزیں ہمیں غیر اخلاقی معلوم ہوا کرتی تھیں وہی اُن میں در آتی ہیں۔ ہم میں غلامی سے آزادی کی طرف Transition ہوئی ہے۔ آزادی حاصل کیے ہوئے ایک لمبا عرصہ گزر گیا لیکن اس کے باوجود وہ Transition ابھی تک مکمل نہ ہو سکی۔ اس Transition کے نتیجے میں ہمارے رویوں میں ایک Major shift آیا ہے۔ اگر ہم کتابوں میں پڑھیں تو ہمارے رویے 1947ء سے پہلے مختلف تھے۔ اُن میں اسلام کی جھلک تھی، باہمی محبت، بھائی چارہ، رواداری، ایک دوسرے کا احساس اور خیال تھا۔

اسلام اپنے عقائد کے بارے میں ظاہراً بہت جذباتی نہیں لیکن اندر سے اس کے بیشتر احکامات پر عمل کرنے والی یہ قوم ایک جنرل شفٹ کا شکار ہو گئی۔ ہم بہت زیادہ Materialistic (مادیت پسند) ہو گئے۔ ہمارے اندر صبر و انتظار ختم ہو گیا۔ ہم سب مع میرے یہ چاہتے ہیں کہ جونہی دل میں خواہش پیدا ہو وہ فوراً کسی بھی قیمت پر پوری ہو جائے۔ میں چاہتا ہوں مجھے مال و دولت حاصل ہو جائے اور اس سلسلے میں مجھے حلال و حرام سے کوئی غرض نہیں۔ میرے آگے بڑھنے کے Process میں دوسروں کی حق تلفی ہو رہی ہے یا میں اُن کے لیے بہتر ثابت ہو رہا ہوں، مجھے اس سے غرض نہیں۔ میرے سر پر بس ایک دُھن سوار ہے کہ مجھے آگے بڑھنا ہے خواہ Elbow کے زور پر ہی سہی۔ ہمارے رویوں کا یہ Shift ٹھیک ہو جائے گا۔ اِس میں مایوسی اور پریشانی کی بات نہیں۔ یہ Test سب قوموں کی زندگی میں آیا کرتا ہے۔ West جو آج اپنے آپ کو انسانی حقوق کا علم بردار اور انسانیت کا سب سے بڑا دعوٰی دار قرار دیتا ہے اُس کی تاریخ بھی یہی بتاتی ہے کہ آج سے ڈھائی سو سال پہلے وہاں بربریت اور Law of jungle (جنگل کا قانون) Rule (راج) کرتا تھا۔ لیکن Gradually شفٹ آتا گیا، رویے بدلتے گئے اور آج وہ لوگ کلی حد تک نہ سہی لیکن بڑی حد تک قانون کے پاس دار ہیں خواہ ظاہراً ہی سہی۔

ہمارے لیے ایک بات باعثِ اطمینان ہے کہ آج سے سات سو سال پہلے ہم لوگوں کے لیے روشنی کا منبع تھے۔ پھر اپنی نالائقیوں اور نادانیوں سے ہم رفتہ رفتہ اندھیروں کی طرف آ گئے۔

West میں جو زبانیں بولی جاتی ہیں اُنھیں ہم Left سے Right کی طرف لکھتے ہیں...... یہ شک سے

یقین کی طرف سفر ہے۔ East میں رائج زبانیں Right سے Left کی طرف لکھی جاتی ہیں...... یہ یقین سے شک کی طرف سفر ہے۔ یہی ہماری History میں ہے کہ ہم عروج کی طرف تھے۔ عروج سے زوال کی طرف آئے۔ West جہالت میں تھا۔ اُس کا سفر جہالت سے علم کی طرف ہوا۔

کسی کے Character (کردار) کا اندازہ لگانا ہو تو اُس کی تحریر دیکھیے۔ اگر وہ بغیر Conscious ہوئے روانی سے انگریزی لکھتا ہے، اور Alphabets مکمل لکھتا ہے، اُس میں خلا باقی نہیں تو سمجھ لیجیے کہ وہ شخص آپ کے رازوں کی حفاظت کرے گا۔ جس شخص کی تحریر میں الفاظ سائز میں بہت چھوٹے ہوں وہ شخص ہمیشہ تنگ دلی اور کنجوسی کی طرف مائل ہو گا۔ جس شخص کی تحریر کے حروف سائز میں بڑے ہوں وہ کھلے دل کا مالک ہو گا۔ جس آدمی کی تحریر Right کی طرف Tilt (جھکتی) کرتی ہے وہ Progressive ہو گا اور ہمیشہ اوپر جانے کی کوشش کرے گا۔ جن لوگوں کی تحریر Left کی طرف Tilt کرتی ہے وہ Introvert ہوتے ہیں۔ جن کی تحریر بالکل سیدھی ہو وہ Conservative ہوتے ہیں، اپنے اُصولوں سے جلدی ہٹتے نہیں۔

یہ بہت وسیع Subject ہے۔ اِسی طرح دستخط دیکھ کر انسان کی Personality بالکل Clearly سامنے آ جاتی ہے۔ کچھ لوگوں کے Signature بہت Neat اور Uniform ہوتے ہیں جیسے قائداعظم کے...... یہ لوگ بہت بااُصول، ایمان دار اور اندر باہر سے ایک ہوتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے Signature دیکھ کر لگتا ہے کہ جیسے ڈور میں بل پڑے ہوں...... یہ بہت پیچیدہ شخصیت اور منتشر خیالات کے مالک ہوتے ہیں۔ Straight سوچ نہیں رکھتے۔ کسی شخص کے Signature میں اگر تین چار جگہ "L" آیا ہے اور اِن تین چار "L" کا فاصلہ یکساں ہے تو وہ شخص ایمان دار ہو گا اور زندگی میں Balance رکھے گا۔ یہ بڑا دلچسپ Subject ہے، اس سے انسان کی شخصیت سامنے آ جاتی ہے۔

یہ سب تو برسبیل تذکرہ تھا۔ اصل میں ہم بات کر رہے تھے کہ ہم اللہ پر بھروسا کرنا کیوں نہیں سیکھ پاتے؟ ہم میں تبدیلی یہ آئی کہ ہم Materialistic ہو گئے اور جلد بازی کا شکار بھی۔ ہم اپنی اس جلد بازی کی عادت کے ہاتھوں مجبور ہو کر سر پر آتی ٹرین کے باوجود اندھا دھند ریلوے کراسنگ عبور کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر کراسنگ کے اُس پار اِس فرصت اور تسلی سے مداری کے کرتب دیکھنے لگتے ہیں جیسے دُنیا میں ہمیں کسی کام کی جلدی نہ ہو۔

آپ یہ دیکھنا چاہیں کہ ہمارے پاس غیر ضروری کاموں کے لیے کتنا وقت ہے تو کبھی سڑک پر کھڑے ہو کر آسمان کی طرف دیکھنا شروع کر دیں۔ ایک ہی منٹ بعد آپ دیکھیں گے کہ دو چار اور آدمی بھی کھڑے ہو کر آسمان کی طرف دیکھنے لگے ہیں۔ دس منٹ تک اگر آپ یہ شغل جاری رکھیں تو لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو آسمان کی جانب دیکھتا پائیں گے۔ اگر آپ آزمانے کے لیے اِن میں سے کسی سے پوچھ لیں "بھائی! آسمان پر کیا دیکھ رہے ہو؟" تو وہاں موجود ہر شخص ایک ہی جواب دے گا۔ "صاحب! مجھے نہیں معلوم۔ یہ لوگ دیکھ رہے تھے تو میں بھی دیکھنے لگا۔"

ہمارے رویے ایسے ہی عجیب و غریب ہیں لیکن مایوسی کی بات نہیں۔ یہ وقت گزر جائے گا۔ پھر ہم انشاءاللہ اُن رویوں کی طرف چلے جائیں گے جو مسلمانوں کا طرۂ امتیاز ہیں۔ کچھ عرصے میں انشاءاللہ معاملات ٹھیک ہو جائیں گے۔

ماننے اور بھروسا کرنے کے لیے ہم اپنے آپ کو Tame کیوں نہیں کرتے؟

میرے مذہب میں تو یہ لکھا ہے کہ دوسرے سب صحیح اور نیک ہیں، میں غلط اور سیاہ کار ہوں۔ دوسرے درست کام کرتے ہیں میں غلطیاں کرتا ہوں۔ میری اُنگلی دوسروں پر نہیں، اپنی ذات پر اُٹھنی چاہیے۔ اگر میں اِتنا دانش ور اور خود شناس ہوتا اور مجھے ادراک ہو جاتا کہ میں رب تعالیٰ پر بھروسا نہیں کرتا، مجھے یہ ادراک ہو جاتا کہ میں خود کو Tame نہیں کر سکا تب میں یہ سمجھتا کہ معاشرے کو درست کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ میں خود کو درست کرلوں۔

جب ہم میں سے ہر انسان اپنی ذات پر اُنگلی اٹھانے لگے گا اور اپنی ہی ذات کی خامیوں پر نظر رکھ کر اُنھیں درست کرنا چاہے گا تو یہ قوم راتوں رات ٹھیک ہو جائے گی۔

ہم یہ نہ دیکھیں کہ دوسرے خود کو Tame نہیں کر رہے۔ ہم اپنے آپ کو Tame کر لیں۔ ایک Trainer سٹیفن کووے Management کی دُنیا میں بہت مشہور ہوئے۔ اُن کی کتاب Seven Habits کی ڈیڑھ کروڑ Copies چھپتے ہی فروخت ہو گئیں۔ اس کتاب نے اُنھیں وہ شہرت اور عروج دیا جو اُن کے بعد آنے والی کتابوں "Eight Habits" اور "Leadership" کے حصے میں بھی نہ آسکا۔

سٹیفن کووے نے اپنی کتاب "Seven Habits" میں خود آگہی کی تعریف کرتے ہوئے کہا:

''جب انسان کو یہ ادراک ہو جائے کہ سوچ کا عمل کیا ہے اور اُس کا ردِعمل کیا ہے تب وہ خود آگہی کے مقام پر ہوتا ہے۔''

میں اس تعریف سے مکمل طور پر اتفاق نہیں کرتا کہ سٹیفن کووے جس بات کو React کرنا کہتا ہے میرے نزدیک وہ Act ہے۔ اس کو یوں واضح کیا جاسکتا ہے کہ اگر ہمیں یہ سمجھ آجائے کہ ہم کیا سوچتے ہیں؟ کیسے سوچتے ہیں؟ کیوں سوچتے ہیں؟ پھر اُس سوچ کے پیدا ہونے کے بعد جب ہم بقول سٹیفن کووے React (اور میرے مطابق Act) کرتے ہیں تو یہ گتھی سلجھ جائے گی۔

اگر ہم میں سے ہر آدمی دُعا کرنے والے کے پاس جانے سے پہلے یہ سوچ لے کہ میں اُس مقررہ کے پاس کیوں جارہا ہوں؟ وجہ کیا ہے؟ پھر اس سوچ کے بعد اپنے عمل پر نظر رکھے تو یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ پھر آپ کسی دُعا کرنے والے آدمی کے پاس نہیں جائیں گے بلکہ رب کی طرف رجوع کریں گے۔

سٹیفن کووے نے غصے کے مضمرات سمجھانے کے لیے بھی بہت کمال کی مثال دی ہے۔ ایک روز اُس نے اپنے ایک شاگرد کو منرل واٹر کی بوتل دے کر کہا کہ اسے پانچ منٹ تک خوب Shake کرو اور پھر اس کا ڈھکن کھولو۔ جب شاگرد نے پانی کی بوتل کو Shake کرنے کے بعد ڈھکن کھولا تو اُس میں کوئی تبدیلی نہیں

آئی تھی سوائے اس کے کہ اُس میں چھوٹے چھوٹے چند بلبلے دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے بعد سٹیفن کووے نے اپنے شاگرد کو Pepsi کی ایک بوتل دیتے ہوئے ہدایت کی کہ صرف دو منٹ Shake کرنے کے بعد اس کا ڈھکن کھولو...... جب شاگرد نے ایسا کیا تو Pepsi بہت پریشر کے ساتھ باہر جا گری...... حتیٰ کہ اُس کے چھینٹے پاس بیٹھے سٹوڈنٹس کے کپڑوں کو بھی داغ دار کر گئے۔ سٹیفن کووے نے شاگرد کو دوبارہ وہی عمل دہرانے کو کہا۔ شاگرد نے Pepsi کی بوتل بند کر کے اِسے دوبارہ Shake کیا اور یک دم جونہی ڈھکن کھولا تو Pepsi کا پہلے جیسا ہی Reaction تھا۔

تب سٹیفن کووے نے اپنے شاگرد سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ منرل واٹر بوتل اور Pepsi کی بوتل دونوں کو میز پر رکھ دو۔ جب Pepsi کی بوتل میں اُٹھنے والے بلبلے Settle down ہو گئے تو اُس نے کہا کہ اب اُن دونوں بوتلوں میں مائع کی مقدار دیکھو۔ منرل واٹر کی مقدار وہی رہی جب کہ Pepsi کی مقدار نصف رہ گئی۔

اِسی طرح جب انسان کو غصہ آتا ہے تو وہ اپنا آپ گنوا دیتا ہے۔ وہ اپنے بہت سے خیالات اور جذبات Pepsi کی بوتل کی طرح اُگل کر ضائع کر دیتا ہے حتیٰ کہ بار بار غصے سے وہ Shallow ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر انسان منرل واٹر کی بوتل کی طرح اپنے اندر ٹھہراؤ پیدا کرلے خواہ کیسے ہی حالات ہوں، Jolts اور Shocks کتنے ہی شدید کیوں نہ ہوں انسان اپنی جگہ پر قائم و دائم رہے۔ اللہ پر اپنے بھروسے کو متزلزل نہ ہونے دے اور کسی صاحبِ دُعا کے پاس جانے کے بجائے رب پر ہی بھروسا کرے...... یہی رویہ اپنا کر انسان خود کو اللہ پر مکمل بھروسا کرنے کے لیے Tame کرسکتا ہے۔

حضور! جو احساس مجھے اور آپ کو صاحبِ دعا کے پاس لے جاتا ہے وہ یہ ہے کہ میرا کام نہیں ہو رہا۔ اگر ہمارا ایمان پختہ ہے کہ رب کی طرف سے ہر کام کا وقت مقرر ہے جو اپنے مقررہ وقت پر ہو جائے گا۔ تب ہم منرل واٹر کی بوتل کی طرح اپنی جگہ قائم و دائم رہیں گے۔ ہمارے اندر اُبال نہیں آئے گا۔ ہمیں کسی صاحبِ دُعا کے پاس جانے کی ضرورت نہیں رہے گی بلکہ ہم اُس مقررہ وقت کا صبر و تحمل سے انتظار کریں گے۔

یاد رکھیے اکثر اکبھی بھوکا نہیں مرتا۔ وہ اس انتظار اور یقین میں رہتا ہے کہ کبھی کبھی تو میرے قریب آئے گی۔ پھر جیسے ہی کبھی اُس کی زبان کی Range میں آتی ہے وہ دو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے زبان باہر نکال کر اُس پر جھپٹتا اور اُسے نگل لیتا ہے۔

اگر ہم اس یقین کے ساتھ انتظار کریں کہ ہمارے ہر کام کا وقت مقرر ہو چکا اور وہ اُس مقررہ وقت پر ہو جائے گا تب رب ہماری خواہشات سے بھی بہتر کرے گا کیونکہ وہ بہت مہربان ہے۔ تب ہمیں کسی صاحبِ دُعا کے پاس جانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی بس تھوڑا سا اپنے رویوں کو Develop کرنے کی ضرورت ہے۔

اگر آپ کو صاحبِ دُعا کی ذاتی زندگی دیکھنے کا اتفاق ہو جائے تو آپ کانوں کو ہاتھ لگائیں گے۔ جتنے بھی

اولیائے کرام گزرے ہیں اُن کے ساتھ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو کام ایک دن میں ہو سکتا ہے اُن کے وہی کام سالوں میں ہوتے ہیں۔ اللہ اپنے دوستوں کو طرح طرح کے جھٹکے دیتا ہے۔ مثلاً اگر کسی فقیر نے غلطی سے اپنے گھر میں کہہ دیا کہ آج میرا دل فلاں چیز کھانے کو چاہ رہا ہے تو وہ چیز گھر میں پک تو جائے گی لیکن عین وقت پر ایا تو مہمان آ جائیں گے جن کو وہ کھانا کھلا دیا جائے گا یا فقیر کو کہیں جانا پڑ جائے گا۔ وہ اپنی پسندیدہ چیز نہیں کھا پائے گا۔ اِسی طرح اگر اُسے کوئی کپڑا پسند آ گیا تو رب اُسے وہ کپڑا خریدنے تو دے گا لیکن جب وہ سوٹ سل کر آئے گا تو استری سے جل جائے گا یا اُس پر کوئی چیز گر جائے گی۔ یوں وہ لباس ضائع ہو جائے گا۔ فقیر کو اگر کوئی جوتا پسند آ جائے تو کبھی ایک ایک سال تک وہ Colour یا سائز نہیں ملے گا۔ جب وہ جوتا ڈھونڈتے ڈھونڈتے اُس Point پر آ جائے گا کہ رب سے کہے گا "ٹھیک ہے نہیں لینے دیتا جوتے تو نہ لینے دے، میں اب ننگے پاؤں ہی پھر لوں گا۔" تو ایک کے بجائے تین تین جوتے مل جائیں گے۔

رب تعالٰی فقیروں کے ساتھ ایسے کھیل کھیلتا ہی رہتا ہے لیکن وہ پھر بھی مسکراتے اور سیٹی بجاتے پھرتے ہیں۔ اگر ہم اپنے اندر سے یہ دو چیزیں ختم کر دیں کہ جو انتظار اور صبر ختم ہو گیا ہے اُسے واپس لے آئیں اور دوسری یہ بات یاد رکھیں کہ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے اور اُسے اپنا مقررہ وقت پر ہی ہونا ہے، تب ہمیں کسی دُعا کرنے والے کے پاس جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

سوال: سائنس کے نظریہ Big Bang اور قرآن کے نظریہ تخلیق کائنات میں کیا مطابقت اور مشابہت ہے؟

جواب: سائنس تخلیق کائنات کو ایک حادثہ مانتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ کسی وجہ (وجہ بیان کرنے سے سائنس قاصر ہے) سے ایک عظیم دھماکا Big Bang ہوا جس کے نتیجے میں مختلف چیزیں بکھریں اور Principle of gravity کے تحت فضا میں گردش کرنے لگیں۔ یوں یہ کائنات، سورج، چاند، ستارے، زمین وغیرہ وجود میں آ گئے۔ ایک دوسرے کی کششِ ثقل سے فرار اور اپنی اپنی کشش کے تحت یہ اپنے اپنے Orbit میں گھومتے رہتے ہیں۔

چونکہ یہ گھوم رہے ہیں اِس لیے Centrifugal force کے ذریعے اِن میں ایک دوسرے سے دُور رہنے (To get away from each other) کی Tendency ہے۔ جب کہ Gravitation force اِن کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ یوں Centrifugal force اور Gravitational force برابر (Equal) ہو گئیں جس کی وجہ سے یہ کائنات Orbit پر قائم ہے۔ قرآن کہتا ہے جب کچھ نہیں تھا تو رب تھا، اُس کے فرشتے تھے۔ رب نے چاہا کہ میں کائنات تخلیق کروں۔ اُس نے "کُن" کہا اور یہ کائنات وجود میں آ گئی۔ یہ حادثہ نہیں ہے کہ تمام Planets اپنے اپنے مقررہ راستے پر گھوم رہے ہیں بلکہ یہ اُس Delicate balance کے نتیجے میں گھوم رہے ہیں جو رب تعالٰی نے قائم کیا ہے البتہ قیامت کے روز یہ آپس میں ٹکرا جائیں گے۔ رب کے ہاں اِس کا وقت مقرر ہے۔

سائنس اور قرآن کے نظریۂ کائنات میں بنیادی فرق یہ ہے کہ سائنس اِسے حادثہ کہتی ہے۔ رب کہتا ہے یہ میری مرضی اور خواہش تھی۔

مشابہت یہ ہے کہ سائنس بھی مانتی ہے کہ یہ اپنے اپنے مدار میں گردش کر رہے ہیں، ایک دوسرے سے ٹکراتے نہیں نہ ایک دوسرے سے دور ہٹتے ہیں۔ رب بھی یہی کہتا ہے کہ میں نے انھیں ایک مقررہ راستے پر قائم کر رکھا ہے اور یہ اس میں چلتے رہتے ہیں۔

یہ جو میں Centrifugal force اور Gravitational force کی بات کر رہا تھا، اس کو ہوائی جہاز کی مثال کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔ جب ہوائی جہاز ہوا میں کھڑا ہو تو زمین کی Gravitational force اُسے اپنی طرف کھینچتی ہے۔ جیسے کوئی بھی چیز اگر فضا میں چھوڑ دی جائے تو وہ نیچے زمین پر آ جاتی ہے۔ جہاز کو بھی اُصولی طور پر نیچے آ جانا چاہیے۔

انسان نے جب ہوائی جہاز بنانے پر غور و فکر کیا تو اُس نے پرندے سے Idea لیا کہ کس طرح وہ بغیر کسی سہارے کے ہوا میں معلق رہتا ہے۔ غور کرنے پر پتا چلا کہ پرندہ ہوا میں اُڑتے وقت اپنے Wing (پَر) کی پوزیشن تبدیل کرتا رہتا ہے جس سے اُس کی اُڑان میں تبدیلی آ جاتی ہے۔

پرندے کو Study کرنے کے بعد انسان نے ہوائی جہاز کے Wing بنائے۔ جب جہاز رن وے پر دوڑتا اور سپیڈ Gather کرتا ہے تا کہ اُس کے پروں کے نیچے اور اُوپر ہوا کا ایک خاص رفتار سے Flow آ جائے تو پائلٹ ہوائی جہاز کو زمین سے اُٹھانے کے لیے اندر سے Flaps کو Lower کر دیتا ہے تب پیچھے Wing کے اندر سے Flaps باہر کو نکلتے ہیں، کاک پٹ میں اُن کی ڈگریز Mark ہوتی ہیں۔ جیسے Seven degrees، Fifteen degree یا Forty-five degrees پر وہ ان کو Lower کرتا ہے۔

جہاز کے دوڑنے سے سامنے سے انجن کے زور پر ہوا آتی ہے۔ پائلٹ نے جو Flap قدرے نیچے (lower) کیا ہوتا ہے اُس سے ٹکرا کر یہ ہوا Wing کے نیچے اکٹھی ہو جاتی ہے۔ اوپر سے جو ہوا گزر رہی ہوتی ہے وہ Wing کو نیچے کو دبا رہی ہوتی ہے۔ Flap کے نیچے آ جانے سے جب یہاں ہوا زیادہ اکٹھی ہو جاتی ہے تو وہ ہوا اُوپر سے دبانے والی ہوا سے زیادہ طاقت ور ہو جاتی ہے یوں جہاز ہوا میں لفٹ (Lift) ہو جاتا ہے۔ جب وہ اوپر چڑھ رہا ہوتا ہے تو وہ Flaps کو Lower حالت میں رکھتا ہے۔

Wing کے نیچے سے جو ہوا اُسے اُوپر کو Lift کر رہی ہوتی ہے اُسے Aviation کی زبان میں "Lift" کہتے ہیں اور اُوپر سے جو ہوا Wing کو دبا رہی ہے اُسے Drag کہتے ہیں۔ پائلٹ Lift کو Drag سے بڑھا لیتا ہے۔ یہ سب انسان نے پرندہ سے سیکھا۔

اِسی طرح پرندے کو مڑنا ہو تو اُسے جس سمت میں مڑنا ہو اُس حساب سے اُس کی دم کی پوزیشن تبدیل ہو جاتی ہے۔ اب ہوتا یہ ہے کہ جب پرندہ اُڑ رہا ہوتا ہے۔ تو وہاں ہوا کا Flow ہوتا ہے۔ یہ Flow اُس کی دُم کی اُٹھی ہوئی سائیڈ کو دباتا ہے اور یوں وہ پرندہ دوسری سمت میں مڑ جاتا ہے۔ جہاز میں ریڈار بنا کر Exactly اِسی Principle (اُصول) پر اُس سے کام لیا گیا۔

سیاروں کے Space میں معلق ہونے کے پیچھے بھی یہی اُصول کار فرما ہے۔ جس طرح Lift اور Drag میں تبدیلی آنے سے جہاز اُوپر اُٹھے گا یا نیچے کو آئے گا جب کہ اُن کے equal رہنے سے جہاز Level فلائٹ میں رہتا ہے۔

اسی طرح سیاروں کی Centrifugal force اور Gravitational force کے Equal ہونے سے سیارے اپنے اپنے Orbit میں قائم ہیں۔ آپ بڑا پتھر کسی رسی سے باندھیے اور اُسے پکڑ کر گھمائیے۔ ابتدا میں وہ پتھر زمین کی طرف لٹک رہا ہوگا لیکن جوں جوں گھماتے جائیں گے وہ Lift ہونا شروع ہو جائے گا۔ حالانکہ پتھر کو اُٹھانے (Lift) والی کوئی چیز نہیں۔ دراصل یہ Centrifugal force ہے جو اُسے دُور پھینک دینا چاہتی ہے لیکن چونکہ رسی اِس گھومتے پتھر کو تھامے ہوئے ہے اِس لیے یہ پتھر اپنے مدار میں گھومتا رہتا ہے۔ لیکن جونہی آپ اپنے ہاتھ کی طاقت کم کر کے رفتار آہستہ کریں گے وہ پتھر Lower ہونا شروع ہو جائے گا۔

تو یہی ایک مشابہت ہے۔ رب نے بھی فرمایا کہ میں نے Planets کو میزان پر قائم کیا ہے۔ وہ میزان یہی ہے کہ ہر Planet کے لیے Centrifugal force اور Gravitational force برابر (Equal) ہے جس کی وجہ سے ہر Planet اپنے اپنے Orbit (مدار) میں گھومتا رہتا ہے۔

سوال: واقعۂ معراج کی تشریح سائنس و عقل سے کیسے کی جا سکتی ہے؟ روشنی ایک سیکنڈ میں تین لاکھ کلومیٹر اور ایک سال میں نو کھرب کلومیٹر کا فاصلہ طے کرتی ہے۔ سائنس کے مطابق ہماری کائنات کا سائز روشنی کے تقریباً 15 کھرب میل پر مشتمل ہے۔ سائنس ابھی پہلے آسمان تک رسائی حاصل نہیں کر سکی۔ پہلا آسمان سائنس کے دریافت کردہ آسمان سے کھربوں میل اُوپر ہے۔ آپ ﷺ رات کے کچھ حصے میں زمین سے لے کر ساتویں آسمان پر جا کر واپس آ گئے۔ اگر آپ ﷺ کی رفتار روشنی کی رفتار کے برابر یا اِس سے تیز بھی ہوتی تو بھی آپ ﷺ کو ساتویں آسمان پر جانے اور واپس آنے میں کھربوں برس کا وقت درکار تھا۔ سائنسی نقطۂ نظر سے سفرِ معراج کی وضاحت فرما دیجیے۔

جواب: تھوڑی سی Correction کر لیجیے۔ آج سے چھ سات سال پہلے تک یہ بات بالکل درست تھی کہ روشنی کی رفتار سب سے زیادہ ہے۔ پھر سائنس دانوں نے وہ Rays دریافت کر لیں جن کی رفتار روشنی سے ڈیڑھ گنا زیادہ ہے۔ یہ ابھی ابتدا ہے لیکن یہ Milestone یہ Prove کر دیتا ہے کہ کائنات میں روشنی سے بھی کہیں زیادہ تیز سفر کرنے والی Rays موجود ہیں۔ وہ دن دُور نہیں جب یہ ثابت ہو جائے گا کہ روشنی سے کئی لاکھ گنا تیزی سے Travel کرنے والی Rays بھی موجود ہیں جو رب کی تخلیق کردہ ہیں۔ تب سفرِ معراج کی حقیقت بھی واضح ہو جائے گی۔

اس کی ایک مثال آپ کو یہ دیتا ہوں کہ ابدال روحانیت کا بڑا Early stage ہے۔ ہر فقیر اس سے گزرتا ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں مختلف جگہوں پر دیکھا جا رہا ہوتا ہے۔ برازیل میں ایک ایسی چیونٹی کا پتا چلا جس پر 25 سال پہلے تجربات ہونے کے بعد یہ ثابت ہوا کہ باوجود رکاوٹوں کے یہ ایک سے دوسری جگہ شفٹ ہو جاتی ہے۔ سائنس دانوں نے شیشے کا بیکر لے کر چیونٹی کو رنگ کرنے کے بعد اُس میں رکھ دیا اور اُس کا مشاہدہ کرنے لگے۔ اُن کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ چیونٹی بیکر سے غائب ہو گئی اور کچھ فاصلے پر موجود ایک میز پر پائی گئی حالانکہ بیکر میں کہیں کوئی سوراخ نہیں تھا۔

سائنس دانوں نے یہ تجربہ بار بار کیا اور ہر بار یہی نتیجہ نکلا۔ اس پر Paper پڑھے گئے۔ Presentations ہوئیں حتیٰ کہ اِس تھیوری کو تسلیم کر لیا گیا۔ ابدال کا قصہ اِس چیونٹی نے Prove کر دیا کہ جب ایک چیونٹی ایک بند جگہ سے دوسری جگہ شفٹ ہو سکتی ہے تو انسان تو زمین پر رب کا نائب اور خلیفہ ہے، احسن تقویم ہے۔ وہ بھی ایک وقت میں مختلف مقامات پر موجود ہو سکتا ہے اور آپ ﷺ تو امام الانبیاء اور محبوب ہیں۔ آپ ﷺ بھی جسمانی طور پر عرش بریں پر شفٹ کیے جا سکتے ہیں۔ چیزیں Exist کرتی ہیں۔ ایک روز سائنس یہ حقیقت بھی دریافت کر لے گی۔

عمل سے زندگی

ہم زندگی میں وسائل کم ہو جانے کے خدشے کا شکار رہتے ہیں۔ گزشتہ 30 سال سے ہم میں یہ تبدیلی آہستہ آہستہ آئی ہے کہ ہم فاقہ اور بھوک سے بہت ڈرتے ہیں۔ اِس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ ہم کسی بھی ایسے ٹھکانے پر چلے جائیں جہاں اللہ کا کوئی نیک بندہ خلقِ خدا کے لیے دُعا کر رہا ہو، وہاں اگر ہم خاموشی سے کونے میں سر نیچے ڈال کر بیٹھ جائیں اور لوگوں کے سوال (جو وہ صاحب دُعا سے کرتے ہیں) سنیں تو اُن سوالوں کے بیک گراؤنڈ میں یہی خدشہ ملے گا کہ کہیں میرے وسائل کم تو نہیں ہو جائیں گے، چھن تو نہیں جائیں گے۔

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ آپ ﷺ جن کے ہم اُمتی بھی ہیں اور عاشق بھی نے کبھی مسلسل تین دن روٹی میسر نہیں ہوتی تھی۔

......حضرت عائشہؓ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے کبھی مسلسل تین دن پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ (شمائل ترمذی)

......حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ کی وفات تک حضور ﷺ کے اہل وعیال نے مسلسل دو دن کبھی جو کی روٹی سے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ (شمائل ترمذی)

مختلف مواقع پر آپ ﷺ کے فرامین کا مفہوم ہے کہ بھوکا پیٹ اللہ کی قربت اور معرفت کا باعث بنتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی فرمایا تھا کہ بھوکا رہ کر رب کی معرفت حاصل ہو گی۔ ایک بلند پایہ ولی اللہ کا قول ہے "میں یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ رات کو ایک نوالہ کم کھاؤں بجائے اس کے کہ میں ساری رات نماز پڑھتا رہوں۔"

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے جس کا مفہوم ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "پیٹ کے ایک تہائی حصے کو کھانے سے بھرو، ایک تہائی کو پانی سے جب کہ ایک تہائی کو خالی رکھو۔"

......ترمذی و ابن ماجہ نے مقدام بن معدیکربؓ سے روایت کی، کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ "آدمی نے پیٹ سے زیادہ بُرا کوئی برتن نہیں بھرا۔ ابن آدم کو چند لقمے کافی ہیں جو اُس کی پیٹھ کو سیدھا رکھیں۔ اگر زیادہ کھانا ضروری ہو تو تہائی پیٹ کھانے کے لیے اور تہائی پانی کے لیے اور تہائی سانس کے لیے۔ ("سنن الترمذی"، کتاب الزھد، باب ماجاء فی کراھیۃ کثرۃ الاکل، حدیث: 2387، ج4، ص168)

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا "جو پیٹ بھرا ہوا ہوتا ہے اُس سے معرفت کا نور نکل جاتا ہے۔"

اگر ہم آپ ﷺ کی زندگی دیکھیں تو وہاں نہ صرف وسائل اِنتہائی کم دکھائی دیتے ہیں بلکہ لوگوں کی طرف سے تنگ کیا جانا بھی بہت فراوانی سے نظر آتا ہے۔ جس چیز سے ہم خوف زدہ رہتے ہیں وہی ہمیں آپ ﷺ کی زندگی میں نہ صرف کثرت سے نظر آتی ہے بلکہ آپ ﷺ نے اُس سے پیار بھی کیا۔ آپ ﷺ اکثر و بیشتر نماز کے بعد یہ دعا فرمایا کرتے

آپ ﷺ اکثر و بیشتر نماز کے بعد یہ دعا فرمایا کرتے "یا اللہ! مجھے قیامت کے روز مساکین میں سے اُٹھانا۔"

......سیدنا انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ دعا کی "اے اللہ! مجھے مسکینی کی حالت میں زندہ رکھ، مسکینی کی حالت میں وفات دے اور قیامت کے دن مسکینوں کی جماعت میں اُٹھا۔" سیدہ عائشہؓ نے عرض کی "یہ دعا کیوں؟" فرمایا "بے شک وہ اغنیاء سے چالیس سال قبل جنت میں داخل ہوں گے۔" (جامع ترمذی، حدیث 2352)

جب کہ ہم بھوک سے بھی ڈرتے ہیں اور مالی وسائل کی کمی سے بھی اور یہ خواہش بھی رکھتے ہیں کہ ہمیں ہر جگہ VIP treatment ضرور ملے۔ ہم مساکین میں سے نہیں ہونا چاہتے لیکن پھر بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم آپ ﷺ سے بہت پیار کرتے ہیں۔

انسان جس سے پیار کرتا ہے اُسے رول ماڈل بنا لیتا ہے، اپنی عادات کو اُس کی عادات کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ اُس کی چھوٹی سے چھوٹی کہی ہوئی بات کو پورا کر کے خوشی محسوس کرتا ہے لیکن کیسی عجیب بات ہے کہ میں پیار کے دعویٰ کے باوجود آپ ﷺ کی سنت کے برعکس عمل کرتا ہوں۔ میں زندگی فرعون اور عاقبت موسیٰ علیہ السلام کی چاہتا ہوں۔

میں کہتا تو یہ ہوں کہ میرا رب بہتر جانتا ہے کہ میرے لیے کیا اچھا ہے اور کیا بُرا۔ میرا رب جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ لیکن چاہتا میں یہ ہوں کہ رب وہ کرے جو میرے دل میں خواہش ہے۔ میں کہتا تو یہ ہوں کہ میرے رب نے ہر کام کا وقت مقرر کیا ہے اور وہ مقررہ وقت پر ہو جائے گا لیکن چاہتا میں یہ ہوں کہ جس لمحے میرے دل میں کوئی خواہش پوری ہو اُس سے اگلے ہی لمحے وہ پوری بھی ہو جائے۔ جب میرا کام حسب خواہش اگلے ہی لمحے نہیں ہوتا تو میں صاحب دُعا کے پاس جا کر کہتا ہوں کہ دُعا کر دیجیے میرا کام میری چاہت اور خواہش کے مطابق فی الفور ہو جائے۔ گویا میں رب کے حضور سفارشیں پہنچانے لگتا ہوں کہ میرا یہ کام کر دے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کہیں میرے دل یا دماغ کے کسی کونے میں یہ بات چھپی ہے کہ جو میں چاہ رہا ہوں وہی بہتر ہے۔ یوں میں اپنے ایمان کی نفی کر رہا ہوتا ہوں۔

مجھ پر اگر ذرا سی مشکل یا تنگ دستی آ جائے تو میں صبح سے شام تک بجائے اُس تنگ دستی اور مشکل سے محنت اور صدقہ وخیرات کے ذریعے لڑنے کے مختلف دُعا کرنے والوں کے پاس بھاگا جاتا ہوں کہ دُعا کریں میری یہ تنگ دستی اور مشکل فوری طور پر دور ہو جائے۔

کبھی کبھار میں خود یہ رویہ دیکھ کر حیران ہوتا ہوں کہ جب رب تعالیٰ نے مجھے فراخی عطا کی اور سکھ میں رکھا تو کیا تب کسی دُعا کرنے والے کے پاس جا کر میں نے کہا ذرا دیکھ کر بتایئے مجھ پر کس نے جادو کیا ہے کہ میں اِتنے سکھ میں ہوں۔ لیکن ذرا دُکھ آنے پر میں صاحبانِ دُعا کے پاس جا کر پوچھتا ہوں کہ کسی نے مجھ پر جادو یا تعویذ تو نہیں کر دیے کہ جو میں اِتنا تنگ دست ہو گیا ہوں؟

ایک روز بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ میری زندگی کا زیادہ سے زیادہ دس فی صد ایسا حصہ ہو گا جب میں مشکلات اور مصائب کا شکار رہا لیکن باقی زندگی کے 90 فی صد حصے کے لیے بھی میں نے کبھی رب کا شکر ادا نہیں کیا کہ جس میں رب نے مجھے وسیع رزق عطا فرمایا۔ میں نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ اُس عطا کردہ رزق میں سے کچھ حصہ یہ کہہ کر کسی Less fortunate کو دے دوں کہ یہ میرا نہیں تمھارا ہے اور اگر وہ شکریہ ادا کرنے لگے تو میں خوش دلی سے کہہ سکوں کہ بھائی یہ میرا نہیں تمھارا مال ہے۔ اِس پر تمھارا بھی اُتنا ہی حق ہے جتنا میرا۔ لیکن میں آج تک نہ ایسا کر سکا، نہ کہہ سکا۔

ایک روز ایک صاحب گاڑی کا شیشہ Knock کر کے ایک روپیہ مانگ رہے تھے۔ میرے دل میں خیال آیا کہ میں اپنی محنت کی کمائی اِسے کیوں دوں۔ جب میں وہاں سے چلا آیا تو راستے میں ذہن میں ایک سوچ آئی کہ کبھی میں نے اِس بات پر غور نہیں کیا کہ یہ مال تو اللہ کا دیا ہوا ہے...... یہ تو میرا ہے ہی نہیں۔ مجھ سے کہیں زیادہ محنتی، عقل مند، ہنر مند اور تعلیم یافتہ لوگ جوتے چٹخاتے پھرتے ہیں۔ اگر صرف محنت سے ہی سب کچھ ملتا ہوتا تو مجھ سے زیادہ محنت کرنے والے لوگ مجھ سے زیادہ مال دار اور خوش حال ہوتے۔ یہ تو رب تعالیٰ کی نظرِ عنایت ہے کہ اُس نے مجھے خوشحال کر دیا۔

سوال: ہمارے رویے غیر مستقل مزاجی کا شکار ہیں۔ ہم خدا کے ساتھ تعلق میں کبھی تو احساس کی اُس منزل پر ہوتے ہیں کہ صرف وہی نظر آتا ہے، سارے راستے روشن دکھائی دیتے ہیں لیکن پھر حالت بدل جاتی ہے اور ہم دُنیا میں مگن ہونے لگتے ہیں۔ نیکی میں مستقل مزاجی کا حصول کیسے ممکن ہے؟

جواب: آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ خلافِ فطرت دُعائیں قبول نہیں ہوتیں جب کہ یہ بھی آپ ﷺ ہی کا فرمان ہے کہ دُعا سے تقدیر بدل جاتی ہے۔ اِن دونوں باتوں کو ساتھ رکھ کر دیکھیں تو بات سمجھ میں آ جائے گی۔

انسان کا اپنا ایک مزاج، فطرت اور عادات ہیں۔ اُس کی سوچ کا تعلق تعلیم نہیں بلکہ تربیت سے ہے۔ انسان کا مزاج اُس کی سوچ کے ساتھ ساتھ بدلتا ہے۔

ابھی بات ہو رہی تھی کہ اگر پیٹ بھرا ہو تو اُس سے معرفت کا نور نکل جاتا ہے۔ جب کسی وجہ سے ہماری سوچ میں تبدیلی آئے گی اور ہماری توجہ ہٹ جائے گی اور ہم گناہ کی طرف زیادہ راغب ہونے لگیں گے اور رب کی طرف ہمارا رُجوع کم ہونے لگے گا تو ہم عبادت تو کر رہے ہوں گے لیکن ہماری سوچ کہیں اور ہو گی۔ زبان کی نوک پر تو اللہ کا ذکر ہو گا دل میں نہیں، جس سے عبادت میں خشوع و خضوع ختم ہو جائے گا اور راستے اندھیر دکھائی دینے لگیں گے۔ روشنی نظر نہیں آئے گی۔

یاد رکھیے! مزاج کی تبدیلی انسانی فطرت میں ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا "ہم لوگوں کے درمیان دنوں کو پھیرتے رہتے ہیں۔" انسان کا مزاج اور سوچ کا محور کبھی ایک جیسے نہیں رہتا، یہ دونوں بدلتے رہتے ہیں۔ اِن کے بدلنے سے خشوع و خضوع میں کمی یا زیادتی ہوتی رہتی ہے جس سے انسان اُس کیفیت کا شکار ہو جاتا ہے جسے آپ نے غیر مستقل مزاجی کا نام دیا ہے۔ Consistency (مستقل مزاجی) ایک بالکل مختلف رویے کا نام ہے۔

اگر ہم خشوع و خضوع نہ ہونے کے باوجود معمول کے مطابق عبادت کرتے رہیں تو یہ مستقل مزاجی ہے۔ اگر عبادات کی تعداد یا مقدار کو کم کر دیں یا کبھی چھوڑ دیں تو یہ غیر مستقل مزاجی ہے۔

Self-confidence اور مستقل مزاجی کے لیے تیر بہدف نسخہ یہ ہے کہ سورۃ البقرۃ کے پہلے پانچ رکوع کثرت سے پڑھ لیے جائیں۔ جتنی کثرت سے کوئی شخص پڑھے گا۔ اُسی قدر اُس میں مستقل مزاجی بڑھ جائے گی اور Self-confidence میں اضافہ ہو گا۔

سوال: اکثر سلسلہ ہائے تصوف میں آیت کریمہ بطور ورد پڑھنے کے لیے دی جاتی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام اور حواؑ کی دُعا ربنا ظلمنا انفسنا...... پڑھنے کے لیے کیوں نہیں دی جاتی؟

جواب: تین سلاسل چشتیہ، جنیدیہ اور قادریہ میں میرا دخل رہا اور مجھے خلافت عطا ہوئی۔ سلسلہ چشتیہ میں مجھے آیت کریمہ پڑھنے سے یہ کہہ کر منع کر دیا گیا کہ یہ تمھیں Suit نہیں کرتی۔ اور مجھے پڑھنے کے لیے ایک حرف عطا کر دیا گیا۔ سلسلہ قادریہ میں بھی 34 سال پہلے ایک لفظ عطا ہوا تھا جو آج تک اُسی طرح پڑھ رہا ہوں۔ 28 سال پہلے سلسلہ جنیدیہ سے جو لفظ عطا ہوا تھا وہ بھی آج تک ویسے ہی پڑھ رہا ہوں۔ میرے علم میں نہیں ہے کہ کسی سلسلۂ تصوف میں آیت کریمہ پڑھنے کو دی جاتی ہے۔ آیت کریمہ دراصل دُعا ہے جو حضرت یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ میں کی تھی۔

سوال: ایسا کوئی ذکر بتا دیجیے جو ہماری رُوح کے Controlling word سے Clash نہ کرتا ہو اور جسے ہم سارا دن پڑھ سکیں۔

جواب: ہر حرف، لفظ اور آیت (دُنیاوی زبان میں "فقرہ") کا ایک خاص وزن اور اثر ہے۔ بنیادی طور پر وزن اور اثر حرف کا ہے۔ حروف کے مجموعے سے لفظ بنتا ہے اور لفظوں کے مجموعے کو آیت کہا جاتا ہے۔ اگر ہم آیت کریمہ لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین کو حروف کی صورت میں Analyse کریں تو اِس میں پہلا لفظ "لا" دو حروف "ل" اور "الف" کا مجموعہ ہے اور یہ دونوں حروف ہی حروفِ مقطعات ہیں۔

الفاظ کے وزن اور اثر کا اِنحصار اِس بات پر ہے کہ کوئی لفظ کن حروف پر مشتمل ہے۔ ہم بطور ذکر کوئی بھی لفظ، آیت یا سورہ پڑھیں اُس کا اثر آئے گا۔

وظیفہ کیا ہے......؟ کسی بھی ذکر کو ایک وقتِ مقررہ پر مقرر تعداد میں باقاعدگی کے ساتھ ادا کرنے کو وظیفہ کہتے ہیں۔ ہم روزانہ ایک مقررہ وقت پر دفتر جاتے اور واپس آتے ہیں۔ یہ ہماری روزی کا وظیفہ ہے۔ کوئی بھی ذکر جسے ہم پابندی سے کریں گے اُس کے اثرات ہماری Anatomy، فطرت، مزاج اور عادات پر مرتب ہوں گے۔ اُن سے مفر ممکن ہی نہیں۔ اللہ تک پہنچنے کا سب سے Safe، اعلیٰ راستہ اور Shortcut یہ ہے کہ قرآن پاک کی کثرت سے تلاوت کر لی جائے۔ ہمارے لیے مشکل یہ ہے کہ جاب پر ہر وقت قرآن پاک کھول کر سامنے نہیں رکھ سکتے۔ لیکن خوش قسمتی سے ہر مسلمان کو کچھ نہ کچھ سورتیں ضرور یاد ہوتی ہیں۔ ہم کام کے دوران دل میں وہ سورتیں پڑھتے رہیں۔ کسی بھی ورد یا وظیفہ کے بجائے یہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا Shortcut ہے اور بڑے فائدے کا سودا بھی۔

سوال: کیا ذوالقرنین اور یاجوج ماجوج کا تعلق کسی دوسرے Planet سے تھا؟

جواب: ذوالقرنین کی Journeys (سفر) Inter-planet نہیں تھیں بلکہ اِسی کرۂ ارض پر تھیں۔ یاجوج ماجوج بھی اِسی Planet پر تھے۔

سوال: ایک قول ہے "بے ادب کا سچ کفر اور باادب کا جھوٹ بھی ایمان ہوتا ہے۔" ہم اِس سے کیا سیکھ سکتے ہیں؟

جواب: بدقسمتی سے میرے علم میں یہ قول نہیں ہے۔ میں تو سیدھے سادے ایمان کا آدمی ہوں۔ سچ کافر بھی بولے تو سچ اور جھوٹ مومن بھی بولے تو جھوٹ ہے۔

ادب یا بے ادبی سے نہ سچ کی اصلیت بدل سکتی ہے نہ جھوٹ کی۔ میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ سچ سچ ہی رہے گا اور جھوٹ جھوٹ ہی رہے گا۔

ہم اِس سے کیا سیکھ سکتے ہیں؟

ادب اور بے ادبی کے حوالے سے مشہور Saying ہے "باادب بانصیب بے ادب بے نصیب۔" نصیب سے مراد تقدیر نہیں بلکہ یہ ہے کہ باادب شخص جس کے پاس بھی جائے گا اپنے ادب، Good manners اور اچھے Etiquette کی وجہ سے دوسروں کے دل میں گھر کر لے گا۔ اور جس کے دل میں آپ کے لئے جگہ بن گئی وہ آپ کو کچھ بھی دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ صاحبِ علم کے نزدیک سب سے عزیز شے علم ہے۔ اس لیے وہ آپ کو علم دے گا اور جسے علم مل گیا اُسے فہم و فراست عطا ہو گئی اور جسے فہم و فراست عطا ہو گئی اُس کی دُنیا و آخرت کی زندگی سنور گئی۔

جو بے ادب ہیں، جنھیں زبان پر قابو نہیں ہوتا، اُنھیں کوئی اپنے قریب نہیں آنے دیتا۔ یوں وہ کچھ نہیں سیکھ پاتے اور بے نصیب رہتے ہیں۔

ہم نے کچھ نہ بھی سیکھنا ہو لیکن اگر ہمارے آداب، Manners اور Etiquette اچھے ہیں تو ہم پسندیدہ انسان بن جائیں گے۔ ہر آدمی ہمیں بہت چاہت سے ملے گا۔

دو روز پہلے میں اپنے بیٹے سے بات کر رہا تھا کہ رُوحانیت اور دیگر علوم تو میں نہ سیکھ سکا لیکن جادو کے ایک ایسے لفظ سے میری واقفیت ہو گئی جو کھل جا سم سم کا نعم البدل ہے اور وہ ہے "سر"۔

جب ہم کسی کو "سر" کہہ کر پکارتے ہیں تو وہ خوامخواہ متوجہ ہو جاتا ہے اور مجھ جیسا کم ظرف تو سارے کام چھوڑ کر کہے گا "جی فرمائیے"۔ کام نہیں بھی کرنا ہو گا تو بھی کر دوں گا۔

ہمارے کچھ Colleagues جو بہت تیزی سے ترقی کر گئے اُن کا کمال یہ تھا کہ وہ Sentence کے شروع میں بھی اور آخر میں بھی "سر" لگاتے تھے۔ اُن میں سے کچھ Colleagues کو میں نے اُن کے Seniors کے سامنے کبھی یہ کہتے نہیں سنا "رائٹ سر"، "ٹھیک سر"۔ وہ ہر بات کے جواب میں صرف "سر" کہتے تھے اور پھر وقت نے دکھایا کہ وہ بہت تیزی سے آگے نکل گئے۔

"سر" محض جادو کا لفظ ہی نہیں بلکہ ادب کا مظہر بھی ہے۔ جب آپ دوسرے کا ادب کرتے ہیں، اُس کو عزت دیتے ہیں تو کامیابی اور نصیب کے دروازے آپ کے لیے کھل جاتے ہیں۔

سوال: قربانی دینے والے شخص کے لیے مستحب ہے کہ وہ ذی الحجہ کا چاند دیکھنے کے بعد بال نہ کٹوائے اور ناخن نہ تراشے۔ اِس حکم کی وجہ کیا ہے؟

جواب: علما نے قربانی کو اسلام کی 23 ویں اور حج کو 22 ویں رُوح قرار دیا ہے۔ حج میں احرام باندھ لینے کے بعد ہم نہ چہرے پر کپڑا لگاتے ہیں، نہ بال توڑتے ہیں، نہ کہیں پر کوئی زخم لگاتے ہیں۔ اسی طرح دورانِ احرام حکم ہے کہ اپنی کھال نہ چھیدو، بال نہ کٹواؤ، ناخن نہ تراشو، فصد نہ کھلواؤ، جونکیں نہ لگواؤ۔ قربانی حج ہی کا ایک رُکن ہے اس لیے جو لوگ حج کے لیے نہیں جا سکتے لیکن قربانی کرتے ہیں وہ احرام کی اِن شرائط کی پابندی کر لیتے ہیں۔

سوال: کیا نمازِ عیدالاضحیٰ سے پہلے قربانی کی جا سکتی ہے؟

جواب: قربانی کے لیے شرط یہ ہے کہ نمازِ عید ادا کرنے کے بعد کی جائے۔

سوال: کیا کسی شخص کی تاریخ پیدائش کے اعداد اور نام کے اعداد کی مطابقت اُس شخص کے لیے خوش قسمتی یا بدقسمتی کا موجب ہو سکتی ہے؟ کیا نام تبدیل کرنے سے انسان کی خوش قسمتی پر اثر پڑتا ہے؟

جواب: بطور مسلمان میرا ایمان ہے کہ میری تمام باگ ڈور میرے رب کے ہاتھ میں ہے۔ رب کے فرمان کے مطابق مقدور بھر کوشش کرنا میرا فرض ہے کیونکہ یہ دُنیا Cause and effect کی ہے۔ یہاں کامیابی کوششوں سے مشروط ہے۔ کوشش کے ساتھ ساتھ مدد اور کامیابی کی درخواست رب کے حضور ضرور کی جائے۔

کون سے ایام سعد ہیں اور کون سے نہیں ...... یہ مسلمان کا ایمان نہیں ہے۔ مسلمان کے نزدیک تو سب ایام اور گھڑیاں رب تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہیں۔ کامیابی یا ناکامی دینا رب کے اختیار میں ہے۔ مسلمان کا ایمان یہی ہونا چاہیے کہ نہ کوئی سعد گھڑی میرا کچھ سنوار سکتی ہے نہ نحس گھڑی کچھ بگاڑ سکتی ہے، جب تک میرا رب ایسا نہ چاہے۔

دیگر علوم Mathematics، الجبرا، سائنس اور جغرافیہ کی طرح علم الاعداد بطور علم تو موجود ہے لیکن میرا یہ ایمان نہیں کہ یہ علم انسان کی خوش قسمتی میں کمی یا اضافہ کرسکتا ہے۔

جہاں تک ناموں کا تعلق ہے۔

......اُم المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اچھوں کے نام پر نام رکھواور اپنی حاجتیں اچھے چہرہ والوں سے طلب کرو۔ (مسند الفردوس للدیلمی، حدیث 2329)

ناموں کے اثرات یقیناً شخصیت پر مرتب ہوتے ہیں لیکن یہ نام قسمت بدل دیتے ہیں یا کامیابی وناکامی کا موجب ہوسکتے ہیں، ایسا سوچنا درست نہیں۔

کامیابی اور ناکامی سب من جانب اللہ ہیں لیکن رب تعالیٰ سے ہمیشہ اچھا گمان رکھنا چاہیے کیونکہ وہ خود فرماتا ہے کہ مجھ سے اچھے گمان رکھو میں اچھا ہی کروں گا۔

آپ اِن علوم کو بطور علم تو Study کرلیجیے لیکن اِن پر ایمان نہ رکھیے گا۔ یہ مسلمان کو منع ہے۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ سخی سلمان نوری حضوری بھلوالی رحمۃ اللہ علیہ نے نوشو پاک کی سات پشتیں ولی کردی تھیں۔ کیا ایسا ممکن ہے؟ سخی سلمان رحمۃ اللہ علیہ کس سلسلۂ تصوف سے تعلق رکھتے تھے؟

جواب: حضرت سخی سلمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت بلند پایہ ولی اللہ تھے۔ آپ کا تعلق سلسلۂ نقشبندیہ سے ہے۔

میں ہمیشہ عرض کیا کرتا ہوں کہ الفاظ پر نہ جائیے بلکہ الفاظ کی رُوح کو سمجھیے۔ جب کسی شخص کو اِتنا علم عطا کر دیا جاتا ہے کہ وہ علم سے Spill over ہونے لگے تو علم اُس کی ذات سے باہر جھلکنے لگتا ہے۔ تب اگر کوئی ولی اللہ یہ کہہ دے کہ میں نے اِسے اِتنا علم دے دیا ہے کہ اُس کی آنے والی سات پشتیں ولی ہوجائیں تو یہ دراصل استعارہ ہے کہ اُس کو اِتنا علم عطا کردیا گیا ہے کہ Genetically اُس کی اگلی کئی نسلوں تک منتقل ہوتا رہے گا۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے فلاں شخص کو اِتنا رزق دے دیا ہے کہ اُس کی سات پشتیں بیٹھ کر کھا سکتی ہیں۔ یہ بھی ایک استعارہ ہے حالانکہ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ اُس کی اگلی ہی نسل سارا کچھ اُجاڑ دیتی ہے۔

یاد رکھیے! کوئی شخص علم اور اعمال کی بنیاد پر ولی اللہ بنتا ہے، محض کسی ولی اللہ کی عطا سے نہیں۔

نشست نمبر 13

چند مضامینِ قرآن اور حروف کے اثرات

سوال: سورۃ الحدید کے شانِ نزول اور خاص مضامین کا خلاصہ بیان فرمادیجیے۔

جواب: قرآن پاک کی کسی بھی سورہ کا ترجمہ بکثرت دستیاب ہے۔ مولانا احمد رضا خان، فتح محمد جالندھری، مولانا اشرف تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی اور دیگر بہت سے حضرات نے بہت اچھا ترجمہ کیا جو کہ Available بھی ہے۔ جو چیز دستیاب نہیں وہ مختلف سورتوں کی شانِ نزول ہے۔ قرآن پاک کو سمجھنے کے لیے دو طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔

1۔ ترجمہ......تاکہ ہم قرآن پاک کے احکامات سمجھ سکیں، اُن کی تعمیل کرسکیں اور اُنھیں اپنی زندگی پر لاگو کر سکیں۔

2۔ تفسیر......جہاں علم ہمارا ساتھ نہ دے اور ترجمہ سمجھ میں نہ آئے تو مختلف مفسرین اور اہلِ فقر کی تحریر کردہ تفاسیرِ قرآن پڑھ لیں۔ احکامات بہت Clear ہوجائیں گے۔

قرآن پاک کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہر سورہ کا موقع نزول اور Background ہمارے علم میں ہو۔ سورۃ الحدید مدنی ہے جس پر تمام علما کا اتفاق ہے۔ اِس کی 29 آیات ہیں اور 540 Sentence (جملے) اس میں استعمال ہوئے ہیں۔ اِس کے چار رکوع ہیں۔ اِس کی شانِ نزول کچھ یوں ہے کہ غزوۂ بدر میں اہلِ قریش کو بڑی واضح شکست ہوئی۔ کفار کا خیال تھا کہ مسلمان مٹھی بھر ہیں، مادی لحاظ سے کم وسائل رکھتے ہیں جب کہ ہم مالی وافرادی لحاظ سے زیادہ ہیں اِس لیے جب چاہیں مسلمانوں کو مٹا دیں گے لیکن غزوۂ بدر کے نتائج نے اہلِ قریش کو ہلا ڈالا۔ اِس کے بعد اُنھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک مربوط Planning کے تحت مسلمانوں کو جڑ سے ختم کردیں گے۔ غزوۂ اُحد میں وہ پہلے سے کہیں بہتر تیاری کے ساتھ آئے۔ ابوسفیان اُن کے سپہ سالار تھے۔ غزوۂ اُحد میں غزوۂ بدر سے بھی کہیں تیزی سے کفار کو شکست ہوگئی۔ لیکن فتح کے بعد مسلمانوں سے کوتاہی یہ ہوئی کہ اُنھوں نے درے کو خالی کردیا۔ خالد بن ولید جو اُس وقت اہلِ قریش کے ساتھ تھے اور اُن کی جنگی بصیرت بے پناہ تھی، اہلِ قریش کے ایک بڑے دستے کو لے کر اُنھوں نے مالِ غنیمت سمیٹنے میں مصروف مسلمانوں پر پلٹ کر حملہ کردیا جس سے مسلمانوں میں افراتفری پھیل گئی۔ لیکن یہ شکست پھر بھی ویسی نہیں تھی جیسی اہلِ قریش نے حقیقتاً Plan کی تھی۔ غزوۂ اُحد تک صرف اہلِ قریش مسلمانوں کے دشمن

تھے لیکن اس کے بعد انھوں نے ایک مربوط پروگرام کے تحت عرب کے مختلف قبائل کو بھی یہ کہہ کر اپنے ساتھ ملا لیا کہ اگر ہم مسلمانوں کے فتنے (معاذ اللہ) کو اسی سٹیج پر ختم کردیں تو بہتر ہے ورنہ یہ ہم سب کو مٹا ڈالیں گے۔ تمام کافر قبیلے حتیٰ کہ یہودی بھی اُن کے ساتھ مل گئے۔ یہ سلسلہ غزوۂ اُحد کے بعد سے لے کر صلح حدیبیہ تک جاری رہا۔ اس درمیانی عرصہ میں یہ ساری غیر مسلم قوتیں مسلمانوں کو مٹانے کے لیے سرگرم رہیں۔ اس موقع پر یہ سورہ نازل ہوئی۔ اِس کی آیت نمبر 25 میں لفظ ''حدید'' استعمال ہوا جس کی وجہ سے یہ سورہ "الحدید" کے نام سے موسوم ہوئی۔ اِس سورۃ میں رب تعالیٰ نے اپنی حمد و ثنا کے بعد مسلمانوں کو مخاطب کیا اور اُنھیں ترغیب دی کہ جو کچھ مال تمھارے پاس ہے اُس میں سے دل کھول کر Muslim cause کے لیے خرچ کرو۔ اس میں ایک بہت خوب صورت نکتہ ہے جو شاید آج کے زمانے میں ہمارے کام آجائے۔ اس کی آیت نمبر 7 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

''اللہ اور اُس کے رسول ﷺ پر ایمان لاؤ اور اُس کی راہ میں کچھ وہ خرچ کرو جس میں تمھیں اوروں کا جانشین کیا تو جو تم میں ایمان لائے اور اُس کی راہ میں خرچ کیا اُن کے لیے بڑا ثواب ہے۔'' (الحدید:7)

یہ آیت نمبر 7 غزوۂ تبوک کے موقع پر خوش حال صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دینے اور حضرت عثمان غنیؓ کی فضیلت کے اظہار کے طور پر بیان ہوئی کیونکہ حضرت عثمان غنیؓ نے اِس موقع پر شاندار مالی مدد کی تھی۔

سورۃ الحدید کی آیت نمبر 10 میں وہ خوبصورت نکتہ چھپا ہے جس کا میں ذکر کر رہا تھا:

''اور تمھیں کیا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو حالاں کہ آسمانوں اور زمین میں سب کا وارث اللہ ہی ہے، تم میں برابر نہیں وہ جنھوں نے فتح مکہ سے قبل خرچ اور جہاد کیا، وہ مرتبہ میں اُن سے بڑے ہیں جنھوں نے بعد فتح کے خرچ اور جہاد کیا اور اُن سب سے اللہ جنت کا وعدہ فرما چکا اور اللہ کو تمھارے کاموں کی خبر ہے۔'' (الحدید:10)

میرے علم کی حد تک یہ واحد موقع ہے جہاں اللہ نے فرمایا کہ اگر کم وسائل کے حالات میں تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے تو بے پناہ اجر ملے گا بہ نسبت اُس وقت کے جب مسلمان طاقت پکڑ لیں گے۔ اُن بہتر حالات میں خرچ کرنے کا اجر اُتنا نہیں ملے گا یعنی فتح مکہ سے پہلے جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کیا اُن کا اجر اور درجہ اُن لوگوں سے زیادہ ہے جنھوں نے فتح مکہ کے بعد انفاق فی سبیل اللہ کیا۔

اِس سورہ میں رب تعالیٰ نے ایک تو یہ خبر دی کہ مسلمان قوت پکڑ جائیں گے۔ دوسرے یہ بتایا کہ دولت سدا ایک ہی جگہ نہیں رہتی۔

It changes hands very quickly.

اس سورہ میں ایک سبق بھی ہمارے لیے پوشیدہ ہے کہ جب ہم ہر موقع اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں تو

اس کا اجر بہت زیادہ ہے۔ جب Muslim cause کو ضرورت ہو تو اُس کو Promote کرنے کے لیے اللہ کے دیے مال میں سے کھلے دل کے ساتھ خرچ کرنے کا اجر بے پناہ ہے جب کہ وقت گزر جانے کے بعد خرچ کرنے کا اجر اتنا زیادہ نہیں۔

ہم سورۃ الحدید کے زمانۂ نزول کو موجودہ دور پر منطبق کر کے دیکھیں تو ہمیں ایک مماثلت نظر آئے گی۔ اسلام میں قومیت کا کوئی تصور نہیں بلکہ اُمہ کا تصور ہے۔ اسلام کے مطابق مسلمان جسدِ واحد ہیں۔ اگر آپ مسلمانوں کو اُمہ کے طور پر لے لیں تو صورت حال Exactly وہی بنتی ہے۔ آج ہمارے پاس Strategic planning نہیں ہے۔ Vision اگر موجود ہے بھی تو ہم اُس کو استعمال نہیں کرتے۔ ہم اپنی ناک سے آگے کچھ دیکھ ہی نہیں پا رہے۔ روپیہ پیسہ پاکٹ میں جمع ہے اور بہت ہے لیکن ہم میں اس وقت حضرت عثمان غنیؓ یا حضرت سلمان فارسیؓ کوئی نہیں۔ آج وہ وقت ہے جہاں مسلمانوں کے پاس پیسے کی کثرت ہے۔ اِس دولت کا صرف 25 فی صد ہی اُن ممالک پر خرچ کر دیا جائے جو ٹیکنالوجی کے لحاظ سے تو آگے ہیں لیکن مالی لحاظ سے پیچھے ہیں۔ اُن ممالک کو Militarily strong ہونے سے یہ مسلم اُمہ کا Fighting arm بن جائیں گے جس سے ایک بڑی تبدیلی واقع ہو جائے گی۔

اگر ہم مختلف سورتوں کا ترجمہ، تفسیر اور بیک گراؤنڈ پڑھ کر اِس پر صرف واہ واہ کرنے تک محدود نہ رہیں بلکہ علم کو اپنی ذات پر Apply کر لیں تو اِس کے نتائج ہماری زندگی پر بہت بہتر مرتب ہوں گے اور مسلم اُمہ کے Behaviours اور Attitudes towards life بھی بہتر ہو جائیں گے۔

سوال: سورۃ الحدید کے فضائل و خصائل بیان فرما دیجیے۔

جواب: رب تعالیٰ نے قرآن پاک انسانوں کی ہدایت کے لیے اُتارا۔ قرآن پاک Nutshell میں جو سکھاتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم Material gains پر نہ جائیں بلکہ آخرت پر نظر رکھیں۔ ہم دُنیا کی محبت دل میں نہ پالیں بلکہ آخرت اور رب کی محبت دل میں پالیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی سورہ کو دُنیاوی مقاصد کے حصول کے لیے پڑھنا درست نہیں ہے۔

چونکہ آپ نے سوال کیا ہے اِس لیے عرض کر دیتا ہوں کہ سورۃ الحدید کو اگر عصر کے وقت پڑھا جائے تو Generally عزیز، رشتہ دار آپ پر مہربان ہو جائیں گے۔ اگر رات سونے سے پہلے اِس سورہ کی تلاوت کی جائے تو ہم میں وہ سختی آ جائے گی جو مومن میں میدانِ جنگ میں پیدا ہوتی ہے۔

مومن زمانۂ امن میں اپنے دشمنوں اور مخالفین کے لیے بھی نرم ہوتا ہے لیکن جب معرکۂ حق و باطل شروع ہو جائے تو وہ فولاد کی طرح سخت ہو جاتا ہے لیکن جونہی یہ معرکہ ختم ہو جائے یا دشمن ہتھیار ڈال دے اور صلح کی پیش کش کر دے تو وہی مومن اُن لوگوں کے لیے فولاد سے موم میں تبدیل ہو جاتا ہے جن کے خلاف اُس نے ہتھیار اُٹھائے تھے۔

سوال: سورۃ الحشر کی آخری تین آیات کی اہمیت اور اثرات کیا ہیں؟

جواب: یہ تینوں آیات مبارک ہیں آپ ضرور پڑھیے۔ اگر کوئی شخص انھیں باقاعدگی سے پڑھتا ہے تو اُس کے

دل میں رقت پیدا ہو جاتی ہے۔ جن لوگوں کا دل رقیق ہو وہ صاحبِ محبت ہوتے ہیں، اُن میں آپ ﷺ سے محبت کا جذبہ زیادہ پیدا ہوتا ہے۔

سورۃ الحشر کی آخری تین آیات کے الفاظ اور حروف کے جو Influences ہیں اُن کا تعلق آیات کے ترجمے سے نہیں ہے۔ یاد رکھیے! کسی بھی سورہ کے Influences کا انحصار اُس کی آیات کی Formation پر ہوتا ہے۔ ہر حرف کا اپنا ایک اثر اور وزن ہے۔ قرآن پاک کے ہر حرف کے ماتحت فرشتے ہیں۔ ان حروف کو جمع کر لیں تو لفظ اور لفظوں سے آیات بنتی ہیں۔

جیسا کہ پہلے بھی میں نے عرض کیا تھا کہ ''الٓمٓ'' تین حروف ہیں جو ایک ہی جگہ اکٹھے ہو گئے ہیں۔ ان کو پڑھنے سے انسان ولایت کے تیسرے درجے پر فائز ہو جاتا ہے۔ اب بجائے اِس کے کہ آپ مجھ سے اس کے پڑھنے کا طریقہ پوچھیں میں گزارش کرتا چلوں کہ پانچویں کلاس کا سٹوڈنٹ MSc کی کیمسٹری یا فزکس کی کتاب پڑھ کر Frustrate ہو جائے گا اور بات سمجھ نہ پائے گا۔ اِسی طرح بلند منزلہ عمارت کی آخری منزل کی تعمیر اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک Foundations نہ تعمیر کر لی جائیں۔

عبادات، ذکر اذکار اور اوراد و وظائف بہتر اثرات اُس وقت تک نہیں دکھا پائیں گے جب تک انسان کی رُوح کی Foundations (بنیادیں) تعمیر نہ ہو جائیں۔ اوراد و وظائف سے فائدہ لینے کے لیے ضروری ہے کہ ہم نے بنیادیں صحیح طرح بنائی ہوں۔

ایک یورپین ملک میں مقیم ایک صاحب نے مجھ سے تقاضا کیا کہ میں اُنھیں اُن کی رُوح سے مطابقت رکھنے والا حرفِ مقطعات بتا دوں۔ میں نے عرض کی ''صاحب! آپ پہلے اپنی رُوح اور قلب کو بالیدگی کے ایک خاص مقام تک لے جائیے، اِس کے بعد حرفِ مقطعات کے ورد سے آپ کو Desired result ملے گا۔''

اُنھوں نے دوبارہ خط لکھا کہ بات سمجھ نہیں آئی۔ میں نے کہا کہ پہلے آپ کو بنیاد بنانا پڑے گی۔ اپنی رُوح اور قلب کی بالیدگی و لطافت کا اہتمام کرنا پڑے گا۔ نفس کو مارنا ہوگا۔ جب آپ کی رُوح لطافت کے ایک خاص مقام پر پہنچ جائے گی تب آپ کو حروفِ مقطعات پڑھنے کا فائدہ ہوگا۔

میری اِس بات کے جواب میں اُنھوں نے بہت مزے کا خط لکھا کہ آپ مجھے اِن گھمن گھیریوں میں نہ ڈالیں۔ سیدھا کہہ دیں کہ آپ کے پاس صرف فرشتے علم کے لیے آ سکتے ہیں انسان نہیں۔

اِس کے جواب میں مجھے اُن کو چار صفحات کا لیٹر لکھنا پڑا کہ Foundations کیسے Build ہوں گی۔

اُن کا خط آ گیا ''شاہ صاحب! اگر یہ سب مجھے ہی کرنا ہے تو پھر آپ سے مجھے یہ پوچھنے کی ضرورت ہی کیا ہے کہ میری رُوح سے مطابقت رکھنے والا حرفِ مقطعات کون سا ہے؟''

بنیادیں تعمیر کرنے کے لیے تین steps ہیں۔

Step-I: یہ ہے کہ کوئی شخص ہمیں جتنا بھی بُرا کیوں نہ کہے، منفی پراپیگنڈا کرے، جڑیں کاٹے، کتنے ہی

بہتان باندھے، الزامات لگائے، ہم اُس کے خلاف اپنے دل میں کوئی میل نہ آنے دیں، اپنے دل کو غصے، کینے، اِنتقام کی آگ سے دُور اور پاک صاف رکھیں۔

یوں سمجھ لیجیے کہ رُوحانیت کی Building کے لیے اِس پر عمل کیا تو گویا بنیادوں کے لیے زمین کی کھدائی کر لی۔

Step-II: یہ ہے کہ ہم اپنی ضروریات روک کر، اپنے آرام کو قربان کر کے اپنے مسلمان بھائیوں بالخصوص اپنے مخالفین کے کام آ جائیں، اُن کی خدمت کر لیں لیکن دو کڑی شرائط کے ساتھ..... اوّل، یہ کہ رازداری اِس درجے کی ہو کہ خود ہماری ذات کو پتا نہ ہو کہ ہم نے کسی کی خدمت کی۔ دوم، یہ کہ اپنے آپ کو Self-suggestion کے ذریعے یہ تعلیم دیتے رہیں کہ یہ شخص خدمت کرا کر مجھ پر احسان کر رہا ہے۔

Setp-III: ہم قسم کھا لیں کہ ہم کسی شخص کے بارے میں کوئی Negative بات نہیں کہیں گے۔ جب بھی کسی شخص کا ذکر کریں یا Comments کریں تو وہ Positive ہی ہوں۔

اِن تینوں Steps پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ فرض عبادات جاری رکھیں تو رب آپ کا ہے، آپ کا دوست ہے۔

یہ ہماری غلط فہمی ہے کہ وظائف اور ذکر اذکار ہمیں رب تک لے جاتے ہیں۔ بالکل نہیں او وہ تو رب تعالیٰ کو یاد کرنے اور اُس کا شکر ادا کرنے کا ایک طریقہ ہے یہ اور بات کہ جب ہم اُسے پکارتے ہیں تو وہ ہمیں یاد کرنے لگتا ہے، ہم اُس کا ذکر کرتے ہیں تو وہ ہمارا چرچا کرنے لگتا ہے۔

''تو میری یاد کرو میں تمھارا چرچا کروں گا۔'' (البقرۃ:152)

چلے اور مجاہدے رب تعالیٰ کے قرب کے لیے کام نہیں آتے بلکہ بعض اوقات اُلٹا طبیعت میں سختی پیدا ہونے لگتی ہے۔ فقیر کی طبیعت میں جو لوچ، نرمی اور لچک ہوتی ہے وہ عین سنت کے مطابق ہوتی ہے کیونکہ آپ ﷺ کی نرمی ضرب المثل ہے۔ وہ نرمی، لچک اور لوچ اِن تینوں Steps ہی سے آتی ہے۔

آپ بھی اپنے آپ کو آزمائیے، اپنی ذات کا ایک ٹیسٹ لیجیے۔ جو شخص سب سے زیادہ آپ کا مخالف ہے، آپ کو نقصان پہنچاتا ہے، سب سے زیادہ آپ پر الزامات لگاتا اور بہتان تراشی کرتا ہے، جینے نہیں دیتا۔ اُس شخص کی خدمت کر کے دیکھیے کہ آپ کو کس قدر رُوحانی خوشی ہوتی ہے، آپ کا دل خوشی سے سرشار ہو جاتا ہے۔

ایک دن کے لیے ہی سہی یہ تجربہ کر کے دیکھیے کہ پھر جب آپ رات کو اللہ کے حضور کھڑے ہوں گے تو استغراق کس قدر بڑھ جاتا ہے۔

ان باتوں پر عمل کرنے کے بعد رُوح سے مطابقت رکھنے والا حرفِ مقطعات یا تسبیح پڑھیں گے تو بہت انعامات ملیں گے۔

شکرانِ نعمت

سوال: یاجوج ماجوج کے بارے میں کچھ بتائیے۔

جواب: سورۃ الکہف میں مختصراً یاجوج ماجوج کا ذکر ہے۔ اِن کے بارے میں کوئی Authentic ریکارڈ یا ہسٹری موجود نہیں۔ اندازہ یہی ہے کہ یہ قوم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پندرہ سو سال پہلے مشرق میں بستی تھی۔ یہ مضبوط جسم، چوڑے چہرے، چھوٹی آنکھوں اور چھوٹے قد کے لوگ ہیں۔ اُن کے بارے میں بتائی گئی نشانیوں سے اندازہ لگایا گیا کہ غالباً یہ چین یا منگول نسل سے ہیں۔ Historians اُنھیں زیادہ تر منگول سے قیاس کرتے ہیں کیوں کہ یہ چھپکلیاں، سانپ، کیڑے مکوڑے اور گھوڑے خچر وغیرہ کھا جاتے تھے۔ Far East اور China کے علاقے میں سب چیزیں کھائی جاتی ہیں۔ اِس حلیے اور نشانیوں کی وجہ سے گمان یہی ہے کہ شاید یاجوج ماجوج منگول نسل سے ہیں۔ آپ ﷺ کا بھی فرمان ہے کہ یہ قوم اُس وقت ظاہر ہوگی جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے۔ تب یہ قوم سیلاب کی طرح نمودار ہوگی۔ رب تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حکم دے گا کہ وہ کوہِ طور پر پناہ لے لیں۔ چوں کہ اُس وقت سب مسلمان ہوں گے اِس لیے سبھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہِ طور پر چلے جائیں گے حتیٰ کہ وہ وقت آئے گا کہ کوہِ طور پر خوراک کی قلت ہو جائے گی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دُعا کریں گے ''یا اللہ! ہم سے رزق کی تنگی ہٹا دے۔'' رب تعالیٰ زمین پر ایسی وبا پھیلا دے گا جو کیڑوں کی صورت میں ہوگی۔ یہ کیڑے یاجوج ماجوج کی گردنیں کھانا شروع کر دیں گے جس سے یہ قوم تباہ ہو جائے گی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مسلمانوں کے ساتھ کوہِ طور سے نیچے اُتر آئیں گے۔ یاجوج ماجوج کی ہلاکت کی وجہ سے زمین پر Smell پھیلی ہوگی جس سے نجات کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور مسلمان دعا کریں گے۔ تب رب تعالیٰ ایسی مخلوق بھیجے گا جن کی گردنیں اُونٹوں کی طرح لمبی ہوں گی وہ اِن لاشوں کو اُٹھا کر لے جائیں گے...... جو Residuals اور کیڑے باقی رہ جائیں گے اُن کے لیے رب تعالیٰ آسمان سے بارش برسائے گا جس سے زمین ڈھل جائے گی۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب یاجوج ماجوج قوم ظاہر ہوگی تو وہ اپنے راستے میں آنے والا سارا پانی پی

جائے گی حتیٰ کہ فلسطین کی ایک بہت بڑی جھیل کا پانی بھی ختم کر دے گی۔

عام خیال یہ بھی ہے کہ چین کے صوبہ ''Zhenzhou'' میں ایک بہت بڑا انڈسٹریل علاقہ ہے۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے میں اُس علاقہ میں تو نہ جا سکا جس کے بارے میں مشہور ہے کہ یاجوج ماجوج قوم وہاں قید ہے۔ البتہ اُس علاقہ کے لوگوں نے مجھے کنفرم کیا کہ وہاں دو پہاڑیاں موجود ہیں جن کے درمیانی فاصلے میں ایک دیوار بنی ہے جسے First Great Wall کہتے ہیں اس کے پیچھے یاجوج ماجوج قوم موجود ہے۔

ذوالقرنین کے بارے میں ایک روایت یہ ہے کہ مصر کے ایک بڑے فرعون Amunhotep-III کے ہاں 1392 قبل مسیح میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ 1360 قبل مسیح میں جب وہ تخت نشین ہوا تو اُس نے اپنا نام Amunhotep-IV سے تبدیل کر کے Akhenaten رکھا۔ وہ بادشاہ توحید کی طرف مائل ہو گیا اور جب اُسے محسوس ہوا کہ وہ بہت طاقت ور ہو گیا ہے تب اُس نے اپنے موحد ہونے کا اعلان کر دیا۔ اُس نے مصر کے وسط میں ایک ٹیمپل بنایا جہاں بتوں کی پوجا کی اجازت نہیں تھی۔ 1362 قبل مسیح میں اللہ نے انھیں نبوت عطا کی۔ یہی بادشاہ ذوالقرنین کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ یہ وہی بادشاہ ہیں جنھوں نے سب بادشاہوں سے زیادہ مشرق، مغرب اور شمال جنوب کی جانب سفر کیا۔ ذوالقرنین وہ جگہ دیکھنا چاہتے تھے جہاں سورج طلوع ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ مشرق میں مالدیپ کے جزائر پر آ گئے۔ آپ جانتے ہیں کہ مالدیپ چھوٹے چھوٹے جزائر کا مجموعہ ہے۔ کچھ جزائر تو اِس قدر چھوٹے ہیں کہ محض ایک فائیو سٹار ہوٹل پر مشتمل ہیں۔ بڑے سے بڑا جزیرہ بھی صرف چند کلومیٹر لمبا اور چوڑا ہے۔ مالدیپ خاصا خوب صورت اور Humid علاقہ ہے۔ آپ کو کبھی موقع ملے تو ضرور وہاں جائیے۔ زندگی میں دو تین بار جب کام کی تھکن بہت بڑھ گئی تو میں نے وہاں پناہ لی تھی۔

حضرت ذوالقرنین مالدیپ کے جزائر سے ہوتے ہوئے China پہنچے۔ چینیوں نے انھیں ''Chu'' کے نام سے پکارا۔ Chu چینی زبان میں Aliens کو کہتے ہیں۔ یاجوج ماجوج بھی چینی زبان کا ایک Sentence ہے۔ انگریزی میں اِنھیں Gog and Magog کہتے ہیں۔

Locals نے Chu سے درخواست کی کہ یاجوج ماجوج ظالم قوم ہے اور ہم پر حملے کرتی ہے۔ تب ذوالقرنین نے اُن کو روکنے کے لیے چین کے صوبے ''Zhenzhou'' میں دو پہاڑوں کے درمیان سات کلو میٹر لمبی دیوار تعمیر کی جو Base سے 36 میٹر Wide اور Top سے 9 میٹر Wide ہے، اس کی Height 9 میٹر ہے۔

روایت ہے کہ یاجوج ماجوج سارا دن اِس دیوار کو چاٹتے رہتے ہیں حتیٰ کہ شام کو اُن کا لیڈر کہتا ہے کہ کل اس پتلی دیوار کو محض ایک دھکا دیں گے تو یہ گر جائے گی۔ اُس پر وہ سب واپس چلے جاتے ہیں۔ رب تعالیٰ اپنی قدرت سے راتوں رات اِس دیوار کو دوبارہ اصلی حالت میں لے آتا ہے۔ اگلی صبح یاجوج ماجوج آ کر اسے دوبارہ چاٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ قیامت کے نزدیک اُن کا لیڈر کہے گا کہ انشاء اللہ کل اِس پتلی

دیوار کو ہم گرا دیں گے۔ یوں وہ اگلے دن اُس کو گرانے میں کامیاب ہو جائیں گے اور زمین پر پھیل کر تباہی مچائیں گے۔ ذوالقرنین کو تاریخ میں بخت نصر کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ جب اُنھوں نے مصر سے چین کی طرف سفر کیا تو کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اس کے بعد وہ، اُن کی والدہ اور اُن کے اہل خانہ کہاں گئے۔ ازاں بعد قرآن پاک نے اسے Clear کیا۔

سوال: سورۃ الرحمٰن میں "رب المشرقین و رب المغربین" کے الفاظ ہیں اور اس کے بعد فرمایا گیا "پس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔" اِس کی وضاحت فرما دیجیے۔

جواب: کچھ علما کا کہنا ہے کہ چونکہ ہر ملک کا اپنا ایک مشرق اور مغرب ہے۔ ہر ملک کے لوگ جس سمت سے سورج نکلتا دیکھتے ہیں اُسے مشرق اور جس سمت میں سورج ڈوبتا دیکھتے ہیں اُسے مغرب کہتے ہیں۔ یوں کئی مشرق اور مغرب ہو گئے۔ اسی نسبت سے رب نے خود کو رب المشرقین و رب المغربین کہا لیکن جب اُس نے خود کو رب المشرق و رب المغرب کہا تو اِس سے مراد زمین کا مشرق و مغرب ہے۔

جہاں تک نعمتوں کو جھٹلانے کی بات ہے تو میرے خیال میں اس کی وضاحت کی ضرورت ہی نہ پڑے اگر میں اپنی ذات کی طرف ہی دیکھ لوں۔ کیونکہ میں ذاتی طور پر اللہ کی نعمتوں کی تفسیر ہوں۔ وہ کون سی نعمت ہے جو اُس نے مجھے عطا نہیں کی۔ لیکن میں صبح سے شام تک رب کے حضور شکوہ کرتا رہتا ہوں کہ تو نے مجھے یہ نہیں دیا، میرا یہ کام نہیں کیا وہ کام نہیں کیا، میری فلاں دُعا قبول نہیں کی حالاں کہ صبح سے شام تک رب میرے وہ سب کام بھی کرتا چلا جاتا ہے جن کی مجھے خبر تک نہیں ہوتی۔ میری وہ ضرورتیں بھی پوری کرتا ہے جن کا مجھے خود بھی ادراک نہیں ہوتا۔ صبح سے شام تک طرح طرح کی نعمتوں سے وہ مجھے نوازتا ہے۔ یہ سب مجھے یاد نہیں رہتا۔ یاد رہتا ہے تو صرف وہ ایک کام جو نہیں ہوا ہوتا یا وہ ایک دُعا جو پوری نہیں ہوئی ہوتی۔ ایک ہزار میں سے 999 قبول ہونے والی دُعائیں تو مجھے یاد نہیں رہتیں لیکن جو ایک دُعا قبول نہ ہو سکی وہ مجھے یاد رہتی ہے۔

ہم اللہ تعالیٰ سے اس طرح بھی تو سوال کر سکتے ہیں:

"یا اللہ! تُو اتنا مہربان اور رحیم و کریم ہے کہ ہمیں وہ بھی عطا کرتا ہے جو ہم مانگتے ہی نہیں، جس کا ہمیں ادراک ہی نہیں ہوتا، جس کے ہم حق دار ہی نہیں۔ یا اللہ! جہاں تو اتنی رحمتیں کرتا ہے وہاں یہ ایک کام بھی کر دے۔"

اس طرح دُعا کرنے سے شکر گزاری کا پہلو نکل آئے گا اور ہم نعمتوں کو جھٹلانے سے بچ جائیں گے۔

سوال: کیا فقیر سے دُعا کروانا جائز ہے؟ بعض اوقات مجھ جیسے جاہل آدمی کو فقیر کے جواب سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ فقیر کو بات شاید ناگوار گزری ہے۔ کیا فقیر سے دُعا کروانے کے کوئی خاص آداب ہیں؟

جواب: دوسروں سے دُعا کروانا سنت ہے۔ خود بھی دُعا کیجیے اور دوسروں سے بھی اپنے لیے دُعا کروایئے لیکن ہم عیسائیت کی طرح اپنی عبادات کو بھی Sectionalise اور Compartmentalise نہ کر دیں کہ عبادت اور دُعا کرانا پادری کا کام ہے کہ لوگ اُس کے سامنے Confess (اعتراف گناہ) کریں اور گناہوں

کی بخشش کے لیے دُعا کرائیں اور جب پادری صاحب کہہ دیں کہ تمہارے گناہ معاف کر دیے گئے تو لوگ انھیں فیس ادا کر کے خوشی خوشی گھر لوٹ جائیں۔

فقیر اُس وقت دُعا سے بھاگے گا جب وہ یہ دیکھے گا کہ لوگ اُسے ذمہ داری سونپ کر خود بری الذمہ ہو گئے ہیں۔ مثلاً میں فقیر سے جا کر کہوں کہ آپ اللہ کے حضور دُعا کر دیجیے کہ میرا فلاں کام کر دے۔ اس کے بعد میں بے فکر ہو کر برج کھیلنے چل دوں کہ مجھے محنت، کوشش یا دُعا کرنے کی کیا ضرورت ہے فقیر نے دعا کر دی یہی کافی ہے۔ یہ رویہ غلط ہے۔ مسلمان خود بھی اللہ کے حضور گڑگڑاتا ہے اور دوسروں سے بھی Request کرتا ہے کہ جب آپ اپنے لیے دُعا کریں تو مجھے بھی یاد رکھیں۔

فقیر کسی کی بات کو مائنڈ نہیں کرتا۔ فقیر پر رب تعالیٰ کا ایسا کرم ہوتا ہے کہ وہ ان باتوں سے اوپر چلا جاتا ہے کہ اُسے کس نے کن الفاظ میں Address (مخاطب) کیا اور کس انداز میں دُعا کی درخواست کی۔ کوئی کس طرح اُس کے پاس آ کر بیٹھا۔

یاد رکھیے! دوسروں کے یہ سارے رویے صرف اُس وقت تک تنگ کرتے ہیں جب انسان میں انا ہوتی ہے جب کہ فقیر تو پہلا کام ہی یہ کرتا ہے کہ اپنی انا کو مار دیتا ہے البتہ وہ رہتا انسان ہی ہے۔ جس طرح ایک عام انسان کی طبیعت صاف ستھری اور سلیقے والی چیز کو دیکھ کر بشاش ہو جاتی ہے اسی طرح خوش اطوار و خوش عادات شخص کو دیکھ کر فقیر کی نفاست پسند طبیعت خوش ہوتی ہے۔ فقیر کی نفیس طبع کے خلاف کوئی بات ہوگی تو عام انسان کی مانند اس کی طبیعت پر بھی وہ گراں گزرے گی۔

فقیر اپنی Instincts پر Control کو Develop کر لیتا ہے۔ اپنی طبیعت اور Reactions پر قابو پا لیتا ہے لیکن رہتا وہ انسان ہی ہے۔ اگر کوئی شخص اُس کے پاس بیٹھ کر غیر مہذبانہ حرکتیں کرتا ہے تو فقیر React تو نہیں کرے گا، چڑے گا بھی نہیں، ناگواری بھی محسوس نہیں کرے گا لیکن اُس کی طبیعت کی نفاست پر یہ رویہ گراں گزرے گا...... مثلاً میں فقیر کے پاس جا کر 1857ء سے اپنی داستان شروع کرتا ہوں کہ میرے پردادا کو شیروانی کے بٹن بند کرنے میں بہت دقت پیش آتی تھی۔ میرے دادا کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اُنھوں نے بٹن کی جگہ زپ استعمال کرنا شروع کر دی...... میرے والد صاحب بھی اسی مسئلے سے گزرے اور اب مجھے بھی اپنی شرٹ کے بٹن بند کرنے میں پورے ساڑھے تین منٹ لگ جاتے ہیں۔ آپ دُعا کر دیجیے یا کوئی وظیفہ بتا دیجیے کہ شرٹ کے بٹن خود بخود بند ہو جایا کریں۔

فقیر اس طویل داستان کو تحمل سے سنتے ہوئے اُس کے ختم ہونے کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ میرا مسئلہ تو جان چکا ہے لیکن دُعا کے لیے اپنی باری کا انتظار کرتے سینکڑوں لوگوں کی بے چینی کی وجہ سے وہ چاہتا ہے کہ میں اپنا مدعا مختصراً ایک جملے میں بیان کر دوں۔ یہ بے چینی ہے، ناگواری نہیں۔ اگر میری بے معنی طویل داستان کے دوران وہ مجھ سے یہ کہہ دے Please try to be brief تو مجھے لگتا ہے کہ شاید صاحب دُعا نے ناگواری

کا اظہار کیا ہے۔ اگر کبھی ایسا ہوا کہ میں نے سینما کا ٹکٹ خریدا اور پھر فقیر کے پاس دُعا کے لیے چلا آیا۔ اُس کے کمرے کے دروازے پر کھڑے کھڑے ہی سلام کیا اور عرض کی کہ صاحب! دُعا کر دیجیے کہ میری شرٹ کا بٹن جلدی بند ہو جایا کرے، اجازت دیجیے۔ السلام علیکم! دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسے شخص کے لیے فقیر نے بڑے دل سے دُعا کر دی اور Next time اُسے Welcome کیا۔

فقیر طویل بات کے جواب میں ناگواری کا اظہار نہیں کر رہا ہوتا بلکہ اصل میں اِس طویل بات کی وجہ سے دوسروں کے انتظار طویل ہونے کی وجہ سے بے چینی محسوس کر رہا ہوتا ہے۔

آپ فقیر سے دُعا کرانے کے لیے آداب کی فکر نہ کیجیے۔ بس یہ یاد رکھیے جو شخص خود نفیس ہے گفتگو بھی نفیس کرتا ہے، جس کا لب ولہجہ اور الفاظ بھی Pleasant (خوش گوار) ہیں ایسا شخص فقیر تو کیا سب ہی کو پسند آ جائے گا۔

آپ اپنے آپ کو ہی دیکھ لیجیے کہ آپ کو کیسے لوگ پسند آتے ہیں۔ فقیر کیوں ہر کسی کو پسند آتا ہے؟ کیونکہ وہ کسی کے سامنے اپنے دکھ بیان نہیں کرتا، اپنی مشکلات کا رونا نہیں روتا، اپنی بدحالی کا ذکر نہیں کرتا۔

جب فقیر بھوکا ہوتا ہے تو خود کو پیٹ بھرا ظاہر کرتا ہے وہ مشکل اور دُکھ میں ہو تو خود کو بہت خوش حال ظاہر کرتا ہے۔ یہ دراصل فقیر کا اندازِ شکر ہے جو وہ رب کے حضور اختیار کرتا ہے کہ میں اپنے آقا کا شکوہ کیسے بیان کروں جو ہمیشہ سے مجھے پالتا آیا ہے اور آج بھی مجھے پال رہا ہے۔ پھر میں اپنی زبان سے کیسے کہہ دوں کہ اُس نے مجھے تنگ دست اور بیمار رکھا ہے۔ فقیر کبھی رب کا شکوہ بیان نہیں کرتا۔ اِس لیے لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید اُسے کوئی دکھ یا تکلیف ہی نہیں...... ایسا نہیں ہوتا۔ وہ بھی انسان ہے، اُس پر بھی اچھے بُرے دن آتے رہتے ہیں لیکن وہ بُرے دنوں کا کسی سے تذکرہ نہیں کرتا کیونکہ یہ اُس کے نزدیک ناشکر گزاری ہے۔

جب ہم اپنے دُکھ کسی کے سامنے بیان نہیں کرتے بلکہ دوسروں کے دُکھ ہمدردی سے سنتے ہیں، اُن پر مرہم اور تسلی کا پھاہا رکھتے ہیں تو سب کو پسند آنے لگتے ہیں۔

یہ مت بھولیے کہ فقیر بھی انسان ہے۔ اگر ہم اس کے سامنے خوش گوار لہجے اور الفاظ میں بات کریں گے تو اُس کے دل میں اُتر جائیں گے۔

فقیر کی دعا سے زیادہ اہم یہ ہے کہ فقیر کسی سے پیار کرنے لگ جائے...... فقیر کا دوست رب اِتنا وضع دار اور حیادار ہے کہ از خود اپنے دوست کے کام کرنا شروع کر دیتا ہے......

سوال: حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کے قول 'میرا پاؤں تمام اولیاء اللہ کی گردن پر ہے' کی وضاحت کر دیجیے۔

جواب: حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کو جو بلندی عطا ہوئی وہ دیگر اولیاء اللہ کے مقام سے بہت زیادہ ہے...... آپ کو اللہ نے بہت فصاحت و بلاغت عطا فرمائی تھی...... بجائے یہ فرمانے کے کہ میرا مقام تمام اولیاء اللہ سے بلند ہے اُنھوں نے فرما دیا کہ میرا پاؤں تمام اولیاء اللہ کی گردن پر ہے......

سوال: (الف) قرآن پاک کی نسبت احادیث میں قرائن وآثارِ قیامت کی تفصیلات زیادہ ملتی ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

(ب) کہا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اُٹھا کر (نعوذ باللہ) آپ ﷺ سے بلند مقام دے دیا گیا؟

جواب: قرآن پاک Symbolic کتاب ہے اس میں عام طور پر واقعات کی تشریح نہیں کی گئی۔ قیامت کے روز جو کچھ ہوگا اُس روز کی Happenings قرآن نے بیان کر دیں کہ سورج سوا نیزے پر آ جائے گا۔ پہاڑ روئی کے گالے بن کر اُڑیں گے۔ ہر شے فنا ہو جائے گی۔ پھر قیامت کے بعد کا منظر بیان کر دیا کہ صورِ اسرافیل پھونکا جائے گا اور مردے زندہ ہو جائیں گے۔

احادیث اِن قرآنی آیات کی تفسیر و وضاحت بیان کرتی ہیں۔ احادیث میں قیامت کی نشانیاں بیان کی گئی ہیں کہ جب فلاں فلاں واقعات پیش آئیں گے تو سمجھ لیں کہ قیامت قریب ہے۔

یہ سمجھنا اور کہنا بالکل غلط ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اُٹھا کر (نعوذ باللہ) آپ ﷺ سے بلند مقام دے دیا گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ ضرور تشریف لائیں گے لیکن ایک پیغمبر نہیں بلکہ آپ ﷺ کے اُمتی کے طور پر۔ نبوت کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام شب معراج آپ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھ چکے۔ وہ بطور مقتدی اور اُمتی آئیں گے۔ یاد رکھیے! مقتدی کا درجہ کبھی امام سے زیادہ نہیں ہوتا اور آپ ﷺ امام الانبیاء ہیں۔

حُسنِ آگہی

سوال: سورۃ المزمل کے بارے میں کچھ بتایئے بالخصوص یہ کہ آپ ﷺ کو "مزمل" کہہ کر پکارنے کی وجہ کیا ہے؟

جواب: سورۃ المزمل کے 2 رُکوع اور 20 آیات ہیں۔ جناب حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کے ہم عصر بعض بزرگوں کے مطابق سورۃ المزمل مکمل طور پر مکی ہے جب کہ حضرت ابنِ عباسؓ کا قول ہے کہ اِس کا پہلا رُکوع مکی اور دوسرا مدنی ہے۔ اُنھوں نے اس کی دلیل یہ دی ہے کہ دوسرے رُکوع میں جہاد اور زکوٰۃ کا ذکر ہے چونکہ حقیقت بھی یہی ہے کہ مکہ میں کبھی جہاد اور زکوٰۃ کا تذکرہ نہیں ہوا بلکہ یہ احکامات مدینہ ہی میں نازل ہوئے اس لیے حضرت ابنِ عباسؓ کی بات زیادہ درست معلوم ہوتی ہے۔ آپ ﷺ کو "مزمل" کہہ کر پکارنے کی وجہ روایات صحیحہ میں یوں بیان کی جاتی ہے کہ ابتدا میں جب حضرت جبرائیل علیہ السلام آپ ﷺ کی خدمت میں وحی لے کر نازل ہوئے تو اُس وقت آپ ﷺ پر وحی کی دہشت، خوف اور حیرت کا غلبہ قدرے زیادہ تھا۔ آپ ﷺ اسی کیفیت میں گھر تشریف لے گئے اور بی بی صاحبہ (حضرت خدیجہؓ) سے فرمایا "زملونی زملونی" (مجھے کپڑا اوڑھا دو، مجھے کپڑا اوڑھا دو)۔ عربی زبان کی فصاحت و بلاغت تمام زبانوں سے زیادہ ہے۔ عربی لغت میں "مزمل" اُس شخص کو کہتے ہیں جو بہت بڑے کشادہ کپڑے کو اپنے اُوپر لپیٹ لے۔ عرب کے Rich culture کے مطابق جب کسی شخص کو اپنائیت اور پیار سے پکارا جانا مقصود ہو تو جس حالت میں وہ موجود ہو اُسی کے مطابق اُسے مخاطب کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ایک بار جب حضرت علیؓ بی بی صاحبہ (حضرت فاطمہؓ) کی کسی بات پر رنجیدہ ہو کر گھر سے تشریف لے گئے اور مسجد میں جا کر زمین پر لیٹ گئے تو آپ ﷺ نے اُنھیں یوں مخاطب فرمایا تھا "قم ابو تراب" (اے ابو تراب اُٹھو۔ نوٹ: ابو تراب کا معنی ہے جس کے جسم پر مٹی لگی ہو)۔

آپ ﷺ چونکہ چادر اوڑھے ہوئے تھے تو رب تعالیٰ نے اُنس اور لطف کے اظہار کے طور پر آپ ﷺ کو "یا یھا المزمل" کہہ کر مخاطب فرمایا۔ یہ رب تعالیٰ اور اُس کے محبوب کا معاملہ ہے۔ وہ جس طرح چاہے اپنے محبوب کو پکارے ہم اُس پر Comment نہیں کر سکتے۔

سورۃ المزمل عام طور پر رات کے وقت پڑھی جاتی ہے۔ رات کو اس کی تلاوت کرنے سے انسان میں روحانیت زیادہ بیدار ہوتی ہے اور اس سورہ کی تلاوت کے زیادہ اچھے اثرات ملتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سورۂ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو نصف شب، اُس سے کچھ زیادہ یا کم عبادت کی تلقین کی ہے اور یہی آپ ﷺ کا معمول بھی تھا۔ آپ ﷺ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو تہجد کے وقت عبادتِ الٰہی کی تاکید فرمایا کرتے اور صحابہ کرامؓ اِس پر عمل بھی کرتے۔

جو شخص نصف شب، اِس سے کچھ کم یا زیادہ رب کی عبادت میں مشغول رہتا ہے پھر کچھ دیر سو جاتا ہے اور بعد ازاں تہجد کے لیے بیدار ہوتا ہے، نوافل ادا کرتا اور تلاوتِ قرآن پاک کرتا ہے، پھر کچھ دیر کے لیے سو جاتا ہے اِس کے بعد دوبارہ بیدار ہو کر فجر کی نماز ادا کرتا ہے تو اُس شخص میں رُوحانیت بہت تیزی سے پیدا ہوتی ہے۔

اسلام نے تو رب کے قرب کے حصول کا یہ طریقہ چودہ سو سال پہلے بتایا تھا لیکن مکینکل سائنس کی حالیہ تحقیق نے اپنی سابقہ تھیوری کو Negate کیا ہے کہ چھ یا آٹھ گھنٹے کی مسلسل نیند سے انسانی صحت اچھی رہتی ہے اور ثابت کیا ہے کہ اسلام کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں۔ وہ یوں کہ مکینکل سائنس کی نئی تحقیق کے مطابق مسلسل طویل نیند انسان کی جسمانی اور ذہنی صحت کے لیے مضر ہے جب کہ چھوٹے چھوٹے Spells میں نیند لینے سے انسان ذہنی وجسمانی طور پر صحت مند رہتا ہے۔

عشاء، تہجد اور فجر کی نماز کے اوقات اِسی سلسلے کی Punctuation ہیں۔ اگر انسان عشاء کی نماز کے بعد نصف شب تک رب کا ذکر اور عبادت کرتا ہے پھر دو ڈھائی گھنٹے کی نیند کے بعد دوبارہ اُٹھتا اور تہجد ادا کرنے کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کرتا ہے۔ اس کے بعد کچھ دیر کے لیے سو جاتا ہے اور پھر بیدار ہو کر نمازِ فجر ادا اور تلاوتِ کلام پاک کرتا ہے تو نیند کے چھوٹے چھوٹے Spell سے موجودہ مکینکل سائنس کے مطابق انسان کی جسمانی و ذہنی صحت بہت اچھی رہتی ہے۔

لیکن یہ بھی یاد رہے کہ فرض عبادات کی ادائیگی میں انسان کو بہت سخت ہونا چاہیے جب کہ نفلی عبادات میں اعتدال ضروری ہے۔ یہ نہ ہو کہ رات بھر جاگ کر نفلی عبادات اِس کثرت سے کی جائیں کہ انسان دن بھر اُونگھتا رہے اور فرائض تک نہ ادا کر سکے۔ جب وہ روٹین میں اعتدال کے ساتھ عبادات کرتا ہے تو باقاعدگی برقرار رہتی ہے اور اس معمول کو ذوق وشوق سے سرانجام دینا بھی آسان ہو جاتا ہے۔

سوال: کیا والدین کی خدمت کرنا صرف بیٹے کا ہی فرض ہے؟

جواب: بیٹا ہو یا بیٹی...... والدین کی خدمت دونوں پر فرض ہے لیکن ہمارے ہاں کچھ معاشرتی پابندیوں کی وجہ سے عموماً یہ فرض بیٹوں تک محدود سمجھا جاتا ہے۔

یاد رکھیے! Cultural values اکثر دیگر احکامات کے مقابلے میں زیادہ Strong ثابت ہوتی ہیں۔ ہم اپنی روزمرہ زندگی ہی دیکھ لیں تو شرعی احکامات کی ادائیگی میں بہت جگہ ہمیں Failures نظر آئیں گے کیونکہ ہم Cultural values (تہذیبی اقدار) کے ذریعے Drive کیے جاتے ہیں۔ شادی یا موت کی

رُسوم ہوں یا ایک دوسرے سے میل جول اور Dealings......سب کچھ Cultural values ہی سے Dominated ہے اور اس سلسلے میں اکثر شرعی احکامات کی خلاف ورزی ہو رہی ہوتی ہے۔

ہم مانیں یا نہ مانیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ ہماری زندگی میں ہندو کلچر کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔ ہم بیٹی کے گھر کا پانی تک نہیں پیتے چہ جائیکہ بیٹی سے شادی کے بعد خدمت کرائیں۔ بیٹے ہی نہیں بیٹی کی بھی ذمہ داری ہے کہ والدین کی خدمت کرے۔ یہ Academic بات ہے۔ لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر کوئی بیٹا اپنے باپ کی وفات کے بعد خاندان کی کفالت کر رہا ہے تو یہ ذمہ داری نہیں بلکہ مقام شکر ہے۔ بیٹے کو چاہیے کہ وہ رب کے حضور شکر بجالائے "یا باری تعالیٰ! تو اِس خاندان کی کفالت کسی بھی طریقے سے کر سکتا تھا اور کسی شخص کو بھی یہ توفیق بخش سکتا تھا لیکن تو نے اِس Honour کے لیے مجھے چنا اور مجھے یہ شرف بخشا کہ میں تیرے اِن بندوں جو میرے بہن بھائی اور والدہ ہیں، اِن کی خدمت کر سکوں۔"

اِس انداز میں کی جانے والی خدمت کا اجر اور انعام دُنیا و آخرت میں بے پناہ ہے۔ اِس لیے آپ اسے ذمہ داری یا ڈیوٹی نہ سمجھیے بلکہ رب کی طرف سے اپنے لیے خاص نعمت اور اعزاز تصور کیجیے جو رب نے اپنی خاص رحمت کے طور پر آپ کو بخشا ہے۔ ورنہ رب تو اِس پر قادر ہے کہ اپنے بندوں کو پالنے کے لیے کسی کے دل میں بھی یہ احساس ڈال دے کہ وہ اِن بندوں کی خدمت کیا کرے۔

سوال: بعض صاحب علم، پیر اور بزرگ اپنے پاس آنے والوں کا نام اور والدہ کا نام پوچھ کر اُنھیں اُن کے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں بتا دیتے ہیں۔ اکثر اوقات یہ مخالف دشمنوں کے نام تک بتا دیتے ہیں اور دوسروں کے راز بھی۔ اُنھیں یہ سب کیسے معلوم ہوتا ہے؟

جواب: اصل میں بعض لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت ہو جاتی ہے۔ اللہ اُن سے راضی ہو کر اُنھیں اپنے اسرار کائنات کی سیر و تفریح کی ایک حد تک (میں ایک حد تک کو انڈر لائن کر رہا ہوں) اجازت دے دیتا ہے۔ اِسی طرح کچھ لوگوں پر یوں کرم کرتا ہے کہ اُنھیں کشف و کرامات عطا کر دیتا ہے۔ جب آپ ایسے شخص کے پاس جا کر اپنا مسئلہ بیان کرتے ہیں تو وہ اللہ کے حضور عرض کرتا ہے "یا اللہ! تیرا یہ بندہ (نام) میرے پاس اِس گمان کے ساتھ آیا ہے کہ اگر میں تیرے حضور عرض کروں تو اِس کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ یا اللہ! تو ستار العیوب ہے، بھرم رکھنے والا ہے۔ تُو میرا ابھی بھرم رکھ لے۔ مہربانی فرما اور اِس شخص کا کام کر دے۔"

جب وہ فقیر (صاحب علم و عرفان) اللہ کے حضور دل میں یہ دُعا کرتا ہے تو بسا اوقات اُس پر ایسی عنایات ہو جاتی ہیں کہ وہ جس معاملے کے لیے دُعا کرتا ہے اللہ اُسے وہ بتا یا دکھا دیتا ہے جسے آپ عرف عام میں کشف کہتے ہیں۔ جو احوال اُس پر کھلتے ہیں اُن میں سے چیدہ چیدہ باتیں وہ صاحب علم و عرفان اُس شخص (دُعا کرانے والے) کو بتا دیتا ہے۔ چیدہ چیدہ باتیں اِس لیے کیونکہ رب ستار ہے۔ وہ لوگوں کے عیب چھپائے رکھتا ہے، اُن کے بھرم قائم رکھتا ہے اب جو شخص اُمید لے کر صاحب حال اور صاحب نظر و علم کے پاس گیا ہے کشف میں اُس کے احوال دیکھ کر صاحب نظر تو تھر تھر کانپ رہا ہے کہ کوئی ایسی بات نہ بیان کر دوں کہ جسے سن

کر یہ شخص شرمندہ ہو جائے۔ اِس لیے وہ صرف اُتنی ہی بات اُسے بتائے گا جتنی اُس شخص نے پوچھی ہے...... باقی ساری باتیں وہ پی جائے گا۔ مجھ جیسے لوگ صاحب علم و نظر کے پاس گانا سن کر گئے ہوتے ہیں اور جا کر کہتے ہیں جناب ہم تو تہجد پڑھ کر آ رہے ہیں۔ اب رب تعالیٰ نے تو اصل احوال اُس صاحب عرفان پر کھول دیے ہوتے ہیں لیکن وہ کبھی بھی اُس شخص کو شرمندہ نہیں کرے گا کہ بھائی! تم تو Pub سے اُٹھ کر میرے پاس آ رہے ہو۔ اِس کے بجائے وہ بڑے اطمینان سے بغیر حقیقت جتائے بھرم قائم رکھتے ہوئے کہے گا "بھائی بڑی اچھی بات ہے، انسان کو تہجد کی نماز پڑھنی چاہیے۔" صاحب علم اُس شخص کو اپنی فہم و فراست اور اللہ کی عطا کردہ عقل و دانش سے مسئلہ کا حل بتا دے گا لیکن چونکہ وہ رب نہیں بلکہ انسان ہی ہے اِس لیے یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ ہمیشہ سو فیصد درست باتیں ہی بتائے یا اُس کی کہی ہوئی باتیں سو فیصد درست ثابت ہوں، اُس کی دعائیں سو فیصد پوری ہوں۔ یاد رکھیے! صرف اور صرف رب سو فیصد درست ہوتا ہے۔ انسان کو رب کی طرف سے جھٹکے بھی ملتے رہتے ہیں۔ رب اُسے جگاتا بھی رہتا ہے۔

ہوتا یوں ہے کہ رب تعالیٰ صاحب علم کی کہی ساری باتیں پوری کر رہا ہوتا ہے پھر Suddenly یوں ہونے لگے گا کہ جو کچھ وہ کہے گا سو فیصد اُس کے برعکس ہونا شروع ہو جائے گا۔ دراصل اِس طرح رب تعالیٰ اُسے تکبر سے بچا رہا ہوتا ہے کہ ہر روز ہر کہی ہوئی بات پوری ہو جانے سے کہیں تکبر میں مبتلا ہو کر وہ سب کچھ کھو نہ دے۔

جب صاحب علم و دُعا کی کہی ہوئی بات غلط ثابت ہوتی ہے تو لوگ آ کر اُسے لفظوں کے جوتے لگاتے ہیں کہ تم تو کہتے تھے کام ہو جائے گا لیکن نہیں ہوا۔ بڑے علم والے بنے پھرتے ہو۔ یوں صاحب علم کا مزاج ٹھکانے پر آ جاتا ہے اور وہ زمین پر اُتر آتا ہے۔

اگر صاحب علم کی کہی باتیں اور دُعائیں رب تعالیٰ 80,90 فیصد بھی درست ثابت کر رہا ہے تو بہت غنیمت ہے۔ اِسی کو قبول کر لیجیے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ایسے لوگ آپ کو کم ملیں گے۔ مجھ جیسے بہتیرے لوگ دکان سجائے بیٹھے ہیں۔

سوال میں دو Points ایسے ہیں جن کی کوئی صاحب علم و نظر، کشف و کرامات اور صاحب مستجاب الدعوات کبھی غلطی نہیں کر سکتا کیونکہ اُس کی سزا بہت کڑی ہے۔

یاد رکھیے! جو اللہ کی راہ پر چلنے والا صحیح بندہ ہے نہ وہ آپ پر کسی کے بھید کھولے گا، نہ زبان سے کوئی ایسی بات نکالے گا جس سے کسی کی توہین ہو، نہ ایسی بات کرے گا جو غیبت کے زمرے میں آتی ہو اور نہ ایسے لفظ بولے گا جس سے دلوں میں فرق آئے۔ وہ ٹوٹے دلوں کو جوڑنے کے لیے جھوٹ بھی بول دے گا۔

کوئی شخص آپ کو ایسی بات کہے جس سے کسی کے راز کھلتے ہوں، کسی کی توہین ہوتی ہو، کسی کے عیب ظاہر ہوتے ہوں یا کسی کا نام بتا دینے سے دشمنیاں پیدا ہوتی ہوں تو جان جائیے وہ صاحب علم نہیں کیونکہ صاحب علم تو سنت پر عمل کرتے ہوئے لوگوں کے دلوں کو جوڑتے ہیں، توڑتے نہیں۔

ایک گزارش

میں سنی العقیدہ ہوں لیکن نو اور دس محرم کو اگر ہفتہ یا اتوار کا دن ہو تو اُن دنوں کے احترام میں دُعا اور لیکچر کے لیے Available نہیں ہوتا۔

حضرت امام حسینؓ ہم سب کے لیے انتہائی قابلِ احترام ہیں۔ حضرت امام حسینؓ آپ ﷺ کے انتہائی عزیز نواسے تو ہیں ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ حضرت امام حسینؓ نے جو قربانی دی ہے وہ کسی انسان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اگر ہم از راہ احترام و تشکر اُن کی شہادت کے روز قرآن پاک اور نوافل پڑھیں اور اُس کا ثواب حضرت امام حسینؓ کی رُوح کو بطور نذرانہ پیش کر دیں تو یہ ایک بہترین عمل ہوگا۔

اللہ پاک آپ سب پر رحم فرمائے اور اس کا اجر عطا فرمائے۔ آمین! ثم آمین!

دوسروں کی سنیے

السلام علیکم خواتین و حضرات!

ایک نوجوان جن کا تعلق West سے تھا آپ سب کی طرح اُنھیں بھی رُوحانیت کی جستجو ہوئی۔ وہ دُنیا بھر میں گھومتے رہے۔ مختلف مذاہب کی رُوحانی ہستیوں سے ملاقاتیں کیں، اُن کا بغور مطالعہ کیا۔ چلتے چلتے برصغیر آگئے اور مختلف لوگوں سے ملاقات کرنے لگے۔ بالآخر وہ ایک ایسے شخص کے پاس پہنچے جو واقعی صاحب علم و نظر تھے۔ چند دن تک اُن کے رہن سہن، ماحول اور طور طریقوں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اُنھیں محسوس ہوا کہ یہاں سچائی موجود ہے۔ اُنھوں نے اُن صاحب علم و نظر کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ میں گزشتہ 20 دن سے آپ کی خانقاہ میں موجود ہوں اور اب چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اپنا شاگرد بنالیں۔ اُنھوں نے اُن سے شاگرد بننے کی وجہ پوچھی تو نوجوان نے کہا ”میں امریکہ، یورپ، مڈل ایسٹ، فار ایسٹ سے ہوتا ہوا مختلف لوگوں سے ملاقاتیں کرنے کے بعد آپ کے پاس آیا ہوں۔ مجھے آپ کے پاس وہ سچائی نظر آئی ہے جو اب تک کسی مذہب میں نظر نہیں آئی۔ اس لیے میں آپ کا مذہب اختیار کرنا چاہتا ہوں۔“

اُن شیخ نے بہت خوب صورت جواب دیا ”اگر تم نے Deeply چیزوں کو نہ دیکھا ہوتا تو تمھیں بہت سی جگہوں پر سچائی مل جاتی۔“

یہ بات بہت حیران کن بھی تھی اور اُس Knowledge-seeker کے لیے نئی بھی کیونکہ دُنیا کی ساری کتب تو کہتی ہیں کہ ہر شے کا بغور مطالعہ و مشاہدہ کیا جائے تاکہ اُس کی حقیقت سامنے آجائے جب کہ یہ صاحب نظر و علم کچھ اور کہہ رہے تھے۔

وہ نوجوان کہنے لگا ”بات سمجھ نہیں آئی۔“ صاحب نظر نے کہا ”دیکھو! جب ہم چیزوں کو گہری نظر سے دیکھتے ہیں تو ہم اُنھیں Subjectively دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ ہر شے دیکھ کر کسی خاص نتیجے پر پہنچنا چاہ رہے ہوتے ہیں۔ وہ نتیجہ ہمارا Subject ہوتا ہے۔“

جب ہم چیزوں کو Subjectively دیکھیں گے تو سچائی واضح نظر نہیں آئے گی۔ سچائی پر ہمارے نقطہ نظر کے خول چڑھ جائیں گے۔ انسان اُسی وقت علم سیکھ سکتا ہے جب وہ سیکھنے کی Deliberate attempt نہ کر رہا ہو۔ Conscious effort نہ کی جائے تو بات سمجھ آجاتی ہے اور انسان علم سیکھ جاتا ہے ورنہ Conscious effort کرنے سے علم پلے نہیں پڑتا۔

ہم جو بات سنتے ہیں وہ سننے پر مجبور ہوتے ہیں۔ جس جس طرف ہماری آنکھیں گھومتی ہیں ہم وہ چیزیں دیکھنے پر مجبور ہوتے ہیں کیونکہ ہماری آنکھ ہمیں وہ سب دکھارہی ہوتی ہے۔ مثلاً اگر ہم سو چیزوں میں سے میز دیکھنا چاہتے ہیں تو باقی چیزوں کو سرسری نظر سے دیکھیں اور صرف میز تلاش کریں گے۔ یوں 99 چیزوں کو Register نہیں کر پائیں گے محض سرسری نظر سے دیکھیں گے۔ یوں ہم ایک میز کی خاطر 99 چیزوں کو جاننے سے محروم رہ گئے۔ لیکن اگر ہم میز کی تلاش میں نہیں تو 100 چیزیں ہمارے ذہن میں Register ہو جائیں گی اور ہم 100 چیزیں سیکھ جائیں گے۔

ہم بازار جاتے ہیں۔ وہاں اللہ کی مخلوق ہے۔ ہم خوب صورت اور قابلِ قبول چیزوں کو بھی دیکھتے ہیں اور ایسی چیزوں کو بھی جو زیادہ خوب صورت نہیں ہیں۔ Wheatish, Fair (گندمی) اور Dark wheatish complexion (گہری گندمی رنگت) کو بھی دیکھتے ہیں۔ اگر ہم Particular dark complexion دیکھنا چاہیں گے تو باقی Ignore کرتے چلے جائیں گے۔

اسی طرح علم میں جب کسی خاص پہلو سے چیزوں کو ڈھونڈتے ہیں تو دوسری چیزوں کو Ignore کرتے چلے جاتے ہیں۔

علم سیکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم کبھی بھی Subjective نہ ہوں اور Predetermined مقاصد نہ رکھیں۔ اس طرح علم جمع ہوتا ہے اور جب علم جمع ہوتا ہے تو اُس سے ہماری عقل اور ہمارے علم میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور بالآخر ہم اُس وسعت نظر اور Broad mental horizon سے سچائی کو پہچاننے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ ہم سچائی کو اُس وقت تک نہیں جان سکتے جب تک Variety and quality of knowledge نہ ہو...... سچائی کو پرکھنے کے لیے ان دونوں چیزوں کا ہونا بہت ضروری ہے۔

اُس شیخ نے انگریز سے بالکل درست کہا تھا کہ تم جس جس مذہب کے رُوحانی لوگوں سے مل آئے ہو وہاں بھی سچائی موجود تھی لیکن چونکہ تم مایوس ہو چکے تھے اس لیے تم نے یہاں Subjectively چیزوں کو نہیں دیکھا سو تمھیں میرے پاس سچائی دکھائی دی۔

صاحبو! بات یہ ہے کہ جب ہم رُوحانیت کی تلاش میں نکلیں گے تو رُوحانیت نہیں ملے گی۔ کیونکہ اس صورت میں ہم رُوحانیت کے علاوہ باقی تمام چیزوں سے منہ موڑ لیتے ہیں اور اُن کے لیے ہمارا ذہن Receptive نہیں رہتا۔ نتیجتاً ہم رُوحانیت کو پہچان نہیں پاتے اور وہ آکر ہمارے ہاتھوں سے نکل جاتی ہے۔ نہ ہمارے پاس علم ہو اور نہ ہم اُسے پہچان پائیں۔ علم اُس وقت حاصل ہوگا جب ہم ہر چیز کو دیکھتے اور Register کرتے چلے جائیں گے۔ وہ علم جو سیکھتے سیکھتے ہمارے پاس جمع ہو گیا ہے وہ ہمیں رُوحانیت کو سیکھنے میں مدد کرے گا۔

میں، آپ یا کوئی اور اس لیے پیچھے رہ جاتے ہیں کہ ہم ہر جگہ رُوحانیت کو تلاش کرتے ہیں۔ سرفراز شاہ صاحب کے پاس چونکہ علم نہیں ہے اس لیے اپنی کم علمی کی وجہ سے اُنھوں نے رُوحانیت کے حوالے سے اپنا

معیار اور Yardstick مقرر کر رکھی ہے۔ شاہ صاحب چونکہ رُوحانیت میں دل چسپی رکھتے ہیں اور اسے سیکھنا چاہتے ہیں اس لیے کوئی اور بات سننے کو تیار ہی نہیں سوائے اس کے کہ مجھے یہ بتایئے کہ آپ مجھے کشف سکھا رہے ہیں یا نہیں۔

یوں شاہ صاحب رُوحانیت کی بلڈنگ کی 20 ویں منزل پہلے تعمیر کرنا چاہتے ہیں اور بنیادوں پر کوئی دھیان نہیں دیتے۔ حالانکہ بنیادوں کی تیاری کے بغیر 20 ویں منزل کی تعمیر ممکن نہیں لیکن یہ بات شاہ صاحب سمجھنے کو تیار نہیں۔

شاہ صاحب کو ایک عادت ہو جانی چاہیے کہ اگر وہ کہیں دیکھتے ہیں کہ جوا کھیلا جا رہا ہے یا چوری ہو رہی ہے تو وہ سیکھیں کہ جوا اور چوری کا فن کیا ہے۔ کوئی شخص جھوٹ بول رہا ہے تو وہ سیکھیں کہ جھوٹ کیسے بولا جاتا ہے۔ یہ سب سیکھتے سیکھتے شاہ صاحب کا دماغ اللہ تعالیٰ یوں پالش کر دے گا کہ شاہ صاحب اچھے اور بُرے میں تمیز کرنا سیکھ جائیں گے اور جب وہ خود اچھے اور برے میں تمیز کرنے لگیں گے تو سچائی کو بھی خود دریافت کر لیں گے۔

اگر ہم علم سیکھنا چاہتے ہیں تو اپنے ذہن کو بند نہ کریں۔ ایک انگریز نے یونیورسٹی میں لیکچر دیتے وقت اس کا ایک بہت خوب صورت گُر بتایا تھا کہ

If you want to succeed in business, meet more people, more people and more people.

یہ بزنس چلانے کا بہترین اُصول ہے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ اگر ہم علم سیکھنا چاہتے ہیں تو دوسروں کو سننے کی عادت ڈال لیں۔ اپنی نہ کہیں...... دوسروں کی سنیں۔ لڑکپن میں ایک شعر سنا تھا:

؎ بہرا ہوں اگر میں تو کس درجہ ہے آسائش
اوروں کی نہیں سنتا بس اپنی ہی کہتا ہوں

یعنی اگر میں سننے کی صلاحیت سے محروم ہو گیا تو کیا ہوا پھر بھی فائدہ میں ہوں کہ دوسروں کو سنے بغیر اپنی ہی کہے جاتا ہوں۔ لیکن یہ علم سے بھاگنے کا سنہری اُصول ہے۔ اگر آپ علم سیکھنا چاہتے ہیں تو پھر اپنی نہ کہیے بلکہ دوسروں کی سنیے۔

سوال: ایک انسان دلی طور پر اللہ کی معرفت رکھتا ہے اور اُسے یقین ہے کہ اللہ کا کوئی شریک نہیں لیکن وہ ایمان کا اعلان اور اِظہار کیے بغیر مر جاتا ہے تو کس حیثیت سے مرا...... مسلمان یا کافر؟

جواب: اس میں دو باتیں ہیں۔ ایک ہے Prerequisite اور دوسری اعلان۔ اگر کوئی شخص دل میں کلمہ پڑھتا اور کہتا ہے کہ میں ایمان لایا اُس رب پر جو وحدہٗ لاشریک ہے۔ میں اس بات پر ایمان لایا کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ پھر وہ شخص حالات کے جبر یا کسی اور مجبوری کے تحت مسلمان ہونے کا اعلان نہیں کر پایا تو بھی وہ مسلمان ہی ہے کیونکہ اُس نے وہ Prerequisite پوری کر دی ہے۔ جو کہ غیر مسلم سے مسلم ہونے کے لیے کافی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مباح کیا ہے؟ مباح یہ ہے کہ وہ اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دے۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیے بغیر مر جاتا ہے تو بھی اُس کی موت بطور مسلمان ہی ہے۔

سوال: آپ نے ایک بار بتایا تھا کہ آپ بیعت نہیں کرتے۔ لندن میں موجود ایک صاحب نے ہمیں بتایا کہ وہ اور اُن کے بیٹے آپ سے باقاعدہ بیعت ہیں جو آپ نے ہاتھ میں ہاتھ دے کر لی تھی۔ اس کی وضاحت فرما دیجیے۔

جواب: بات اُس وقت دشوار ہو جاتی ہے جب مجھے اپنی نہیں دوسروں کی کہی اُس بات کی وضاحت دینی پڑ جائے جسے میں جانتا ہی نہیں۔ حضرت! بات یہ ہے کون آپ سے کیا کہہ رہا ہے میں اس کی وضاحت کیسے کروں گا؟ میں تو اپنی ہی کہی بات کی Explanation دے سکتا ہوں۔ ویسے بھی لوگوں کو بیعت تو وہ شخص کرے جو صراطِ مستقیم پر ہو، جس میں ہلکی سی ہی سہی نیکی کی رمق ہو۔ جو شخص گردن تک گناہوں میں ڈوبا ہو وہ کہاں سے بیعت کرے گا؟ جو خود نہ سدھر سکا وہ دوسروں کو کیسے سدھارے گا؟

میرے مرشد (سید یعقوب علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ) بہت بڑے آدمی تھے۔ میں نے اُن کے بہت احوال دیکھے۔ بحیثیت مرید نہیں بلکہ مغربی تعلیم یافتہ شخص کی نظر سے اُن کا مشاہدہ کیا...... اور اس کے باوجود اُنھیں بہت بلند پایا۔ مجھے یاد نہیں کہ اُنھوں نے کبھی کسی کو مع میرے بیعت کیا ہو۔ البتہ میرے معاملے میں ایک بار اُنھوں نے فرمایا تھا "میاں! ہمارے سلسلے میں تو نگاہوں سے بیعت کی جاتی ہے، ہاتھوں سے نہیں۔"

مرشد صاحب نے مجھے تین چیزیں عطا فرمائیں:

- شروع میں اُنھوں نے مجھے جیب عطا فرما دی اور Publicly یہ Announce بھی کر دیا۔
- پھر اُنھوں نے Publicly announce کیا کہ یہ میرا بیٹا ہے۔
- آخری دنوں میں Announce کر دیا کہ میرے مرشد صاحب کے بھی ایک ہی خلیفہ تھے (میری طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا) اور میرے بھی یہ ایک ہی خلیفہ ہوں گے۔

لیکن اس سب کے باوجود مرشد صاحب نے کبھی ہاتھ میں ہاتھ لے کر مجھے بیعت نہیں کیا۔ نہ ہی میں نے اُنھیں خود کبھی یہ کہا۔ کیونکہ جب مجھے ہر شے بیعت کیے بغیر اُن سے مل رہی تھی تو میں پاگل تھا کہ اپنے آپ کو کسی کے ہاتھ بیچ ڈالتا۔

خلافت تک مل گئی لیکن کبھی اُنھوں نے مجھے بیعت نہیں کیا البتہ اپنے مخصوص لہجے میں یہ ضرور ایک مرتبہ فرمایا "ہمارے سلسلے میں تو نگاہوں سے بیعت ہوتی ہے۔"

سوال: کیا احادیث میں موجود ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کا نزول بطور اُمتی ہوگا؟

جواب: آپ ﷺ کے فرمان کا مفہوم ہے کہ جب حضرت عیسٰی علیہ السلام دوبارہ تشریف لائیں گے تو بحیثیت مسلمان تشریف لائیں گے[1]۔ جو شخص مسلمان ہے یا اسلام میں اُٹھایا جائے گا وہ آپ ﷺ کا اُمتی ہے اس لیے حضرت عیسٰی علیہ السلام بھی تب اُمتی ہی کہلائیں گے۔

سوال: حضرت عیسٰی علیہ السلام کے دوبارہ نزول کے وقت نبی کے بجائے اُمتی ہونے سے اُن کی نبوت کا تو انکار ہو جائے گا۔

جواب: شبِ معراج مسجدِ اقصیٰ میں تمام انبیاء علیہم السلام نے آپ ﷺ کی اقتدا میں نماز پڑھی اس لیے آپ ﷺ امام الانبیاء کہلائے۔

تمام پیغمبر مسلمان تھے اور اسلام میں تھے۔ قربِ قیامت میں جب حضرت عیسٰی علیہ السلام کا نزول ہو گا تو اُن کے نبی ہونے پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ پہلے بھی وہ مسلمان تھے..... بطور اُمتی بھی وہ مسلمان ہی ہوں گے۔

سوال: قرآن پاک کے مطابق پیدا کرنا، مارنا اور رزق دینا اللہ کا کام ہے۔ روایات کے مطابق قربِ قیامت کے وقت دجال بھی یہی کام کرے گا۔ کیا تب قرآن کی تعلیمات بدل جائیں گی اور نعوذ باللہ دجال اللہ کے اختیارات استعمال کرے گا؟

جواب: مسئلہ وہاں پیدا ہوتا ہے جب ہم الفاظ پر جاتے ہیں۔ ظاہری لفظوں کو دیکھتے ہیں، اُن کی رُوح کو نہیں۔ اُس نیت کو نہیں دیکھتے جس کے تحت وہ الفاظ ادا کیے جا رہے ہوتے ہیں۔ پہلے بھی بہت سے لوگوں بمع فرعون نے خدائی کا دعویٰ کیا۔ اُن کے خدائی کے دعویٰ سے کوئی خدا نہیں بن گیا۔ خدا وہی ہے جو اصل میں ہے۔

اگر کل کو کوئی بادشاہ یا حکمران یہ کہہ دے کہ اپنے ملک میں بسنے والوں کو رزق میں دیتا ہوں تو معاذ اللہ وہ رب نہیں کہلائے گا۔ وہ تو اصل میں Post man ہے۔ جس طرح آپ کے کسی دوست، احباب، والدین یا رشتہ دار کی طرف سے بھیجا گیا منی آرڈر Post man آپ کو لا کر دیتا ہے اور آپ اُس Post man کا کوئی احسان نہیں مانتے۔ اِسی طرح بادشاہ اگر رزق تقسیم کر رہا ہے اور وہ اِس خوش فہمی میں مبتلا ہو جائے کہ یہ رزق تو دے ہی میں رہا ہوں تو اپنی اِس سوچ سے وہ رازق یا خدا نہیں بن جائے گا۔ یہ سراسر اُس کی غلط فہمی ہے۔

اِسی طرح دجال اپنے آپ کو (نعوذ باللہ) رب کہے گا لیکن اُس کے رب کہنے سے وہ رب نہیں بن جائے گا۔ آخر کار وہ اللہ کے ایک نبی علیہ السلام کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچے گا۔

لندن میں ایک صاحب نے مجھے کہا "شاہ صاحب! فلاں شخص (نام نہیں لوں گا) نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ امام مہدی ہیں کیونکہ اُن کے مطابق اُن کی تصویر چاند میں دکھائی دیتی ہے اور حجرِ اسود میں بھی۔"

میں نے کہا "میں کسی کے دعویٰ کی تائید یا تردید نہیں کرتا میں صرف یہ عرض کرتا ہوں کہ آپ ﷺ نے امام مہدی کے ظہور کی جو نشانیاں بتائی ہیں اگر وہ سب وقوع پذیر ہو چکیں اور اُن کے آنے سے پوری دُنیا پر اسلام کا غلبہ ہو گیا ہے تو پھر مان لیجیے کہ وہ امام مہدی ہیں۔ اگر نہیں ہوئیں تو وہ صاحب امام مہدی نہیں۔"

یاد رکھیے! دعویٰ کر لینے سے کوئی انسان ویسا ہو نہیں جاتا۔ بلاشبہ رب کو موت نہیں۔ وہ غیر فانی ہے۔ دجال فانی ہے۔ اُس کو موت آئے گی۔ خدائی کے دعویٰ سے کوئی رب نہیں بن جاتا۔ نہ رب کے اختیارات استعمال کر سکتا ہے۔

سوال: آپ نے فرمایا تھا کہ کل 70 ہزار جہان اور 20 ہزار عالم ہیں۔ عالم اور جہان سے کیا مراد ہے؟

''عالم'' عربی کا لفظ ہے جب کہ ''جہان'' فارسی کا لفظ ہے۔ جب عالم اور جہان کا مطلب ایک ہی ہے تو پھر 70 اور 20 کی تفریق کیوں؟

جواب: جب ہم غیر زبان سے اپنی زبان میں لفظوں کا ترجمہ کرتے ہیں تو یونہی غلط فہمیاں پیدا ہوا کرتی ہے۔ ایک ہے Universe اور ایک ہے Galaxy۔

Galaxy کا عمومی ترجمہ ''جہان'' ہے۔ Universe جس کا اپنا چاند، سورج ہو اُسے ''عالم'' کہتے ہیں۔ Galaxy کو میں کہکشاں کہہ نہیں سکتا تھا کہ آپ مجھے شاعری میں اُلجھا دیتے کہ

میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

اس لیے میں نے اسے کہکشاں نہیں ''جہان'' کہہ دیا...... مطلب Galaxy ہی تھا۔

سوال: میرے خیال میں رب کی تمام صفات اسمِ الٰہی ''الحمید'' میں ہیں اور اس کی انتہا ''الملک'' میں ہے۔ اس کی وضاحت فرما دیجیے۔

جواب: رب تعالیٰ کی ہر صفت اپنی جگہ ایک مکمل صفت ہے۔ اُس کی صفات کسی ایک صفت یا اسم میں سمائی ہوئی نہیں۔ الملک بھی رب کی صرف ایک صفت کو بیان کر رہا ہے تمام کو نہیں۔ نہ یہ اُس کی صفات کی انتہا ہے۔ جو مالک ہے ضروری نہیں کہ اُس میں باقی 97 صفات بھی سموئی ہیں۔ (97 یوں کہ 99 میں سے ایک اسم ذات اللہ اور دوسرا ''الملک''..... باقی 97)

اسی طرح ''الحمید'' اللہ کی ایک صفت ہے۔ اس میں قہار و جبار نہیں سما سکتا۔ ہم اس کی 98 صفات کو علیحدہ علیحدہ ہی لیں تو بہتر ہے۔

اگر ہم ''الحمید'' یا ''یاحمید'' یا پھر ''الملک'' یا ''یا مَلِک'' پڑھیں تو اس کے اثرات ہر شخص کی Body chemistry اور رُوح کی لطافت و بالیدگی کے معیار و مقام، اعمال اور Thinking کے مطابق مختلف ہوں گے۔ اس لیے یہ کہنا کہ آپ سب ''یا حمید'' یا ''یامَلِک'' یا ''مَالِکَ المُلک'' پڑھ لیا کریں اور اس کے فلاں اثرات مرتب ہوں گے، درست نہیں۔

اگر ہم اسماء الحسنیٰ پڑھنا چاہتے ہیں تو بغیر کسی مخصوص تعداد کے 99 اسما پڑھنے کو اپنا معمول بنالیں لیکن ہم انھیں برکت کے حصول کے لیے پڑھیں۔ وظائف کے اثرات حاصل کرنے کے لیے نہیں۔

ہمارے ہاں شادی کی دو بنیادی وجوہات ہوتی ہیں:

1۔ شادی Transactional deal ہوتی ہے کہ اس کے ذریعے بیوی یا خاوند کی جائداد مجھے مل جائے گی۔ وہ شادیاں جو Transactional deal کے طور پر یا Out of necessity کی جاتی ہیں میرے نزدیک اُن کا رُتبہ و مقام بہت نیچے ہے۔

2۔ شادی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس رشتے کے ذریعے ملنے والا انسان میرا لائف پارٹنر،

Companion اور دوست ہے اور اِن سارے رشتوں کے علاوہ وہ Husband یا Wife ہے۔

میرے خیال میں یہ رشتہ بہت عظیم ہے۔

رب تعالیٰ کے ساتھ بھی ہماری Commercial deals ہوتی ہیں کہ اگر میں تجھے پکاروں تو تُو مجھے فلاں فائدہ دے دے۔ میرے نزدیک رب تعالیٰ کے ساتھ کمرشل ڈیل بہت چھوٹا اور کم تر سودا ہے۔ اُس کے ساتھ تو بس یہ ڈیل کر لی جائے کہ تو بس اپنا آپ مجھے عطا کر دے لیکن اس ڈیل کو بھی آپ ذکرِ الٰہی سے مشروط نہ کریں بلکہ دُعا میں اُسے کہا کریں کہ تو مجھے اپنا آپ عطا کر دے۔ ذکر تو صرف اس لیے کریں کہ رب ذکر کے لائق ہے۔ وہ میرا رب اور مالک ہے اور میں اُس کا بندہ۔ یہ اظہارِ تشکر کا ایک انداز ہے کہ میں اُسے ہر وقت یاد رکھوں۔ اس لیے اُسے یاد رکھیے کہ وہ یاد رکھنے کے لائق ہے۔

اگر رب سے کچھ مانگنا ہے تو اُس کے شایانِ شان مانگیے۔ وزیرِ اعظم سے جا کر یہ نہ کہیے کہ میرے گھر کے سامنے والی نالی Repair کرا دیں۔ وزیرِ اعظم سے تو اُس کے عہدے کے مطابق کچھ مانگیے۔

رب کے شایانِ شان صرف خود رب ہے۔ باقی سب ہیچ ہے۔

جس کو رب مل گیا اُسے پھر اور کیا چاہیے! بھائی، آپ ان قصوں میں کیوں پڑتے ہیں، سیدھا سیدھا رب کو پکاریے۔

رب کو پکارنے کا سب سے آسان، اچھا اور Safe راستہ تلاوتِ قرآن ہے۔ اس کے انعامات بہت Guaranteed ہیں، اس جہان میں بھی اور اُس جہان میں بھی۔

منفی سے مثبت تک

اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت میں ڈر اور خوف رکھا ہے۔ وسوسے اور خدشات بھی انسانی فطرت کا حصہ ہیں۔ شک کا عنصر انسان میں بدرجۂ اتم موجود ہے لیکن یہ انسان کے اپنے رویوں پر منحصر ہے کہ انسانی فطرت میں موجود وہ تمام چیزیں جو بظاہر Negative virtue دکھائی دیتی ہیں اُنھیں انسان اپنے رویوں سے مثبت انداز میں استعمال کر کے Point of disadvantage سے Point of advantage پر چلا جائے۔

شک انسان کو برباد کر دیتا ہے لیکن اُسی شک کو اگر ہم مثبت سمت میں لے جائیں اور اُس سے مثبت کام لے لیں تو یہ ہمارے علم میں اضافے کا باعث بن جاتا ہے۔

میں اور آپ ہمیشہ رزق کی کمی کے خدشے میں مبتلا رہتے ہیں۔ حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "رزق کی چار اقسام ہیں:

1۔ رزقِ مقسوم

2۔ رزقِ مضمون

3۔ رزقِ مملوک

4۔ رزقِ موعود

1۔ رزقِ مقسوم

وہ رزق ہے جو انسان کی تقدیر میں لکھ دیا گیا اور انسان کو مل کر رہے گا۔ اِسی رزق کے بارے میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا تھا "کوئی شخص مر نہیں سکتا تاوقتیکہ وہ اپنے رزق کا آخری نوالہ نہ کھا لے۔"

2۔ رزقِ مضمون

وہ رزق ہے جو انسان کو وقتاً فوقتاً عطا ہوتا رہتا ہے کھانے پینے کی چیزوں کی صورت میں جو اس کے لیے کافی ہوں یعنی اُن کا خدا ضامن ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

"اور زمین پر چلنے والا کوئی ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمہ کرم پر نہ ہو۔" (ھود:6)

3۔ رزقِ مملوک

وہ رزق ہے جو انسان اپنے اثاثے بنا کر اور اُن کے ذریعے کاروبار اور تجارت کر کے حاصل کرتا ہے۔

4۔ رزقِ موعود

وہ رزق ہے جو رب تعالیٰ درویشوں کو بغیر ذرائع کے عطا کرتا ہے۔ قرآن پاک میں اِس رزق کا ذکر کیا گیا ہے کہ جو اپنے آپ کو رب تعالیٰ کی راہ میں وقف کر دیتے ہیں اُنھیں یہ رزق دیا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

"اور جو اللہ سے ڈرنے والا ہے اللہ اُس کے لیے نجات کی راہ نکال دے گا اور اُسے وہاں سے روزی دے گا جہاں اُس کا گمان بھی نہ ہو۔" (الطلاق:3,4)

حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انسان کو رزقِ مقسوم پر توکل کرنا چاہیے لیکن رزقِ مضمون اور رزقِ مملوک پر توکل نہ کیا جائے جب کہ رزقِ موعود تو ہے ہی درویشوں کے لیے جو رب تعالیٰ پر توکل کر کے بیٹھتے ہیں اور رب تعالیٰ اُنھیں مختلف ذرائع اور اسباب سے رزق پہنچا دیتا ہے۔

اگر رزقِ مقسوم ہے تو پھر ہمیں اِس بات کا یقین کر لینا چاہیے کہ رب تعالیٰ ہمیں اور ہماری اولاد کو بھوکا نہیں مرنے دے گا۔ جو رزق اُس نے ہماری تقدیر میں لکھ دیا وہ ہر حال میں ہمیں ملے گا۔ نہ اُس میں ایک اونس کی ہوگی نہ اضافہ۔ یہ رزق Guaranteed ہے۔

انسان تین وجوہات کی وجہ سے غلط کام کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے:

1۔ جاب چھن جانے کا خوف

2۔ جان سے مارے جانے کی دھمکی

3۔ رُسوائی کا ڈر اور دھمکی

ہم اِن تینوں باتوں سے خوف زدہ رہتے ہیں اور غلط کام کر لیتے ہیں۔ ہم لوٹا گھمانے والوں کے پاس جا کر Assurance لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ کہیں ہمارا رزق تو ختم نہیں ہو جائے گا۔

جب رب تعالیٰ کا یہ دعویٰ بھی ہے اور وعدہ بھی کہ رازق میں ہی ہوں تو پھر ہم رب تعالیٰ کی بات کا یقین کیوں نہیں کرتے؟ اور لوٹا پھیرنے والے کی بات کا یقین کیوں کر لیتے ہیں؟

مجھے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ایک فرمان یاد آ گیا کہ انسان کے دل کی تین کیفیات یا مقام ہیں:

1۔ قلبِ سلیم

2۔ قلبِ منیب

3۔ قلبِ شہید

"قلبِ سلیم": وہ مقام یا کیفیت ہے جب انسان کے دل میں سوائے رب تعالیٰ کے کوئی نہیں رہتا۔ اُس کے دل میں صرف اور صرف رب بستا ہے۔

"قلبِ منیب": جب انسان تمام گناہوں سے سچے دل سے توبہ یعنی "توبتہ النصوح" کر لیتا ہے تو اُس کا دل قلبِ منیب کے مقام پر جا پہنچتا ہے۔

"قلبِ شہید": جب رب تعالیٰ کسی شخص کو یہ توفیق بخش دے کہ اُسے ہر شے میں رب تعالیٰ کا جلوہ دکھائی دینے لگے تو وہ قلبِ شہید کے مقام پر فائز ہوگا۔

ہم اکثر اِس جستجو میں رہتے ہیں کہ ہم رب تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔ یاد رکھیے! رب تعالیٰ اور انسان کے درمیان حجاب صرف انسان کے دل کی آلائشوں کا ہے۔ جب انسان کے دل سے دُنیاوی آلائشیں غصہ، کینہ، بغض، حسد، انتقام، جھوٹ، غیبت، حرصِ طعام، حرصِ جاہ، حرصِ گفتگو نکل جاتی ہیں تو وہ حجاب اُٹھ جاتا ہے۔

ہماری یہ سوچ غلط ہے کہ رب تعالیٰ تسبیح پھیرنے سے ملتا ہے۔ رب تو دلوں کو صاف کرنے سے ملتا ہے، دل کو تمام آلائشوں سے پاک کرنے سے ملتا ہے۔

جو شخص رب تعالیٰ تک پہنچنا چاہتا ہے اُسے اپنے دل کو اِس طرح صاف کرنا ہوگا کہ وہ قلب کی تینوں کیفیات حاصل کر لے۔ اُس کے دل میں سوائے رب کے کوئی نہ رہے۔ وہ اِس طرح توبہ کر لے کہ دوبارہ گناہوں کی طرف نہ جائے اور کوئی غلط کام نہ کرے اور وہ جس چیز کا بھی مشاہدہ کرے اُس میں اُسے رب دکھائی دے۔ تب بندہ رب تعالیٰ تک جا پہنچتا ہے۔

ایک اور شے جو انسان کی بدترین دشمن ہے وہ انسان کی زبان ہے۔ فقیر سب سے زیادہ زور زبان کی توبہ پر دیتے ہیں اور تلقین کرتے ہیں کہ زبان سے کوئی ایسی بات ادا نہ ہو جو نہ کہنے کی ہو۔

جناب حمید الدین ناگوری صاحب نے ایک بار Share کیا کہ میں ایک ایسے درویش سے ملا جو لوگوں سے گفتگو نہیں کرتے تھے۔ میں 10 سال اُن کے پاس رہا اور اُنھیں ہمیشہ خاموش پایا۔ صرف ایک روز اُنھوں نے ایک جملہ اپنے مریدین سے فرمایا "اگر اپنی زبان کو وہ بات کہنے سے روک لو جو نہ کہنے کی ہو تو تمھاری آخرت سنور جائے گی۔"

اس کے فوراً بعد اُنھوں نے خود کلامی کی "یہ میں نے کیا کہہ دیا۔ یہ بات تو کہنے کی نہ تھی۔" تب اُنھوں نے اپنی زبان دانتوں میں اتنے زور سے دبائی کہ اُس میں سے خون بہنے لگا۔

انسان کے تمام اعضا زبان کی بدولت ہی پھنستے ہیں۔ اگرچہ اہلِ فقر نے زبان کو تمام اعضا کا بادشاہ کہا مگر ساتھ ہی اسے سب سے بڑا دشمن بھی قرار دیا۔

زبان تمام اعضا کی بادشاہ اس لیے ہے کیونکہ اس سے ذکرِ الٰہی ہوتا ہے اور دشمن اس لیے کہ اس سے ایسی باتیں نکل جاتی ہیں جو رب تعالیٰ کو پسند نہیں حتیٰ کہ بعض اوقات انسان ایسی باتیں بھی کہہ جاتا ہے کہ جن کی

وجہ سے وہ خود بخود گرفت میں آجاتا ہے۔ میں نے ذاتی مشاہدہ سے یہ بات سیکھی کہ میں اور آپ بھی مشکل کے وقت پریشان ہو کر لوٹا پھیرنے والے کے پاس جاتے ہیں جو ہمیں اس وہم میں ڈال دیتا ہے کہ دشمن کے کسی عمل نے ہمیں اس حال کو پہنچایا ہے۔ حالاں کہ حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے۔ ہم میں سے اکثریت مصیبت میں اس لیے گرفتار ہو جاتی ہے کیونکہ ہم غصے میں الفاظ کا صحیح استعمال نہیں کرتے۔ حالتِ غضب میں اپنے الفاظ پر ہمارا کنٹرول نہیں رہتا اور ہم دوسروں کو ایسی بات کہہ جاتے ہیں جس سے اُن کی دل آزاری ہوتی ہے۔ رب تعالیٰ اپنی مخلوق پر اِتنا مہربان ہے اور اُسے اپنے بندوں سے اِس قدر محبت ہے کہ وہ برداشت نہیں کرتا کہ کوئی اُس کے کسی بھی بندے کی دل آزاری کرے خواہ وہ بندہ مجھ جیسا گناہ گار، سرکش اور سیاہ کار ہی کیوں نہ ہو۔

اگر کسی کی زبان کی وجہ سے رب کے کسی بندے کا دل دُکھ جائے اور وہ بندہ پلٹ کر زیادتی کرنے والے کو کچھ نہ کہے، خاموش رہے تو رب خود اُس کی مدد کو آتا ہے۔

ہم اکثر غصے میں اپنے الفاظ پر قابو نہیں رکھ پاتے اور ایسے الفاظ کہہ دیتے ہیں کہ جن سے مخاطب کی دل آزاری ہو جاتی ہے۔ ہمارا یہ رویہ ہماری زندگی میں مشکلات کا سبب بنتا ہے۔

سوال: کیا رُوح بھی اچھی یا بُری ہوتی ہے؟ روح کی لطافت و بالیدگی سے کیا مراد ہے؟

جواب: سورۃ التین کے مطابق رب تعالیٰ نے انسان کو بہترین تقویم و توازن پر پیدا کیا۔ جب بچہ جنم لیتا ہے تو اُس کی حیثیت ایک ایسے کاغذ کی سی ہوتی ہے جو سفید ہو اور اُس پر کچھ تحریر نہ ہو۔ اب ماں باپ پر منحصر ہے کہ وہ اُس کورے کاغذ پر قرآنی آیات تحریر کرتے ہیں یا نازیبا الفاظ......! ہم بچے کو جو کچھ سکھاتے ہیں اُس کی شخصیت ویسی ہی بنتی چلی جاتی ہے۔ ہم غلط طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بچے کو نصیحت اور Dos & Do nots کے ذریعے سب سکھا لیں گے حالانکہ بچہ تو Observation (مشاہدہ) کے ذریعے سیکھتا ہے۔ وہ ہمیں جو کچھ کرتے دیکھتا ہے اس کو سیکھتا اور Copy کرتا ہے۔ یہی شخصیت آخرت کمانے کے کام آئے گی۔ جیسی شخصیت ویسی آخرت۔

میری بیٹی کی UK ٹرانسفر ہوگئی۔ وہاں اُنھوں نے اپنی بیٹی کو سکول میں داخل کرایا اور ایک روز محسوس کیا کہ چھ مہینے گزر گئے لیکن بچی کو ابھی تک انگریزی کے حروفِ تہجی ABC تک کی پہچان نہیں ہوئی۔ اُنھوں نے سکول جا کر ٹیچر سے Complain کی تو ٹیچر نے بغیر کوئی معذرت خواہانہ انداز اپنائے کہا "آپ درست کہتی ہیں۔ ہم مزید ایک سال اُسے کچھ نہیں پڑھائیں گے۔ ہمارے ہاں Pre-school year میں بچے کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ دوسروں کے حقوق کیا ہیں اور اُنھیں کیسے Respect کیا جاتا ہے۔ آپ کے اپنے حقوق کیا ہیں اور آپ نے اُنھیں کیسے Protect کرنا ہے۔"

یہ بہت باریک بات ہے۔ اگر انسان دوسروں کے حقوق کو Respect کرنے کا ڈھنگ سیکھ گیا تو مسلم کی آخرت اور غیر مسلم کی دُنیا سنور گئی۔ اُس پر دُنیا کے انعامات کی بارش ہو جائے گی کیونکہ رب تعالیٰ غیر مسلموں کی نیکی کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ اُنھیں دُنیا میں ہی صلہ عطا کر دیتا ہے البتہ آخرت میں اُن کا کوئی حصہ نہیں۔

رُوح سبھی کی اچھی ہے لیکن اُس نے دُنیا میں کیسے Behave کیا، آخرت کا دارومدار اِس رویے پر ہے۔ اگر ہم یہاں رب تعالیٰ کے حکم کے مطابق زندگی گزار لیں تو آخرت سنور جائے گی اور اگر اُس کی خلاف ورزی کرتے چلے گئے تو آخرت اچھی نہیں ہوگی۔

رُوح صرف اچھی ہے کیونکہ وہ بہترین تقویم پر بنائی گئی۔ یہ صرف اعمال ہیں جو اچھے یا بُرے ہیں۔

جہاں تک رُوح کی لطافت و بالیدگی کا تعلق ہے تو جس طرح جسم کو طاقت پہنچانے اور پروان چڑھانے کے لیے غذا ضروری ہے اُسی طرح رُوح کی غذا مثبت سوچ اور رب تعالیٰ کا ذکر ہے۔ اِس سے رُوح پھلتی پھولتی اور طاقت ور ہوتی ہے۔ رُوح جس قدر طاقت ور ہوگی اُسی قدر اُس کی پرواز بلند ہوگی۔ اِسی کو رُوح کی لطافت یا بالیدگی کہا جاتا ہے۔

سوال: ممتاز مفتی نے لکھا ہے کہ آپ کے مرشد صاحب نے آپ کو ایک لفظ پڑھنے کو دیا تھا اور ہدایت کی تھی کہ اس کے بعد دُعا نہیں مانگنی لیکن آپ نے دُعا مانگ لی جس پر وہ کچھ عرصہ آپ سے ناراض بھی رہے۔

جواب: یہ تو مجھ جیسے چھوٹے لوگ ہوتے ہیں جو اِس انتظار میں رہتے ہیں کہ کوئی معافی مانگے تو وہ اُسے معاف کر دیں۔ بڑے لوگ ایسا نہیں کرتے وہ دوسروں کو اُن کے معافی مانگے بغیر ہی دل میں معاف کر دیتے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ درویش کسی سے ناراض نہیں ہوتے۔ خفگی کا اِظہار بھی محض زبان سے ہوتا ہے، دل میں کبھی نہیں ہوتا کیونکہ اُنھیں اس کی اجازت ہی نہیں ہوتی۔ وہ کبھی بھی دل میں غصہ رکھ کر اپنا حال خراب نہیں کریں گے۔

فقیر کسی کے خلاف غصہ، کینہ، رنجش، دشمنی یا انتقام کا جذبہ دل میں نہیں رکھتے۔ اُن کا دل ایسی تمام آلائشوں سے پاک ہوتا ہے۔

مرشد صاحب کی وہ خفگی وقتی تھی اور اِس بات کا اِظہار تھی کہ تم نے میری محنت ضائع کر دی۔ دراصل مجھے اُس وقت یہ معلوم نہ تھا کہ وہ لفظ اِسمِ اعظم ہے۔ مرشد صاحب نے اُس لفظ کو پڑھ کر دعا مانگنے سے مجھے منع اِس لیے کیا تھا کیونکہ اِسمِ اعظم پڑھ کر دُعا مانگنے سے کام تو ہو جاتا ہے لیکن فقیر کا نام ولایت کی فہرست سے خارج ہو جاتا ہے۔

کوئی فقیر یا درویش کبھی اِسمِ اعظم پڑھ کر دُعا نہیں مانگتا۔ مجھے بہت بعد میں مرشد صاحب نے Disclose کیا کہ وہ لفظ اِسمِ اعظم تھا۔

معافی مانگنے کی کبھی نوبت ہی نہیں آئی اگرچہ ڈانٹ بہت کھائی اکثر اوقات عزت میں اِس قدر اضافہ ہوا کہ ''نکل جاؤ کمرے سے۔'' میں باہر کا ایک چکر لگا کر واپس چلا جاتا کیونکہ مرشد صاحب نے کبھی یہ نہیں فرمایا تھا کہ واپس نہیں آنا۔

نشست نمبر 18

عالمِ اسرار

سوال: مقامِ حیرت، عالمِ ہاہوت، عالمِ لاہوت اور عالمِ جبروت سے کیا مراد ہے؟

جواب: جہاں عالمِ ہاہوت کی اِنتہا ہوتی ہے وہ مقامِ حیرت ہے۔ عالمِ ہاہوت سے مراد وہ عالم ہے جو تخلیقِ کائنات سے پہلے موجود تھا۔ اِس میں ہر سو سناٹا تھا۔ اسی سناٹے کی وجہ سے اسے عالمِ ہاہوت کہا جاتا ہے۔ عالمِ ہاہوت کا ذکر بائبل میں بھی موجود ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ عیسائیت تقریباً دو ہزار سال پرانا مذہب ہے۔ بائبل کا ترجمہ عبرانی اور پھر انگریزی میں ہوا۔ بائبل میں مختلف عالمین کے لیے Dews کا لفظ استعمال کیا گیا اور پھر متعلقہ عالم کا نام لیا گیا۔ ہندوؤں کی متبرک کتب میں ''براہم'' کا ذکر ملتا ہے۔ ''براہم'' سنسکرت میں عالم کو کہتے ہیں۔ بائبل میں عالمِ ہاہوت کی تعریف کچھ اِن الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

''جب کچھ نہیں تھا، صرف رب، فرشتے اور جنات تھے تو رب نے چاہا کہ ایک ایسی تخلیق ہو جس سے اُس کا اِظہار ہوتا ہو تب رب نے اِس کائنات اور پھر انسان کو تخلیق کیا۔''

کائنات کی تخلیق سے پہلے کی صورت حال اور ماحول عالمِ ہاہوت کہلاتا ہے۔

عالمِ لاہوت درحقیقت عالمِ تجلیات بھی کہلاتا ہے۔ اِس عالم میں ایک Continuous process کے تحت تجلیات کے چھوٹے چھوٹے دائرے وجود میں آتے اور پھر پھیلتے چلے جاتے ہیں حتیٰ کہ تجلیات کے یہ دائرے پوری کائنات کو اپنے گھیرے میں لے لیتے ہیں۔ عالمِ تجلیات کی اِنتہا ''نہر تسوید'' پر ہوتی ہے جس سے آگے اندھیرا ہے۔ یہ وہی ''نہر تسوید'' ہے جس سے علم کی نہریں نکلتی ہیں۔ نہر تسوید بحرِ نورالمروارید سے برآمد ہوتی ہے جس سے علم کی 118 نہریں نکلتی ہیں۔ جن میں سے چار علوم کا علم خالصتاً رب تعالیٰ کے پاس ہے، باقی 114 علوم کی نہریں مخلوق کے لیے ہیں۔

یہ عرش پر سب سے بلند مقام ہے۔ اِسے مقامِ محمود کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ اذان کے بعد دُعا میں بھی اِسی مقامِ محمود کا ذکر ہے۔ عالمِ لاہوت سے اگلا مقام ''عالمِ جبروت'' ہے۔ یہ وہ مقام یا صورت حال ہے جو تخلیقِ کائنات کے بعد ظہور پذیر ہوئی۔ کائنات اور دیگر چیزوں کی تخلیق کے بعد جو رنگ و روپ نکلا وہ عالمِ جبروت کہلایا۔ یہ وہ عالم ہے جس سے بعد میں انسانی زندگی کا تعلق پیدا ہوا۔

رب تعالیٰ اِن عالمین کی سیر انسان کو اُس وقت کراتا ہے جب وہ علم کے ایک خاص مقام پر پہنچ جاتا ہے اور اُس کے اعمال اِس قابل ہو جاتے ہیں کہ وہ اسرارِ الٰہی کا مشاہدہ کر سکے۔

ہمارے ہاں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ شاید رب تعالیٰ تسبیحات سے ملتا ہے حالاں کہ رب ملتا ہے اطاعت اور بندگی سے۔ لیکن وہ بندگی Selective نہ ہو کہ جو احکام مجھے Suit کرتے ہیں اُن کی اِطاعت تو کرتا ہوں اور جو احکام مجھے Suit نہیں کرتے اُنھیں Conveniently نظر انداز کر دیتا ہوں۔ تسبیحات نہیں بلکہ غیر مشروط اِطاعت رب تعالیٰ تک لے جاتی ہے۔ بغیر اخلاص کے کیے جانے والے ذکر اذکار انسان میں عاجزی کا تکبر پیدا کرتے ہیں۔ جو سب سے خوف ناک تکبر ہے۔

جب انسان بغیر اخلاص کے ذکر اذکار اور تسبیحات کرتا ہے تو سمجھنے لگتا ہے کہ شاید میں عاجزی کی طرف چلا گیا۔ یہ دراصل عاجزی نہیں ہوتی کیونکہ ایسے انسان پر اگر کوئی شخص تنقید کر دے یا کوئی سخت بات کہہ دے تو وہ انسان سختی سے React کرتا ہے۔ یہ Reaction عاجزی کے تکبر کا نتیجہ ہوتا ہے۔

اعمال ہوں یا عبادات...... دونوں میں اخلاص بے حد ضروری ہے۔ جب رب تعالیٰ راضی ہوتا ہے تو وہ بندے کو علم عطا کرتا ہے اور یہ علم مختلف ذرائع سے عطا کیا جاتا ہے جن میں سے ایک ذریعہ یا طریقہ اسرارِ عالم کی سیر بھی ہے۔ رب تعالیٰ اپنے بندے کو عالمِ ہاہوت، عالمِ لاہوت، عالمِ جبروت کی سیر کراتا اور اپنی قدرت کی نشانیاں دکھاتا ہے۔

سوال: صدقہ وخیرات میں کیا فرق ہے۔

جواب: عربی میں صدقہ وخیرات کو ایک ہی معنوں میں لیا جاتا ہے جب کہ ہمارے معاشرے کے مطابق صدقہ وہ ہے جو انسان کو کسی مشکل سے محفوظ رکھنے اور بلا سے بچانے کے لیے دیا جاتا ہے۔ یہ سوچ ہندو کلچر سے Influenced ہے۔ خیرات وہ ہے جو اللہ کے نام پر ہم کسی کو دیتے ہیں۔ ہم جو صدقہ و خیرات کرتے ہیں اُس پر سب سے پہلا حق اُن رشتہ داروں کا ہے جو مالی لحاظ سے زیادہ Fortunate نہیں ہیں۔ اس کے بعد پڑوسی اور پھر قریبی جاننے والے۔ اسلام میں اس سب کی وضاحت موجود ہے۔ اِس سلسلے میں یہ احتیاط کر لیا کیجیے کہ کسی سید کو زکوٰۃ، صدقہ یا خیرات نہ دیں۔ اگر اُنھیں کچھ دینا مقصود ہو تو وہ بطور ہدیہ پیش کر دیا جائے۔

سوال: کیا رب کا شکر نماز کے علاوہ بھی کیا جا سکتا ہے جب کہ نماز میں خشوع وخضوع بھی نہ ہو؟

جواب: نماز فرض ہے۔ نماز اِظہارِ بندگی اور اقرارِ بندگی ہے۔ بندگی کے اقرار کو ظاہر کرنے کا نام نماز ہے۔

رب تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے ہمیں جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں ہم اُن میں دوسروں کو حصہ دار بنا لیں۔ لیکن یہ نہ سوچیں کہ ہم اِن کی مدد کر رہے ہیں بلکہ یہ سوچیں کہ میرے پاس جو کچھ بھی ہے یہ سب میرے رب کا عطا کردہ ہے۔ اس پر رب کے بندوں کا حق ہے۔ ضرورت مند جو کچھ مجھ سے لے کر جا رہا ہے یہ اُس کا حق ہے اور یہ اُس کا احسان ہے کہ وہ خود آ کر مجھ سے اپنا حق لے گیا اور یوں اُس نے مجھے اُس تگ و دو سے بچا لیا جو مجھے اُسے یہ حق پہنچانے کے لیے کرنا پڑتی۔ میرے خیال میں یہ شکر ادا کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔

شکر ادا کرنے کا ایک کم تر درجہ یہ ہے کہ انسان دل میں کہتا رہے "یا اللہ! تیری بڑی مہربانی کہ تو نے مجھے یہ سب اپنی رحمت کے صدقے عطا فرمایا ہے جب کہ یہ سب میرا استحقاق نہیں ہے۔"

شکر ادا کرنے کا اِس سے بھی کمتر درجے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان زبان سے کہتا ہے "اللہ! تیرا شکر!"

جس طرح شکر ادا کرنے کے مختلف طریقے ہیں اسی طرح ناشکر گزاری کے بھی مختلف انداز ہیں۔ فقیر کے نزدیک ایسے کلمات زبان پر لانا کہ "دُعائیں مانگنے اور کوشش کرنے کے باوجود مجھے فلاں چیز عطا نہیں ہوئی" بھی ناشکر گزاری ہے۔ صبح سے شام تک ہم اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہزار ہا نعمتیں اور عنایات انجوائے کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ عنایات اور نعمتیں ہمیں یاد نہیں رہتیں۔ یاد رہتی ہے تو صرف ایک وہ نعمت جو کسی وجہ سے ہم انجوائے نہ کر سکے۔ اُس ایک نعمت کی محرومی کا شکوہ ہم جگہ جگہ کر رہے ہوتے ہیں...... یہ ناشکر گزاری ہے۔ اسی طرح صاحبِ دُعا کے پاس جا کر یہ کہنا "مجھے فلاں شے نہیں ملی۔ آپ دُعا کر دیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے وہ شے عطا کر دے۔" میری انڈرسٹینڈنگ کے مطابق یہ بھی رب کا شکوہ اور گلہ بیان کرنے کے مترادف ہے جو قابلِ ستائش رویہ نہیں ہے کیونکہ رب آقا و مالک ہے وہ جو چاہے کرے اور یقیناً وہ جو کرتا ہے بہترین ہوتا ہے۔

سوال: ہم اپنے اعمال اور اطوار چودہ سو سال پہلے کے مسلمانوں جیسے کس طرح بنا سکتے ہیں؟

جواب: بہت سادہ اور سیدھی سی بات ہے کہ ہم اپنی زندگی میں کوئی بھی بات کرنے اور قدم اُٹھانے سے پہلے یہ سوچ لیا کریں کہ ایسے موقع پر آپ ﷺ کا طرزِ عمل اور رویہ کیا تھا۔ ہم بھی ویسا ہی کر لیں۔ یوں ہم سنت کے عین مطابق زندگی بسر کرنے لگیں گے۔ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ بہترین نمونہ ہے۔ جب ہم آپ ﷺ سے محبت کا زبانی اظہار کرنے کے بجائے عملی اِظہار کریں گے تو پھر ہمارے اطوار اور اعمال بھی ویسے ہی ہو جائیں گے جیسے چودہ سو سال پہلے کے مسلمانوں کے تھے۔

سوال: یورپ میں اخلاقیات کم لیکن ڈسپلن زیادہ ہے۔ وہاں رُوح کی بالیدگی کا کوئی سامان نہیں۔ میں رُوح کی بالیدگی کے لیے پاکستان آیا ہوں کہ شاید مجھے یہاں کوئی ایسا حمام یا نہر مل جائے کہ جس میں نہا کر میری رُوح کی کثافتیں دُور ہو سکیں لیکن یہاں بھی مجھے باتیں زیادہ اور عمل کم دکھائی دیتا ہے۔

جواب: جب انسان عمل کے بجائے باتوں کا دھنی ہو جائے، اُس کے پاس صرف زبانی دعوے رہ جائیں تو پھر یہی صورت حال ہوا کرتی ہے جو غیر ملک سے آئے ایک صاحب کو یہاں محسوس ہوئی۔

میں خود اِسی تلاش میں ہوں کہ مجھے کوئی نہر، کنواں یا حمام مل جائے کہ جس میں نہا کر میں اپنی رُوح کی کثافتیں دُور کر سکوں۔ لیکن بدقسمتی سے رُوح کی کثافتیں نہ باتوں، نہ ہی دعووں سے اور نہ ہی اپنے آپ کو اچھا کہنے سے دُور ہوتی ہیں۔ رُوح کی کثافتیں دُور کرنے کے لیے تو انسان کو Mill (چکی) سے گزرنا پڑتا ہے، خود کو چکی کے دو پاٹوں میں رکھ کر پیسنا پڑتا ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم سدا سے ایسے نہ تھے۔ آج سے 65 برس قبل ہماری اخلاقی حالت آج کی نسبت کہیں بہتر تھی۔ جب سے عمل کو چھوڑ کر ہم نے زبانی باتوں کو اپنایا تب سے ہماری اخلاقی حالت ایسی ہو گئی۔

میں سرکاری وذہنی حیثیت سے جس جس فورم پر گیا، ڈھکے چھپے لفظوں میں مجھ سے یہی بات کہی گئی جو ابھی آپ نے فرمائی۔ میرا جواب ہمیشہ یہی رہا کہ ہم بزعم خود تو بہت اچھے ہیں لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ ہمیں کوئی دوسرا اچھا ماننے پر تیار نہیں ہو رہا۔ وجہ یہ ہے کہ ہم آپ ﷺ کی سنت سے بہت دُور چلے گئے۔ مذہب کے بارے میں بھی ہم Selective ہو گئے۔

رُوح کی پاکیزگی حاصل کرنے کے لیے ہمیں کوئی نہر، کنواں یا حمام نہیں ملے گا۔ اِس کا اہتمام ہمیں خود ہی کرنا ہو گا۔ ایک انگریزی محاورہ یاد آ گیا کہ

You take care of pennies, pounds will take care of themselves.

اگر ہم چھوٹی چھوٹی باتوں میں سنت پر عمل کرنے لگے تو بڑی باتوں میں ہم خود بخود درست ہو جائیں گے کیونکہ ہم عادتاً بہتر عمل کرنے لگیں گے۔ پھر کسی بھی غیر ملکی کو یہ نہیں کہنا پڑے گا کہ پاکستان میں پاکیزہ اطوار لوگ نہ مل سکے۔

سوال: آپ نے ایک بار فرمایا تھا کہ دو صوفی آپس میں Ciphered language میں گفتگو کرتے ہیں۔ Ciphered language سے کیا مراد ہے؟

جواب: اِس سے مراد یہ ہے کہ رُوحانیت کی Terminology میں اُن کی گفتگو ہوتی ہے جسے شاید پاس بیٹھا عام انسان نہ سمجھ سکے اور اُسے یوں محسوس ہو کہ جیسے وہ صوفیا کسی ایسی چیز کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں جو دُنیا میں پائی ہی نہیں جاتی۔ صوفیا کی Language کے Ciphers مختلف ہوتے ہیں بالکل اُسی طرح کہ جیسے فوج کے دو افسر اہم پیغامات Ciphered language میں ایک دوسرے سے Communicate کرتے ہیں۔ لیکن وہ Ciphers کیا ہیں؟ وہ کسی کے علم میں نہیں آتے اور نہ ہی فوجی افسران کو اُن کے بارے میں کسی کو بتانے کی اجازت ہوتی ہے۔

انسان جب علم حاصل کرتا ہے اور خاص مقام پر پہنچ جاتا ہے تو یہ سب باتیں خود بخود اُس کے علم میں آنے لگتی ہیں۔ لیکن اُس وقت تک وہ اِتنا باظرف ہو چکا ہوتا ہے کہ اُنھیں زبان پر نہیں لاتا۔

میں تو یہ دُعا کر سکتا ہوں کہ جن صاحب نے بھی یہ سوال پوچھا ہے اللہ تعالیٰ اُنھیں اپنی رحمت کے صدقے اُس مقام پر لے جائے کہ وہ برگزیدہ صوفی بن جائیں۔ تب Ciphered language خود بخود اُن کی سمجھ میں آ جائے گی۔ اللہ تعالیٰ اُنھیں علم عطا فرما دے گا اور وہ بڑا Freely ciphered language میں کسی اور صوفی سے Communicate کر پائیں گے۔

نشست نمبر 19

علم حصولی وحضوری اور دُرستی اعمال

سوال: علم حصولی اور علم حضوری سے کیا مراد ہے؟

جواب: علم حصولی وہ علم ہے جو آپ کے ٹیچر، مرشد اور گائیڈ آپ کو سکھاتے ہیں یا پھر آپ مرشد، ٹیچر یا گائیڈ کا مشاہدہ کرتے ہیں، اُنھیں دیکھتے، سنتے اور پڑھتے ہیں اور اِس سے مختلف نتائج اخذ کرتے ہیں۔ اُن اخذ شدہ نتائج کے بعد آپ کی زندگی میں جو تبدیلیاں آتی ہیں اُسے علم حصولی کہا جاتا ہے۔

علم حضوری دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

1۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جو علم الاسماء سکھایا تھا وہ ہر انسان میں Genetically منتقل ہوا ہے۔ ہر انسان خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہے اُس کے Genes میں وہ علم موجود ہے۔ اِسے Innate knowledge (جبلی یا طبعی علم) بھی کہتے ہیں۔

جب ہمارے گائیڈ، ٹیچر یا مرشد ہم پر توجہ ڈالتے ہیں تو اِس توجہ کے نتیجے میں ہماری قلبی کیفیت بدلتی ہے۔ ہم دُنیاوی Dimension سے نکل کر Spiritual dimension میں چلے جاتے ہیں۔ اِسے ہم کایا پلٹنا یا قلب کا بدلنا بھی کہتے ہیں۔ قلب کا بدلنا Transformation ہے دُنیا کی Dimension سے نکل کر Spiritual dimension میں داخل ہونے کی۔

جب ہم Spiritual dimension میں داخل ہوتے ہیں تو ہمارا Innate knowledge باہر آتا ہے اور ہم اُن چیزوں کے بارے میں جاننے لگتے ہیں جن کے بارے میں ہمیں پہلے معلوم نہیں تھا۔ ایسے میں ہم بے اِختیار کہہ اُٹھتے ہیں:

I learn from my own self.

2۔ جب میں بات کر رہا ہوتا ہوں تو اپنی ہی بات سے سیکھ رہا ہوتا ہوں۔ یہ Innate knowledge ہے جو اندر سے اُبھرتا ہے اور اکثر اوقات ہمیں خود ادراک نہیں ہو پاتا کہ ہمیں تو یہ بھی پتا تھا۔ علم کی یہ قسم "حضوری علم" کہلاتی ہے۔

علم حضوری کی دوسری شکل یا قسم یہ ہے کہ جب انسان رُوحانیت اور علم کے اُس مقام پر چلا جائے کہ

جہاں اُسے اجازت مل جائے کہ وہ آپ ﷺ کی محفلِ اقدس میں حاضر ہو سکتا ہے تو اُس حاضری کی نسبت سے علم کا یہ خاص Level ''علم حضوری'' کہلاتا ہے۔

علم کی یہ دونوں صورتیں دراصل ایک ہی ہیں کیونکہ جب ہمارے اندر کا علم باہر آنے لگتا ہے تو اِس کا مطلب ہے کہ ہمارے اندر سے دُنیا کی محبت ختم ہو گئی ہے، ہم رب تعالیٰ کی طرف رُجوع کرنے لگے ہیں، ہمارے اندر وہ پاکیزگی اور طہارت پیدا ہو گئی ہے جو آپ ﷺ کی محفل میں حاضری کے لیے ضروری ہے۔

رُوح کی طہارت علم سے ہوتی ہے۔ جب وہ علم اُجاگر ہوتا ہے تو انسان اُس مقام پر چلا جاتا ہے کہ اُسے آپ ﷺ کی محفل میں حاضری کی اجازت مل جاتی ہے۔

جب تک اندر کا علم اُبھر کر باہر نہیں آئے گا ہمیں Innate knowledge کا ادراک نہیں ہو گا۔ اِسی لیے الہام، کشف، علم غایت تینوں لازم و ملزوم ہیں۔ جب تک یہ تینوں چیزیں اکٹھی نہیں ہوں گی علمِ حضوری حاصل نہیں ہو گا۔

سوال: ایک شخص جو ساری عمر نماز روزے کا پابند رہا ہو، اُس نے اپنی اولاد کی اچھی تربیت کی ہو، اگر آخری عمر میں اُس کے اسلام کے بارے میں Concepts گڑبڑ ہو جائیں تو ایسے میں اولاد کی کیا ذمہ داری ہے؟

جواب: ہمیں اپنے والدین کے بارے میں بہت محتاط رہنا چاہیے۔ بیان کردہ صورت حال میں اولاد کو ضرور Concerned ہونا چاہیے کیونکہ والد ایسی ہستی ہیں جن کے بارے میں ترمذی کی ایک حدیث میں ہے:

......ترمذی و ابن ماجہ نے روایت کی ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ''والد جنت کے دروازوں میں بیچ کا دروازہ ہے، اب تیری خوشی ہے کہ اس دروازہ کی حفاظت کرے یا ضائع کردے۔'' (سنن الترمذی، کتاب البر والصلة باب ماجاء من الفضل فی رضا الوالدین، حدیث:1907)

ایک اور حدیث میں ہے:

......امام ترمذی نے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''پروردگار کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے اور پروردگار کی ناخوشی باپ کی ناراضی میں ہے۔'' (سنن الترمذی، کتاب البر والصلة باب ماجاء من الفضل فی رضا الوالدین، حدیث:1907)

ادب و احترام کے دائرے میں رہ کر والد کو مختلف طریقوں سے سمجھایا جا سکتا ہے جیسا کہ ایک بار حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ نے دیکھا کہ ایک صاحب غلط وضو کر رہے ہیں۔ جب وہ صاحب وضو کر چکے تو حضرت امام حسینؓ بڑے ادب سے فرمایا ''جناب! میں وضو کرتا ہوں، آپ دیکھ کر بتایئے گا کہ میں کہیں اِس

میں غلطی تو نہیں کر رہا۔'' یوں اُن صاحب کی خود بخود اصلاح ہو گئی۔ والد کا رشتہ تو بہت عزت و احترام کا ہے۔ دشمن بھی اگر عمر میں بڑا ہو تو اُس کے ساتھ معاملات کرتے وقت حتی المقدور اُس کی عزت و تکریم میں فرق نہیں آنے دینا چاہیے۔

اگر آپ کے والد صاحب کے Concepts کہیں گڑبڑ ہو گئے ہیں تو کوشش کیجیے کہ اُنھیں ایسی کتابیں بطور تحفہ پیش کریں جو اُن کے Concepts (تصورات) Clear کر سکیں۔

سوال: کیا اسلام واقعی مکمل ضابطۂ حیات ہے؟

جواب: اسلام کے بارے میں کوئی بھی اظہارِ خیال کرنے سے پہلے اگر میں یہ جان لوں کہ ضابطۂ حیات کسے کہتے ہیں تو معاملہ Clear ہو جائے گا۔ مجھے سوچنا ہی نہیں پڑے گا کہ اسلام ضابطۂ حیات ہے یا نہیں۔

ضابطۂ حیات Way of life، زندگی گزارنے کے ڈھنگ اور ڈسپلن کو کہتے ہیں۔ یہ بات Clear ہونے کے بعد یہ دیکھ لیا جائے کہ اسلام ہمیں سکھاتا کیا ہے۔ کیا صرف یہ کہ رب کون ہے؟ ہم صبح سے شام تک کون کون سی عبادات کریں؟ اگر وہ ہمیں صرف یہی سکھاتا ہے تو پھر وہ دین نہیں بلکہ صرف مذہب ہے۔ لیکن اگر اسلام ہمیں ساتھ یہ بھی سکھا رہا ہے کہ کھانے سے پہلے ہاتھ دھوئے جائیں اور کپڑے سے اُنھیں پونچھا نہ جائے۔ کھانا پلیٹ میں سامنے سے لیا جائے، چھوٹا نوالہ لیا جائے، چباتے ہوئے آواز نہ نکالی جائے۔ دائیں کروٹ سویا جائے۔ جوتا پہلے سیدھے پاؤں میں پہنا جائے اور اُتارتے ہوئے پہلے بایاں جوتا اُتارا جائے۔ کسی کے گھر جائیں تو اہلِ خانہ کو باہر بلانے کا طریقہ کیا ہے۔ کپڑا کیسا پہنا جائے۔ میدانِ جنگ میں جب ہتھیار اُٹھا لیے جائیں تو کس طرزِ عمل کا مظاہرہ کرنا ہے اور جب ہتھیار پھینک دیے جائیں تو کیسے Behave کرنا ہے۔ پڑوسیوں کے ساتھ کیسے سلوک کرنا ہے۔ اگر اسلام عبادات کے ساتھ ساتھ تمام معاملات کے بارے میں بھی بتا رہا ہے تو پھر یہ مذہب نہیں بلکہ دین ہے۔ اب آپ خود فیصلہ کر لیجیے کہ اسلام ضابطۂ حیات ہے یا نہیں۔

سوال: ہم علم حضوری جاننے کے تو شوقین ہیں لیکن ''جی حضوری'' کا رویہ نہیں چھوڑ سکتے۔ اللہ اور آپ ﷺ کو راضی کرنے کے لیے ہماری نظر ابتدائی طور پر کن اُمور پر ہونی چاہیے؟

جواب: بدقسمتی سے ہم علم نافع نہیں ڈھونڈتے حالانکہ آپ ﷺ نے ایسے علم سے پناہ مانگی جو نافع نہ ہو۔ علم نافع وہ ہے جس سے انسان کو فائدہ ملتا ہے۔ ہم ایسے علم کے بارے میں بحث و مباحثے میں مبتلا رہتے ہیں اور پرائمری سطح پر ایسے علم کے حصول کی تگ و دو میں رہتے ہیں جس کی ضرورت بہت Advanced stage پر پڑتی ہے۔ ہمارا یہ رویہ صرف علم ہی کے بارے نہیں بلکہ ہر شعبۂ زندگی میں ہم ظاہری چیزوں اور Cosmetic treatment پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ حالاں کہ ہمیں فکر تو اس بات کی ہونی چاہیے کہ ہم سے جن اعمال کے بارے میں سب سے پہلے پوچھ گچھ کی جائے گی اور جن کی بنیاد پر جنت یا جہنم کا فیصلہ ہو گا۔ ہم پہلے اپنے وہ اعمال درست کر لیں پھر Advanced stage کے علم کے حصول کی فکر کریں۔

بعض اوقات ہم محض بحث مباحثے کی خاطر مشکل Terms اور Points جاننے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اہلِ محفل کو حیران اور Impress کر کے اپنے علم کی دھاک بٹھا سکیں۔

علم حضوری بہت Advanced level کی بات ہے۔ مجھے علم حضوری کے حصول سے پہلے اپنی نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے بارے میں سوچنا چاہیے کہ کیا میں نماز خشوع وخضوع سے پڑھ پاتا ہوں؟ زکوٰۃ پوری ادا کرتا ہوں؟ کم از کم فرض روزوں میں کوتاہی تو نہیں کرتا؟ صاحب استطاعت ہونے کے باوجود حج کرتا ہوں یا نہیں۔ پھر میں اپنا یہ بھی جائزہ لوں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ میں اپنے پڑوسیوں اور اعزہ واقارب کے حقوق ادا نہیں کرتا، Road users کو مشکل میں ڈالے رکھتا ہوں۔ میرے گھر میں بجنے والا ریڈیو، چلنے والا ٹی وی اور میرے بچے اپنی بلند آواز سے دوسروں کا سکون خراب کرتے رہتے ہیں۔ میں نے آج تک نہیں سوچا کہ میں قدم قدم پر ملکی قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہوں جس کے لیے مجھے اللہ کے حضور ایک روز Answerable ہونا ہے...... میں صبح سے شام تک Law of Allah اور Law of the land کی خلاف ورزی کرتا رہتا ہوں، Pastime hobby کے طور پر ہر وقت غیبت میں مبتلا رہتا ہوں۔ یہ سب میرے نامۂ اعمال پر گناہوں کی سیاہی پھیرتے چلے جا رہے ہیں جس کا احساس مجھے روزِ حساب ہوگا جب مجھے اپنے نامۂ اعمال میں گناہوں کی سیاہی کے بغیر کچھ نظر نہ آئے گا۔

میرے علم کے مطابق جنت دوزخ کا فیصلہ کرتے وقت مجھ سے کہیں یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تم علمِ حضوری اور علمِ حصولی کی تعریف جانتے ہو یا نہیں۔

اگر اللہ پاک مجھ پر رحم فرما دے اور میں اُن معاملات کو ٹھیک کرلوں جن کی بنیاد پر سزا و جزا کا فیصلہ ہونا ہے تو یہ زیادہ بہتر رویہ ہے۔

خوشامد بھی ایک ایسا ہی زہر ہے جو میری زندگی کو آلودہ کیے ہوئے ہے۔ میں بغیر یہ سوچے کہ یہ کتنا بڑا جھوٹ ہے اور میرے گناہوں میں اضافہ کا سبب ہے، سب کی جی حضوری کرتا رہتا ہوں۔ اگر میں ان ساری باتوں کو سمجھ لوں اور اپنا طرزِ عمل صحیح معنوں میں درست کرلوں تو مجھے یقین ہے کہ میرا رب اور آپ ﷺ مجھ سے راضی ہو جائیں گے۔

سوال: کیا محض دُعا ہی کافی ہے؟

جواب: وہ کام یا معاملات جن کے لیے کوشش ضروری ہے وہ محض دُعا سے نہیں ہوتے۔ اسی طرح اعمال جن کی بنیاد پر سزا و جزا کا فیصلہ ہونا ہے وہ بھی ہمیں بذریعہ کوشش ہی درست کرنے ہیں۔ آپ سارا قرآن پاک پڑھ لیں، اُس میں جگہ جگہ یہی ذکر ملے گا کہ رب سننے والا ہے، رب سے مانگو وہ عطا کرے گا، لیکن یہ کہیں نہیں لکھا کہ انسان کو وہی کچھ ملے گا جس کے لیے وہ دُعا کرتا ہے۔ اس کے برعکس یہ فرمایا گیا کہ انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے۔

بدقسمتی سے میں نے ہر مسئلہ کا حل دُعا ڈھونڈا ہے۔ بچے کی تربیت کرنا میری ڈیوٹی ہے۔ اس کے لیے میں

اللہ کے حضور جواب دہ ہوں لیکن میں اُس کی تربیت پر دھیان نہیں دیتا۔ جب وہ بگڑ جاتا ہے تو میں صاحب دُعا کے پاس جا کر عرض کرتا ہوں کہ دُعا کریں میرا بیٹا سدھر جائے۔ حالانکہ اگر وہ بگڑ گیا ہے تو اس کے سدھار کے لیے مجھے خود کوشش کرنی ہے۔ اگر میں نماز نہیں پڑھتا تو یہ میری ذمہ داری ہے کہ وقت پر نماز ادا کروں لیکن میں آپ جیسے نیک آدمی کے پاس جا کر بیٹھ جاتا ہوں کہ دُعا کردیں میں باقاعدگی سے نماز ادا کرلیا کروں۔ دوسری طرف یہ دُعا کراتے ہوئے میرے ذہن میں یہ خیال آرہا ہے کہ میں جلدی سے دُعا کرا کر کیسینو چلا جاؤں۔ میں کیسینو جانے کے لیے کوشش جب کہ مسجد جانے کے لیے صرف دُعا کراتا ہوں۔

یہ جو رب تعالیٰ نے کام کی انجام دہی کو کوششوں کے ساتھ مشروط کردیا اور سزا و جزا اعمال کے ساتھ منسوب ہوگئے تو ایسے میں دُعا کرنی چاہیے لیکن کوشش کے بعد۔ اور اگر کوشش سے پہلے دُعا کرنا چاہتے ہیں تو پھر یوں کہا جاسکتا ہے "یا اللہ! تو مجھے کوشش کرنے کی توفیق بخش دے۔"

لیکن یاد رکھیے کہ محض دُعا کام نہیں آئے گی، ساتھ کوشش بھی کرنا ہوگی۔

سوال: اسلام کا اکنامک سسٹم کیا ہے؟ ایک ماہر اقتصادیات کے مطابق اسلام کے اکنامک سسٹم میں سوشلزم اور Capitalism کی تمام اچھائیاں موجود ہیں۔

جواب: اسلام میں صرف اکنامک سسٹم ہی نہیں بلکہ تمام چیزوں کی بنیاد خوفِ خدا اور اللہ کے سامنے جواب دہی پر ہے۔ اسی لیے میں حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول دہرایا کرتا ہوں:

"اہلِ علم اہلِ عقل ہیں جب کہ فقیر اہلِ عشق ہیں۔"

عقل Logic کا راستہ پکڑتی ہے۔ عشق صرف دل کا کہا مانتا ہے۔ یہ جذبے کا نام ہے اور جذبے میں عقل کا کوئی کام نہیں۔ جو اہلِ عشق ہیں وہ تو یہ جانتے ہیں کہ اسلام کی بنیاد اللہ سے محبت پر ہے اور چونکہ انسان رب تعالیٰ سے محبت کرتا ہے اِس لیے اُس کے دل میں ہر وقت ڈر رہتا ہے کہ میرا رب میرا محبوب مجھ سے ناراض نہ ہو جائے۔ وہ محبوب کو راضی رکھنے کے لیے اُس کی ہر بات مانتا رہتا ہے۔ اسلام کی ساری فلاسفی اسی بات میں ہے۔ چونکہ اسلام میں ایک دوسرے کے کام آنے، دوسرے کی مدد کرنے، بھوکے کو کھانا کھلانے اور اپنی ضروریات پر دوسروں کی ضروریات کو ترجیح دینے کی تلقین ہے اس لیے اسلام کا اکنامک سسٹم اللہ سے محبت اور اللہ کی ناراضی کے خوف پر مبنی ہے کہ اگر میرے پاس فالتو پیسہ ہے تو مجھ پر لازم ہے کہ اپنے ایسے مسلمان بھائی کو قرضِ حسنہ کے طور پر ہی دے دوں جو تہی دامن ہے اور مدد لینے والے پر فرض ہے کہ جونہی اُس کے حالات بہتر ہو جائیں وہ اُس رقم کو لوٹا دے۔ اگر وہ پارٹنرشپ کرتا ہے تو پوری دیانت داری سے بزنس چلائے اور نفع ونقصان میں پارٹنر کو شریک کرے۔

اس کے برعکس ماڈرن اکنامک سسٹم خواہ وہ سوشلزم ہو یا Capitalism، اس کی بنیاد خوفِ خدا پر نہیں بلکہ اِس سوچ پر ہے کہ اُتنا حاصل کروں گا جتنا اپنی طرف کھینچ سکتا ہوں۔ میں جتنا کسی کو اُدھیڑ سکتا ہوں، اُدھیڑ لوں۔

سوشلزم کی اچھائیاں غیر فطری ہیں۔ ہر شخص خواہ وہ جتنا عقل مند، تعلیم یافتہ و تربیت یافتہ ہے اُس کے لیے اس سسٹم میں Disregard ہے۔ ایک مزدور بھی وہی تنخواہ لے گا جو ایک ایم بی بی ایس ڈاکٹر۔ ایک مزدور بھی اُسی حال میں رہے گا جس میں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ۔ یہ فطرت کے منافی نظام ہے۔

اسلام یہ تو کہتا ہے کہ ہر سٹیٹ ویلفیئر سٹیٹ ہوگی اور ہر شخص کو بنیادی سہولیات فراہم کر دی جائیں گی۔ لیکن اسلام کا اکنامک سسٹم کسی شخص پر یہ پابندی نہیں لگاتا کہ وہ اپنی قابلیت، سمجھ اور عقل استعمال کر کے ایک حد سے آگے نہ کمائے۔ یہ سسٹم تو یہ کہتا ہے کہ وہ انسان جتنا چاہے کما لے۔ اِس کے بعد انسان کے فرائض شروع ہو جائیں گے کہ رب تعالیٰ نے اگر اُسے وافر رزق عطا فرمایا ہے تو اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد وہ اُسے دوسروں پر خرچ کر دے۔ حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت سلمان فارسیؓ اس کی بہت بڑی مثال ہیں۔

سوشلزم میں تو ہر ایک کو ایک سا ملے گا۔ اُونٹ کو بھی کھانے کو اُتنا ہی ملے گا جتنا ایک بھیڑ کو ملتا ہے۔ Capitalism میں بے رحمی ہے۔ کوئی شخص کسی کو جتنا اُدھیڑ سکتا ہے اُدھیڑ لے۔ اسلام اِس کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام میں تو کاروبار میں سچائی اور دیانت پہلی شرط ہے۔

اسلام کا معاشی نظام سوشلزم اور Capitalism کی خوبیوں سے کہیں بلند تر ہے۔ اِس میں نہ Capitalism والی بے رحمی ہے نہ سوشلزم والی ناانصافی۔ اِس کے مطابق تو آپ کو خود کو Volunteer کرنا ہے کہ جو زائد دولت ہے رب کی خوشی اور رضا کے لیے اپنے اُن بھائیوں کو دے دیں جو Less fortunate ہیں اور پھر یہ بھی یاد رکھتے ہیں کہ جو دوسروں کے ساتھ نیکی کر کے جتاتے ہیں اُن کی نیکی اُن کے منہ پر مار دی جاتی ہے۔ دوسری طرف جس کے ساتھ نیکی کی جا رہی ہوتی ہے اُس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے محسن کی نیکی کا چرچا کرے۔

اسلام کا معاشی نظام خوفِ خدا اور رب سے محبت پر Based ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ آپ دُنیا کے سارے مذاہب اور Man-made systems کو Study کر لیں، اِن سب میں اسلام کا Penal Code مختصر ترین ہے۔ جب کہ ہمارے معاشرے میں ہمیشہ اِس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ اور کچھ لاگو ہو یا نہ ہو لیکن اسلام کا پینل کوڈ سب سے پہلے لاگو ہو جائے۔ حالانکہ Penal Code تو بہت بعد میں نازل ہوا تھا، پہلے تو احکامات نازل ہوئے، اسلام کو اِسی ترتیب سے لاگو کیا جانا چاہیے۔

نشست نمبر 20

تلاوتِ قرآن......رب تعالیٰ سے ہم کلامی کا ذریعہ

آج 31 مارچ ہے۔ آج کے دن لاہور میں حضرت شاہ حسین رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں میلہ لگایا جاتا ہے۔ شاہ حسین رحمۃ اللہ علیہ شیر شاہ سوری کے دور میں پیدا ہوئے۔ اُن کا زمانہ 1538ء تا 1599ء ہے۔ شیر شاہ سوری کا زمانہ 45-1540 ء تک ہے۔ 1545ء میں اکبرِ اعظم تخت نشین ہوئے۔ یوں شاہ حسین رحمۃ اللہ علیہ نے شیر شاہ سوری اور اکبرِ اعظم دونوں کا زمانہ دیکھا۔

صوفیاءِ کرام میں ایک فرقہ ''ملامتی'' بھی کہلاتا ہے جس سے تعلق رکھنے والے درویش اپنے آپ کو بہت کم تر اور گیا گزرا انسان ظاہر کرتے ہیں اور خود کو ملامت کرنا اُن کا شیوہ ہوتا ہے۔ شاہ حسین رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق اُسی Segment of sufis سے ہے۔

شاہ حسین رحمۃ اللہ علیہ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اُنھوں نے صوفی شاعری میں ''کافی'' کے نام سے ایک نئی جہت متعارف کروائی۔ اس لیے اُنھیں ''کافی کا بانی'' بھی کہا جاتا ہے۔

شاہ حسین رحمۃ اللہ علیہ کے جذب کی کیفیت کا اندازہ اِس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک روز اپنے اُستاد سے تفسیر پڑھتے پڑھتے اچانک قہقہے لگانے لگے اور سب کچھ چھوڑ کر وہاں سے چلے آئے۔ اِس کے بعد اُن پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ سرخ رنگ کا لباس پہنتے اور رقص کیا کرتے۔ یہ کیفیت طویل عرصے تک اُن پر طاری رہی جس کی وجہ سے اُن کا حصولِ علم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ تب اُن کے تفسیر کے اُستاد خود اُن کے پاس آئے اور اُنھیں حصولِ علمِ تفسیر کی طرف راغب کیا۔ یوں شاہ حسین رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار پھر زانوئے تلمذ تہ کیا لیکن اس بار بھی وہی ہوا۔ قرآن پاک کی ایک آیت کا ترجمہ پڑھتے پڑھتے اُن کے قلب کی کیفیت بدل گئی اور وہ یک دم قہقہے لگاتے ہوئے مسجد سے بھاگ گئے۔

حضرت شاہ حسین رحمۃ اللہ علیہ کے والد شیخ محمد عثمان ہندو سے مسلمان ہوئے تھے۔ وہ حصولِ رزق کے لیے کپڑا بُننے کا کام کرتے تھے۔ اسلام قبول کرنے والوں میں سے زیادہ لوگ ہندو ذات پات کی Working class (محنت کش) سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے والد کا تعلق بھی اُسی Working class سے تھا۔ اِس کے اثرات شاہ حسین رحمۃ اللہ علیہ میں بھی تھے جس کی وجہ سے وہ ایک برہمن لڑکے مادھو لعل کے عشق میں مبتلا ہو گئے۔ وہ بچہ بھی اُن کے عشق میں گرفتار ہو گیا حتیٰ کہ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ دونوں ایک ہی نام سے پکارے

جانے لگے" مادھولعل حسین"۔ شالامار میں لگنے والا میلہ بھی مادھولعل حسین کا میلہ کہلاتا ہے۔ شاہ حسین رحمۃ اللہ علیہ کے چیلے مادھولعل کا مزار بھی وہیں پر ہے۔ شاہ حسین رحمۃ اللہ علیہ کو پہلے شاہدرہ میں دفن کیا گیا تھا لیکن اس کے تیرہ چودہ سال بعد انھیں وہاں سے نکال کر موجودہ مقام پر دفن کر دیا گیا۔ اب وہ یہیں آرام فرما ہیں۔

سوال: آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ہم سچی محبت کیسے پیدا کریں؟

جواب: آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے سچی محبت پیدا کرنے کے لیے ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عملی حیاتِ طیبہ کو توجہ اور باریکی سے پڑھیں۔ اس سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے بہت ہی خوب صورت پہلو ہمارے سامنے آنے لگیں گے۔ تب لامحالہ ہمارے دل میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے عقیدت اور محبت پیدا ہوگی۔ اِس کے ساتھ ساتھ ہم کثرت سے درود شریف پڑھیں۔ اِس سے بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے محبت پیدا ہوگی۔

سوال: آپ نے ایک بار بتایا تھا کہ عموماً اہلِ فقر جمعہ اور اتوار کو صبح 9 سے 10 بجے کے درمیان دو نفل پڑھتے ہیں۔ اُن کی فضیلت بیان فرما دیجیے۔

جواب: اتوار کے روز جو دو نفل پڑھے جاتے ہیں اُن میں ہر رکعت میں سورۃ الفاتحۃ کے بعد 70 بار سورۃ الاخلاص پڑھی جاتی ہے جب کہ جمعہ کے روز اُن دو نوافل میں سورۃ الفاتحۃ کے بعد 100 بار سورۃ الاخلاص پڑھی جاتی ہے۔ یہ نماز انسان کو رب تعالیٰ سے قریب لے جاتی ہے۔ میرے خیال میں تو یہی فضیلت سب سے بڑی ہے کہ یہ نماز قربِ الٰہی کا ذریعہ ہے۔

سوال: کیا اپنے مرشد صاحب سے ملاقات کے بعد بھی آپ کو کسی پہنچے ہوئے فقیر کی تلاش رہی؟

جواب: الحمدللہ! میری تلاش تو اُسی روز ختم ہو گئی تھی جب میری ملاقات مرشد صاحب سے ہوئی تھی۔ جب میری ملاقات مرشد صاحب سے ہوئی اُس کے بعد میں کبھی کسی کی تلاش میں نہیں رہا۔ جب میں نے خود کو وہاں Surrender کر دیا تو پھر سوال ہی نہیں تھا کہ کسی اور کی طرف پلٹ کر دیکھوں۔ آج اُس سارے بیتے وقت پر نگاہ دوڑاتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ قبلہ سید یعقوب علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسا مرشد ملنا محال ہے۔ شاید ہی کسی کو ایسا مرشد مل پائے۔ اِس قدر مہربان، دیالو اور Protective مرشد کم از کم میری نظر سے کبھی نہیں گزرے۔ میرے مرشد صاحب نے کبھی اپنی زبان سے یہ نہیں کہا کہ میں تمھارے لیے یہ کرتا ہوں، وہ کرتا ہوں، لیکن اُن کے وصال سے ایک ماہ قبل تین اولیائے کرام یکے بعد دیگرے مجھے ملے اور فرمایا کہ آپ کے مرشد بہت اچھے اور عظیم انسان ہیں۔ اُن کے جانے کا وقت آیا ہے تو سب کچھ آپ کے حوالے کر دیا اور خود خالی ہاتھ جا رہے ہیں۔ ذرا خود سوچیے کہ ایسے مرشد صاحب کے ہوتے ہوئے مجھے کسی اور پہنچے ہوئے فقیر کی تلاش بھلا کیوں کر ہوگی؟

آج میرے مرشد صاحب کے وصال کو 27 برس ہو گئے لیکن اِن 27 سالوں میں مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا کہ وہ چلے گئے ہیں۔ مجھے جب بھی اُن سے Guidance (راہنمائی) درکار ہوتی ہے وہ مجھے خود بخود میسر آ جاتی ہے۔

سوال: منفی طرزِ زندگی کو مثبت میں ڈھالنے کے لیے تلاوتِ قرآن پاک کس طرح مؤثر ثابت ہو سکتی ہے؟

جواب: یاد رکھیے! اگر زمین کا ایک ٹکڑا ہمیں میسر آ جائے اور ہم اُس پر گھر بنانا چاہیں تو گھر آسانی سے کم عرصے میں کم Cost پر بن جائے گا لیکن اگر بنا بنایا گھر لے کر اُسے اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں تو رقم، وقت اور مشقت زیادہ لگتی ہے۔

جب ہم ایک خاص طرزِ زندگی کے عادی ہو جائیں تو اُسے چھوڑنے اور اللہ کی بتائی ہوئی راہ پر چلنے کے لیے بھی زیادہ محنت، وقت اور اخلاص درکار ہوتا ہے کیونکہ پرانی زندگی اور طرزِ حیات ہمیں اپنی طرف کھینچتا رہتا ہے۔

آپ ترتیب سے قرآن پاک کی بار بار تلاوت کیجیے۔ اِس کے بعد آپ کو کسی پہنچے ہوئے فقیر یا بزرگ کی ضرورت نہیں۔ بدقسمتی سے ہم قرآن پاک کو چھوڑ کر اوراد و وظائف، ریاضتوں اور چلّوں کے پیچھے لگ گئے۔ ہمیں یہ یاد نہیں رہتا کہ اِن سب کا Source قرآن پاک ہے۔ اِس لیے اگر ہم قرآن پاک کی باقاعدگی سے تلاوت کرتے رہیں بھلے ترجمہ نہ پڑھیں تو بھی اِس کے اثرات ہماری Body language، ہمارے چہرے، ہمارے رویوں اور ہماری عادات سے ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

ایک ہی سورہ بار بار پڑھنے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ ہم قرآن پاک سورۃ الفاتحۃ سے الناس تک ترتیب سے پڑھیں۔ قرآن پاک مکمل ہونے کے بعد دُعا کریں "یا اللہ! میں نے تیرا یہ کلام تلاوت کیا، تو اِس کا ثواب بطور ہدیہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں پیش کر دے۔" اِس کے بعد ہم دوبارہ قرآن پاک کی سورۃ الفاتحۃ سے تلاوت شروع کر دیں۔

ہم اکثر یہ غلطی کرتے ہیں کہ کسی بھی چیز کا ثواب پہنچانے کے لیے کہتے ہیں کہ "یا اللہ! تو اِس کا ثواب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رُوح کو بخش دے۔" یہ درست طریقہ نہیں کیونکہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رُوح مبارکہ کو کوئی بھی ثواب صرف بطور "تحفہ و نذرانہ" ہی پیش کر سکتے ہیں۔

قرآن پاک کے بہت سے معجزات میں سے ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ اِس کی تلاوت کے اثرات ہماری ذات، Body language، چہرے، رویوں اور عادات پر مرتب ہوتے ہیں۔ تلاوت قرآن پاک رب تعالیٰ تک پہنچنے کا Shortcut ہے۔ اُس وقت بہت دُکھ ہوتا ہے جب کسی سے کہا جاتا ہے "بھائی! آپ قرآن پاک پڑھ کر دُعا کیا کریں، اللہ تعالیٰ آپ کی مدد کرے گا اور انشاءاللہ آپ کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔" لیکن جواب آتا ہے "جناب! وہ تو ٹھیک ہے لیکن آپ یہ بتا دیں کہ تسبیح کون سی کیا کریں؟" تب وہ لطیفہ یاد آتا ہے کہ ایک صاحب ملتزم پہ کھڑے پاکستان میں اپنے دوست کو فون کر رہے تھے "یار طبیعت خراب ہے۔ ذرا داتا صاحب جا کر دُعا تو کر دو کہ طبیعت ٹھیک ہو جائے۔" ملتزم پکڑے ہوئے یہ کہنا کہ داتا صاحب جا کر دُعا کر دو ایسا ہی ہے کہ قرآن پاک آپ کے پاس ہے اور آپ وظیفہ کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

بھائی! آپ کسی پہنچے ہوئے فقیر یا پیر کی تلاش میں مت جائیے۔ قرآن پاک سب سے بڑا اور پہنچا ہوا پیر

ہے۔ یہ آپ کو سیدھی راہ پر لے جائے گا، رب تعالیٰ سے ملا دے گا۔ قرآن پاک کی تلاوت کرتے رہیے۔ رب تعالیٰ اپنے کلام کے صدقے آپ کے مسائل بھی حل کر دے گا۔ آپ پر اپنی رحمتیں بھی نازل کر دے گا۔ آپ کی Face، Body language آداب اور عادات سب اِس بات کا منہ بولتا ثبوت بن جائیں گے کہ قرآن پاک کی تلاوت نے آپ پر اپنے اثرات ڈالنا شروع کر دیے ہیں۔

سوال: کیا ترجمہ کے بغیر قرآن پاک کی تلاوت کرنے سے بھی ہدایت مل سکتی ہے؟

جواب: ہم سب جانتے ہیں کہ تلاوتِ قرآن پاک سے تمثیلاً مراد رب تعالیٰ سے ہم کلام ہونا ہے اور قرآن پاک کتابِ ہدایت ہے۔ لیکن اگر ہم قرآن پاک پڑھیں گے ہی نہیں تو پھر ہدایت کیسے ملے گی؟

جب ہم تلاوت کرتے ہیں تو رب تعالیٰ ہماری طرف متوجہ ہوتا ہے اور جب وہ ہماری طرف متوجہ ہوتا ہے تو ہم پر اپنی رحمتیں نازل فرماتا ہے۔

قرآن پاک کے بہت سے معجزات میں سے ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ اگر کوئی عجمی بھی قرآن پاک بار بار بغیر ترجمہ کے بھی پڑھتا رہے تو اُس کے معنی خود بخود اُس کی سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔ اگر قرآن پاک کی تلاوت کے ساتھ ساتھ ترجمہ بھی پڑھا جائے تو تلاوت میں تسلسل نہیں رہتا۔ اِس کا حل یہ ہے کہ ہم ایک بار قرآن پاک کی تلاوت کر لیں اور پھر جتنی سورتوں کی تلاوت کی اُن کی دوبارہ تلاوت کرتے جائیں اور ساتھ ساتھ ترجمہ پڑھتے جائیں۔

رب سے ہم کلام ہونے کی Feelings اُس وقت پیدا ہوتی ہیں جب ہم تسلسل سے تلاوت کر رہے ہوتے ہیں۔ تب دورانِ تلاوت انسان کلامِ الٰہی کے سحر میں ڈوبتا چلا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے مجھے ہی ایسا محسوس ہوتا ہو لیکن میرا تجربہ یہی ہے کہ جب میں روانی و تسلسل کے ساتھ قرآن پاک پڑھتا ہوں تو اُس وقت مجھ پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے وہ رُک رُک کر تلاوت کرنے سے طاری نہیں ہوتی۔ روانی و تسلسل سے تلاوت کرتے ہوئے وجد طاری ہونے لگتا ہے جو ترجمہ ساتھ پڑھتے ہوئے طاری نہیں ہوتا۔ اِس لیے میرا مشورہ یہی ہے کہ پہلے تلاوت، پھر تلاوت و ترجمہ اور اس کے بعد حاشیے میں دی گئی تفصیل پڑھ لیجیے۔ اس طرح دونوں مقاصد حاصل ہو جائیں گے۔ ترجمے سے قرآن پاک سمجھ آ جائے گا اور ہدایت مل جائے گی جب کہ روانی و تسلسل سے تلاوت قرآن پاک کرنے سے خود پر طاری ہونے والے وجد کا تجربہ بھی ہو جائے گا۔

سوال: وجد سے کیا مراد ہے؟

جواب: وجد اُس کیفیت کا نام ہے جب انسان رب تعالیٰ کے حضور تنہا ہو جاتا ہے۔ اُس کا رابطہ اردگرد کی دُنیا سے کٹ جاتا ہے اور وہ ذہنی طور پر کلیۃً رب تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ ایسے میں نشے کی سی جو کیفیت طاری ہوتی ہے اُسے "وجد" کہا جاتا ہے۔

سوال: مجھے قرآن پاک پڑھنے میں اُتنا سرور حاصل نہیں ہوتا جتنا سننے میں۔

جواب: آپ قرآن پاک ضرور سنیے لیکن قرآن پاک پڑھنا زیادہ افضل ہے۔ کوشش کیجیے کہ قرآن پاک دن

میں کم از کم تین بار پڑھ لیا کریں۔ فجر، عصر اور عشاء کی نماز کے بعد کثرت سے قرآن پاک پڑھنے سے اُس کے معانی سمجھ آنے لگتے ہیں اور اللہ کی بے تحاشا رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔ عصر کی نماز کے بعد قرآن پاک پڑھنے کے بے پناہ فضائل ہیں۔ اللہ کی خاص رحمتیں انسان پر نازل ہوتی ہیں۔ قرآن پاک سننے کا سرور حاصل کرنے کے لیے یہ کر لیں کہ ڈرائیونگ کے وقت سی ڈی پلیئر آن کر لیا کریں۔ لیکن یہ احتیاط کر لیں کہ جب آپ قرآن پاک سن رہے ہوں تو کسی اور کام میں مشغول مت ہوں۔ نہ کسی سے گفتگو کریں نہ ٹی وی دیکھیں بلکہ خاموشی سے تلاوت کلام پاک سنیں تاکہ اُس کی بھرپور برکات حاصل ہو سکیں کیونکہ خاموشی اور توجہ سے قرآن پاک سننے والوں پر اللہ تعالیٰ رحم فرماتا ہے۔

سوال: کیا وجہ ہے کہ کوشش اور عبادت کے باوجود ہماری زندگی تبدیل نہیں ہوتی؟

جواب: کوششیں کبھی رائگاں نہیں جاتیں۔ اللہ تعالیٰ کبھی کسی کی کوشش اپنے ذمہ نہیں رکھتا۔ اُس کا انعام، صلہ اور اجر اللہ تعالیٰ لازمی عطا فرماتا ہے لیکن جب ہم عبادت میں غرض لے آتے ہیں خواہ وہ ثواب ہی کی غرض کیوں نہ ہو تو اُس کے اثرات ویسے نہیں ملتے جیسے ملنے چاہییں۔ اس کے برعکس جب انسان اپنے رب کو بے غرض ہو کر پکارتا ہے، اُسے لائقِ عبادت سمجھ کر اُس کی پرستش کرتا ہے تو پھر ایسی عبادت کے بے پناہ انعامات حاصل ہوتے ہیں حتیٰ کہ Towards life ہمارے رویے تک تبدیل ہو جاتے ہیں۔

بدونِ عشقِ الٰہی مشاہدۂ حق ممکن نیست

جناب قبلہ بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ چار طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔

1۔ جن کا ظاہر بڑا اُجلا اور باطن بڑا خستہ ہوتا ہے۔

2۔ جن کا ظاہر بڑا خستہ لیکن باطن بڑا اُجلا ہوتا ہے۔

3۔ جن کا ظاہر بھی خستہ اور باطن بھی خستہ ہوتا ہے۔

4۔ جن کا ظاہر بھی اُجلا اور باطن بھی اُجلا ہوتا ہے۔

جن لوگوں کا ظاہر خستہ اور باطن اُجلا ہوتا ہے وہ مجذوبین ہیں، صاحبانِ جنون و عشق ہیں۔ اُن کی رب تعالیٰ سے محبت اُس مقام کو پہنچی ہوتی ہے کہ جہاں اُنھیں رب تعالیٰ کی تجلیات کے مشاہدے ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ اُنھیں اتنا ہوش ہی نہیں رہتا کہ وہ اپنے ظاہر پر توجہ دے سکیں۔ اپنے ظاہر پر توجہ نہ دینے کے نتیجے میں اُن کا ظاہر خستہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

وہ لوگ جن کے ظاہر اُجلے لیکن باطن خستہ ہیں (اللہ تعالیٰ ہم سب کو اِس حال سے معاف رکھے) اُن کی عبادات میں بھی ریاکاری ہے۔ اُن کا ظاہر بھی دکھاوا ہے، جنونِ عشق بھی دکھاوا ہے۔ رب تعالیٰ ایسے لوگوں کی عبادات اُن کے منہ پر دے مارتا ہے۔ بقول بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ جن کا ظاہر بھی خستہ اور باطن بھی خستہ ہے یہ عام دُنیادار لوگ ہیں جب کہ وہ جن کے ظاہر و باطن دونوں اُجلے ہیں یہ اصل میں مشائخ ہیں۔ رب تعالیٰ کی اُن پر اتنی رحمت ہے کہ یہ صبح سے شام تک اسرارِ الٰہی کو انجوائے کرتے رہتے ہیں، اُن کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ اسرارِ الٰہی کے پیالے بھر بھر کر پیتے ہیں لیکن ایسی خوب صورتی سے کہ کبھی چھلکتے نہیں۔ انھی لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب اُنھیں تجلیات اور اسرارِ الٰہی کا مشاہدہ ہوتا ہے تو یہ بڑی خوب صورتی سے اُسے Absorb کر جاتے ہیں اور ظاہر نہیں ہونے دیتے، اُس کا بھید نہیں کھولتے۔ ہاں البتہ جب یہ ایک ایسے مقام پر پہنچتے ہیں جہاں اِن کا دل اور باطن اسرارِ الٰہی سے یوں لبریز ہو جاتا ہے کہ مزید اسرارِ الٰہی جذب کرنا ممکن نہیں رہتا تو پھر یہ اس کا اظہار شروع کر دیتے ہیں۔

ابتدا میں جب اسرارِ الٰہی کا مشاہدہ ہو اور انسان اس بھید کو ظاہر کر دے تو اس کی سزا بہت کڑی ہے۔

مشاہدے کا وہ سلسلہ وہیں رک جائے گا لیکن اگر ایک خاص مقام پر پہنچنے کے بعد (جہاں دل اسرارِ الٰہی اور تجلیات سے پوری طرح لبریز ہو جاتا ہے) اگر اُسے ظاہر کر دے تو اِس میں کوئی حرج نہیں بلکہ یہ مباح ہے کیونکہ اس سے لوگ Inspire بھی ہوں گے اور Aspire (آرزو یا تمنا) بھی کریں گے۔

منصور حلاج کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ اُن کی ہمشیرہ مشائخ میں سے ہیں۔ وہ روزانہ رات کو جنگل میں جا کر تنہائی میں عبادت کیا کرتیں۔ صبح جب واپس گھر آنے لگتیں تو رب کا ایک فرشتہ اُنھیں اسرارِ الٰہی کا مشاہدہ کراتا۔ یہ اسرارِ الٰہی مشروب کے ایک پیالے کی صورت ہوتا۔ منصور حلاج متجسس تھے کہ میری ہمشیرہ روزانہ رات کو کہاں جاتی ہیں۔ ایک رات وہ اُن کا پیچھا کرتے کرتے جنگل میں جا پہنچے اور رات بھر اُنھیں رب کی عبادت کرتے دیکھتے رہے۔ صبح جب اُن کی خدمت میں پیالہ پیش کیا گیا اور وہ مشروب پینے لگیں تو منصور حلاج بھاگ کر اُن کے پاس گئے اور درخواست کی "بہن! میرے لیے بھی کچھ حصہ چھوڑ دینا۔" پھر اُنھوں نے پیالہ پکڑا اور مشروب پی لیا۔ مشروب پیتے ہی اُن پر ایک عجیب جذب کی کیفیت طاری ہو گئی اور اُنھوں نے نعرہ لگایا "انا الحق۔" اس کے بعد اُن کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ آپ کے سامنے ہے۔ جب بادشاہِ وقت کے حکم پر اُنھیں قتل کیا گیا تو ہمشیرہ نے کہا "افسوس! منصور حلاج نے اسرارِ الٰہی کو پی تو لیا لیکن اُسے برداشت نہ کر سکے۔ مجھے بھی رُسوا کیا اور خود بھی رُسوا ہوئے۔"

Early stage پر اسرارِ الٰہی کو افشا کرنے کی سزا بہت سے اولیا نے موت کی صورت جھیلی ہے۔ ابتدا میں تجلیات اور اسرار کو اپنے اندر Absorb کر لینا چاہیے۔ بیان نہیں کرنا چاہیے کہ میں نے کیا دیکھا؟ کیا پیش آیا؟ میرے دل کی کیفیات کیا ہیں؟

اسرارِ الٰہی کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی عرض کر دوں کہ جس طرح 70 ہزار جہان ہیں اُسی طرح اسرارِ الٰہی کی تعداد بھی 70 ہزار ہے۔ مردانِ حق اسرارِ الٰہی اور تجلیات کا مشاہدہ کرتے ہیں مگر اُن کی حالت میں سوئی برابر فرق نہیں آتا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ مردانِ حق / صاحبانِ علم / صاحبانِ باطن کے سفر کی ابتدا بہت سخت محنت، مشقت اور ریاضت سے ہوتی ہے۔ یہ بہت کڑے مجاہدے کرتے ہیں۔ اتنے سخت مجاہدے کرنے کے بعد یہ مجاہدے سے مشاہدے تک کا سفر طے کرتے ہیں لیکن مجاہدے سے مشاہدے تک کا یہ سفر عشقِ الٰہی کے زور پر طے ہوتا ہے۔ اِس سفر میں Carrier عشقِ الٰہی اور رب تعالیٰ سے محبت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مردانِ حق اور مردانِ علم و عقل اِبتدا ہی سے اسرار و تجلیات کی اِبتدائی شکل کو رفتہ رفتہ Absorb کرتے کرتے اس کے Higher level تک سفر کرتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر سانپ کے کاٹے کا جو تریاق بنایا جاتا ہے اس کے لیے گھوڑے کا خون استعمال ہوتا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ جس گھوڑے کے خون سے تریاق بنایا جاتا ہے اُس گھوڑے کو اُس کی پیدائش کے فوراً بعد سے زہر کی معمولی مقدار Regular intervals کے بعد Inject کی جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ زہر کی یہ مقدار بڑھاتے چلے جاتے ہیں حتیٰ کہ وہ گھوڑا زہر کی بڑی مقدار کو بہت Comfortably برداشت کرنے لگتا ہے اور اُس کے لیے یہ روٹین کا معاملہ بن جاتا ہے۔ تب اُس

کے خون سے تریاق بنایا جاتا ہے اور جس کو سانپ کاٹ لے اُسے اُس تریاق کا انجکشن دے کر بچا لیا جاتا ہے۔

اسی طرح جو فقیر اور درویش اللہ کی راہ پر چلتے ہیں اُن کے سفر کی ابتدا فرائض کی ادائیگی سے ہوتی ہے اور وہ نیکی کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ جس طرح ہائیڈروجن کے دو حصے اور آکسیجن کے ایک حصہ کو Controlled environment میں Blend کریں تو وہ Blend، H_2O یعنی پانی بن جاتا ہے۔ اسی طرح فقر میں انسان ایک Blend تیار کرتا ہے۔ وہ Blend ہے عبادات، ذکرِ الٰہی اور نیکی کا۔

ہم غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ عبادت گزار لوگوں کو نیک اور نیکوکاروں کو بھلا آدمی کہتے ہیں۔ عبادت اور نیکی میں فرق ہے۔ عبادت سے انسان کو صرف پارسائی ملتی ہے لیکن جب انسان نیکی اور پارسائی کا Blend تیار کر لیتا ہے تو پھر اُس کے نتیجے میں انسان کو رب ملتا ہے۔

یہ جو آج کے دور میں فیشن چل نکلا ہے کہ کوئی مردِ مومن مجھ پر نگاہ ڈال دے اور میں نیک ہو جاؤں، مجھے رب مل جائے...... اور مجھے یہ بھی پختہ یقین ہے کہ صرف تسبیح پھیرنے سے ہی مجھے رب ملے گا۔ رب تسبیح کے دانے پھیرنے سے نہیں ملتا۔ رب کو پانے کا آسان نسخہ یہی ہے کہ انسان اپنے اندر پارسائی اور نیکی کو یک جا کر لے۔ پھر رب اُس کا ہے۔

سوال: کیا فرض عبادات اور بنیادی عقائد کی اِصلاح کے بغیر محض نیکی سے رب کو پایا جا سکتا ہے؟

جواب: عبادت پہلے اور نیکی بعد میں ہے۔ ہم مسلمان ہو ہی نہیں سکتے جب تک ہم توحید پر ایمان نہ لائیں اور پھر آپ ﷺ کو سچا رسول اور نبی آخر الزماں نہ مانیں، قرآن پاک کو آخری اِلہامی کتاب نہ مانیں۔ آپ ﷺ سے پہلے آنے والے تمام انبیا اور رسولوں پر ایمان نہ لائیں اور قرآن پاک سے پہلے نازل شدہ تمام اِلہامی کتب پر ایمان نہ لائیں۔

مسلمان ہونے کی ابتدا ہوتی ہے رب کی اِطاعت سے۔ اور یہ اِطاعت ہمیں بندگی کی طرف لے جائے گی۔ بندگی اِطاعت کی اگلی منزل اور Superior form ہے۔ جہاں انسان بندگی کے مقام پر آئے گا اُس میں پارسائی پیدا ہو جائے گی۔ اُس پارسائی کو جب ہم نیکی کے ساتھ ملا لیں گے تو ہمیں رب مل جائے گا۔

نیکی کیا ہے؟ زندگی گزارنے کا وہ ڈھنگ جو آپ ﷺ نے اپنی عملی زندگی کی صورت بطور نمونہ ہمارے لیے چھوڑا۔

جب ہماری زندگی آپ ﷺ کی اِتباع میں گزرنے لگے، ہمارے رویے سنت کے مطابق ہو جائیں، جب ہم قانون کی پیروی آپ ﷺ کی سنت کے مطابق کرنے لگیں، جب ہمارے دل سے دُنیا کی محبت نکل جائے اور ہمارے اندر قناعت اور توکل پیدا ہو جائے تو وہ نیکی کی راہ ہے۔ پہلے ہم اللہ کی بندگی کر لیں اور پھر اپنی زندگی آپ ﷺ کی سنت کے مطابق گزار لیں۔ اِس بندگی اور اِتباع کے بعد ہمیں رب کا قرب اور دوستی عطا ہو جائے گی۔

اگر رب کی عبادت، ذکر اذکار اور وظائف اِس لالچ سے کریں کہ ہمارا فلاں کام ہو جائے گا تو رب اِس کا

بھی ثواب عطا فرما دیتا ہے کیونکہ وہ انتہائی رحیم و کریم ہے لیکن یہ عبادت کم تر درجے کی ہے۔ اگر ہم یہ سوچ کر عبادت کریں کہ ہمیں جہنم سے نجات مل جائے گی اور رب تعالیٰ ہمیں جنت میں داخل کر دے گا تو رب اُس عبادت کو بھی قبول کر لیتا ہے کیونکہ وہ انتہائی مہربان ہے لیکن یہ عبادت بھی کم تر درجے کی ہے۔ اگرچہ پہلی قسم کی عبادت سے بہتر ہے۔ اگر ہم رب تعالیٰ کی عبادت اِس نیت سے کریں کہ یہ رب تعالیٰ کا حکم ہے تو یہ عبادت قبول ہو جائے گی اور اس کا اجر و ثواب بھی مل جائے گا۔ یہ عبادت اگرچہ پہلی دونوں قسم کی عبادات سے بہتر ہے لیکن پھر بھی کم تر درجے کی ہے۔ اگر ہم نے رب تعالیٰ کی عبادت صرف اور صرف یہ سوچ کر کی کہ رب اتنا عظیم اور ہمارا اِتنا بڑا محسن ہے کہ وہ لائق عبادت ہے۔ جب انسان رب تعالیٰ کو لائق عبادت سمجھ کر اُس کی پرستش کرتا ہے تو پھر وہ یہ نہیں سوچتا کہ اِس عبادت، اِطاعت اور بندگی کے نتیجے میں وہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ یہ اُس کی اپنی صوابدید ہے کیونکہ وہ آقا و مالک ہے اور آقا و مالک کے کسی کام پر بھی اُنگلی نہیں اٹھائی جا سکتی۔ یہ اعلیٰ ترین درجے کی عبادت ہے جس کے نتیجے میں انسان کو پارسائی ملتی ہے۔ ان بنیادی مقامات سے گزرے بغیر انسان اُس مقام پر آ ہی نہیں سکتا جہاں اُسے رب مل جائے۔

میری زندگی کی پہلی جاب 22 سال کی عمر میں محکمہ سوئی گیس میں ہوئی۔ تب یہ برٹش کمپنی تھی۔ کچھ عرصہ بعد جب اُس معاہدے کی مدت پوری ہو گئی جو حکومتِ پاکستان نے برٹش کمپنی کے ساتھ کیا تھا کہ آپ پائپ لائن بچھا دیں اِس کے صلے میں آپ دس سال تک Free of cost گیس حاصل کر سکتے ہیں اور اُسے بیچ سکتے ہیں۔ Agreement period پورا ہونے کے بعد اِسے گورنمنٹ آف پاکستان نے Take over کر لیا اور اِس کے ساتھ ہی اِس پر گورنمنٹ سروس رولز Applicable ہو گئے جن کے تحت 52 سال سے زائد عمر کے تمام افراد کو ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔ تب میرے ایک سینئر Colleague نے کہا کہ میری ریٹائرمنٹ کا وقت آ گیا ہے۔ میرے ایک بیٹے نے انگریزی میں ماسٹرز کیا ہوا ہے۔ CSS کا تحریری امتحان بھی Clear کیا لیکن Viva پاس نہ کر سکا۔ اگر آپ اُسے بطور Trainee لے لیں تو میری ریٹائرمنٹ سے پیدا ہونے والے گھریلو مسائل حل ہو جائیں گے۔" میں نے کہا" آپ اُسے لے آئیے۔" اگلے روز جب وہ اپنے بیٹے کو ہمراہ لائے اور تعارف کرایا کہ یہ صفدر محمود انصاری ہے تو بے اختیار میرے منہ سے نکلا" او تایا ابا۔" کیونکہ وہ صاحب شکل سے اپنے باپ سے بھی بڑے دکھائی دے رہے تھے۔ میری زبان سے نکلا" تایا ابا" کا یہ ٹائٹل اِتنا مشہور ہوا کہ بعد ازاں پورے آفس میں صفدر محمود انصاری کو اُن کی ریٹائرمنٹ تک اِسی نام سے پکارا جاتا رہا۔ اُن کے چہرے پر عجیب سا تاثر تھا جس کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ اُن کا چہرہ Deform لگتا تھا۔ جن جلد بھی عجیب و غریب تھی اُس پر یوں Flakes (دھبے) دکھائی دیتے جیسے مچھلی کے جسم پر نظر آتے ہیں۔ جن دنوں میں اُن کی ٹریننگ کر رہا تھا تو وہ سارا دن خاموش بیٹھے رہتے۔ صبح جب وہ آتے تو اُن کے ہلتے ہونٹوں سے اندازہ ہوتا کہ اُنھوں نے سلام کیا ہے کیونکہ اُن کی آواز نہیں نکلتی تھی۔ سارا دن وہ میرا دیا گیا ہیپر ورک کرتے رہتے یا کچھ لکھتے رہتے۔ ایک روز انھیں پیپر پر Figure work کرتے دیکھ کر میں نے پوچھا" تایا

ابا! کیا کر رہے ہیں؟'' میں اُس وقت 22 سال کا تھا اور دفتر میں اُلٹی سیدھی حرکتیں کرتا رہتا تھا اِس لیے کسی کو اندازہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ میں رب کے نام سے بھی واقف ہوں یا اللہ کا ذکر بھی کرتا ہوں۔ یہ وہی زمانہ تھا جب میں چھپ کر صبح شام 40,42 وظائف کیا کرتا تھا۔ میرے اِس سوال پر کہ تایا ابا کیا کر رہے ہیں؟ اُنھوں نے جھٹ سے جواب دیا ''سر! آپ بھی بہت عبادت کرتے ہیں۔ اللہ کو پکارتے ہیں۔ کبھی میں بھی اللہ کو ایسے ہی پکارا کرتا تھا۔ مجھے ولی اللہ بننے کا بہت شوق تھا اور میں کافی حد تک آگے چلا گیا تھا۔ فقر اور ولایت کے ابتدائی مرحلے میں انسان کو جنات دکھائی دینے لگتے ہیں۔ وہ اُن سے گفتگو بھی کرنے لگتا ہے۔ بہت سے لوگ اس ابتدائی مرحلے کو منزل سمجھ کر یہیں رُک جاتے ہیں۔ میں بھی اِس مرحلے تک آن پہنچا تھا۔ تب مجھے لگتا تھا کہ میں جلد صاحب کشف ہو جاؤں گا لیکن بدقسمتی سے ایک روز یہ شیطانی خیال آ گیا کہ جب مجھے کشف حاصل ہو جائے گا تو میں زمین میں چھپے خزانے دیکھ لوں گا اور اُنھیں نکال لیا کروں گا۔ ریس میں جیتنے والے گھوڑوں کے نمبر کشف میں دیکھ کر اُن پر شرط لگا کر امیر ہو جاؤں گا۔ یہ خیال آیا تو اُس کے ایک ہی ہفتے کے اندر میری شکل بدل گئی۔ سب کچھ چھن گیا اور سزا کے طور پر میری شکل اِتنی Deform ہو گئی کہ پہلی نظر مجھ پر پڑنے کے بعد آپ بھی بے اختیار کہہ اُٹھے ''تایا ابا''۔

یہ سارا قصہ سنانے کا مقصد یہی تھا کہ اگر خدانخواستہ عبادات، تسبیحات اور ذکر اذکار کا مطمح نظر کسی دُنیاوی مقصد کا حصول یا دُنیاوی لالچ ہو تو پھر تایا ابا جیسا انجام ہوتا ہے۔ بہت مار پڑتی ہے۔ انسان اِس راہِ فقر پر صرف اُسی صورت چل سکتا ہے اگر اخلاص اور لگن قائم رہے۔ مجاہدے سے مشاہدے تک کا سفر صرف اُسی صورت میں طے ہو سکتا ہے جب دل میں عشقِ الٰہی بسا ہو ورنہ انسان ریاضت میں ہی کھویا رہتا ہے۔ آگے کا سفر طے ہی نہیں ہوتا اور انسان مشاہدہ تک پہنچ ہی نہیں پاتا۔

سوال: کیا یہ بہتر نہیں کہ نیکی اور عبادت کا Blend معلوم کیے بغیر ہی ہم نیکی کی راہ پر چل پڑیں؟

جواب: جب سے انسان کی تخلیق ہوئی ہے اِس کی Basic requirements کبھی تبدیل نہیں ہوئیں۔ صرف انسان کی جب سوچ بدلتی ہے تو اُس کی خواہشات بدل جاتی ہیں۔ Requirements وہی رہتی ہیں۔ جب ہم اپنی ضروریات Barest minimum پر رکھتے اور خواہشات کو قابو میں کر لیتے ہیں تو پھر ہماری ضروریات بھی کم ہو جاتی ہیں اور ہم تھوڑے میں بھی مطمئن ہو جاتے ہیں...... جیسے سخی کی تعریف یہ ہے کہ جب وہ کسی کو کچھ دے تو بہت بھی تھوڑا لگے اور جب کسی سے کچھ لے تو تھوڑا بھی بہت لگے۔

جب انسان کے دل میں غنا پیدا ہو جاتا ہے تو وہ تھوڑے میں راضی ہو جاتا ہے کیونکہ اُس کی خواہشات ختم ہو جاتی ہیں۔ آج سے آٹھ سو سال پہلے بھی انسان کی ضروریات یہی تھیں اور خواہشات اِسی طرح بڑھ رہی تھیں۔

جب تک ہم ذہنی طور پر Convince نہیں ہوتے کہ نیکی کیا ہے اور یہ ہمیں کس طرف لے جائے گی، اس کا حاصل کیا ہو گا، تب تک ہم نیکی اختیار نہیں کر سکتے۔ جب تک ہمیں معلوم نہ ہو کہ عبادت کیا ہے اور اُسے

کرنے سے ہمیں کیا حاصل ہو گا تب تک ہم عبادت کی راہ پر چل ہی نہیں سکیں گے۔

آپ نے بالکل بجا فرمایا کہ محض یہ جاننے کے بجائے کہ نیکی کیا ہے، نیکی کی راہ پر عمل کیوں نہ کر لیا جائے۔

یہ حقیقت ہے کہ نتائج تھیوری جاننے سے نہیں عمل سے حاصل ہوتے ہیں لیکن نتائج تک پہنچنے کے لیے Inspiration ضروری ہے۔ جب تک بندہ Inspire نہیں ہوتا وہ Aspire نہیں کر سکتا۔ اور Inspiration اُسی وقت آئے گی جب ہمیں یہ پتا چلے گا کہ عبادت یا نیکی کیا ہوتی ہے اور عبادت یا نیکی کی راہ پر چلنے سے حاصل کیا ہو گا۔ نیکی یا عبادت کیا ہوتی ہے؟ یہ جاننا ہمیں عمل کے لیے Inspire کرے گا اور یہ جاننا کہ عبادت یا نیکی کے نتیجے میں ہمیں حاصل کیا ہو گا، ہمارے اندر Aspiration پیدا کرے گا۔

عبادت اور نیکی دونوں کے حاصل وصول کا Blend کیا ہو گا اور اس Blend کا حاصل وصول کیا ہو گا؟ یہ جاننا اِس لیے ضروری ہے کہ شاید اِس طرح اللہ میرے دل میں یہ شوق پیدا کر دے کہ میں رب تعالیٰ سے دوستی کر لوں۔

بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ یا کسی بھی ولی اللہ کی Quotation دینے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ہم اُن کی تعلیمات اور اُن واقعات سے Inspire ہو کر اُن کی راہ پر چل پڑیں کیونکہ وہ نیکی کی راہ تھی۔

سوال: آج کل ٹی شرٹس پر جان داروں کی تصویریں یا پولو کا Logo کندہ (Emboss) ہوتا ہے۔ کیا ایسی قمیص پہن کر نماز ہو جاتی ہے؟

جواب: حدیث مبارکہ کا مفہوم ہے کہ ہر وہ معاملہ یا چیز جس کے بارے میں دل میں شک آ جائے، اُسے ترک کر دیجیے۔ اگر ہمارے دل میں شک آتا ہے کہ ایسی ٹی شرٹ جس پر Polo کا Insignia (نشان) Emboss ہوا ہو پہن کر نماز نہیں ہو گی تو ایسی شرٹ پہن کر نماز ادا نہ کی جائے۔

ویسے بھی نماز کے آداب کا تقاضا ہے کہ ہم پولو ٹی شرٹ کے بجائے پوری آستین کی شرٹ پہنیں تاکہ کہنیاں ڈھک جائیں یا ایسی چادر لپیٹ کر نماز ادا کر لیں جس سے کہنیاں بھی ڈھک جائیں اور پولو شرٹ پر Embossed logo بھی چھپ جائے یوں دل کا وہم اور شک بھی نکل جائے گا۔

سوال: کچھ گھروں میں بزرگوں کی تصاویر لگی ہوتی ہیں۔ کیا ایسے کمروں میں نماز پڑھی جا سکتی ہے؟

جواب: کمرے میں تصویر لگی ہو تو اُسے وہاں سے ہٹا دیں یا اُلٹ دیں پھر نماز ادا کریں۔ تصویر کے سامنے نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔

سوال: کیا Aspiration سے پہلے Inspiration level کو Sustain کرنے کا کوئی طریقہ ہے؟

جواب: آپ نوجوان ہیں، اِسی دُنیا میں رہتے ہیں، کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی رنگ میں عشقِ مجازی میں مبتلا ہوئے ہوں گے۔ اِس کیفیت میں آپ نے دیکھا ہو گا کہ اُس شخص کا خیال آپ کے ذہن سے نہیں نکلتا جس سے آپ کی ذہنی اور قلبی قربت ہو۔

Inspiration کو Sustain کرنے کا بڑا آسان نسخہ ہے۔ وہ چیزیں جو ہمیں Inspire کر رہی ہیں ہم فرصت کے لمحات میں روز انھیں دل میں دہرائیں تو وہ Inspiration دل میں گھر بنا لیتی ہے۔ لیکن اگر وقتی طور پر ہم کسی چیز سے متاثر یا Inspire ہو جائیں اور پھر رفتہ رفتہ وہ باتیں ذہن سے محو ہونے لگیں تو Inspiration ختم ہو جاتی ہے۔ اگر ہم اخلاص سے اللہ کی راہ پر چلنے کے متمنی ہیں تو جیسے ہی محسوس کریں کہ Detrack ہونے لگے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف مائل کرنے والی باتوں کو دہرانا شروع کر دیں۔ اس سے انسپائریشن Sustain رہے گی۔

سوال: راہِ سلوک میں سالک کو بہت سے مشاہدات حاصل ہوتے ہیں لیکن ماہرین نفسیات مشاہدہ اور اسرار تجلیات کو ذہنی بیماری قرار دیتے ہیں۔ مشاہدات اور اسرار و تجلیات کی حقیقت کیا ہے؟

جواب: سائنس کے مطابق سب کھیل ہمارے دماغ کا ہے۔ سائنسی توجیہہ کے مطابق ہمارے دماغ کے بہت سے Cells عام طور پر Activate نہیں ہوتے۔ Genius لوگ بھی اپنے دماغ کا محض 30 سے 40 فی صد حصہ استعمال کرتے ہیں۔ ساٹھ سے 70 فی صد Idle (بے کار) پڑا رہتا ہے۔ اِس میں کیا کیا اسرار چھپے ہیں ابھی سائنس Gradually (بتدریج) انھیں Discover (دریافت) کر رہی ہے۔ مثال کے طور پر HRM کے ماہرین کی تحقیق کے مطابق سخت حالات کار میں کام کرنے والے افراد اپنے اُوپر ہائی ڈگری Fever طاری کر لیتے ہیں تا کہ انھیں چھٹی مل سکے۔ تحقیق سے یہ بھی پتا چلا کہ جب انسان مسلسل ہائی ڈگری Fever کے بارے میں سوچتا رہتا ہے تو دماغ میں موجود کچھ خاص Cells (خلیات) Activate (متحرک) ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح آپ نے یہ تحقیق بھی پڑھی ہوگی کہ مختلف افراد مختلف Objects جیسے میز، کرسی وغیرہ پر یوں نظر جما لیتے ہیں کہ وہ چیز خود بخود فضا میں Lift کر جاتی ہے۔ یہ دراصل Concentration of mind سے ہوتا ہے۔ اسے سائنسی زبان میں Brain power کہتے ہیں۔ جب کہ رُوحانیت کہتی ہے کہ یہ ہے تو Brain power ہی لیکن اس پاور کو Develop کرنے کے لیے Positive thinking (مثبت سوچ) چاہیے جو ذہنی یک سوئی کی بنیاد ہے۔ Concentration span (یک سوئی کا دورانیہ) اُتنا ہی Broad ہوگا جتنی آپ کی سوچ مثبت ہوگی۔ منفی سوچ کے حامل افراد کا Concentration span بڑا Narrow ہوتا ہے۔ جس انسان کا Concentration span جتنا وسیع اور زیادہ ہوتا ہے وہ اُسی قدر اپنے دماغ سے بہتر کام لے سکتا ہے۔ Concentration of mind کو Broad کرنے کے لیے جس مثبت سوچ کی ضرورت ہوتی ہے روحانیت اُس کو Develop کرتی ہے۔

جب انسان کسی سے گلہ شکوہ نہیں کرتا، کسی کی عیب جوئی نہیں کرتا، زیادتی کرنے والے کو بغیر اُس کے معافی مانگے معاف کر دیتا ہے، خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھانا کھلاتا اور اپنی ضرورت روک کر دوسروں کی خدمت کرتا ہے، اِس نیکی کو سائنس Positive thinking (مثبت سوچ) کہتی ہے جب کہ رُوحانیت میں ہم کہتے ہیں کہ جب آپ نیکی کی راہ اختیار کریں گے تو آپ کے مختلف Brain cells متحرک ہو جائیں گے۔

بات کو مزید سمجھنے کے لیے ہمیں ذرا پیچھے جانا پڑے گا۔ قرآن کے مفہوم کے مطابق اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو علم الاسماء سکھایا۔ وہ علم Genetically (جینیاتی طور پر) ہمارے اندر ٹرانسفر ہوا ہے۔ ہم اُس علم کو نیکی کی راہ اختیار کر کے Develop کر سکتے ہیں۔ آپ اسے نیکی نہ کہیے سائنس کی زبان میں یوں کہہ لیجیے کہ Genetically ہمارے اندر جو علم موجود ہے، اُسے Positive thinking (مثبت سوچ) اور Positive attitude (مثبت رویے) سے Develop کر کے ہم اُس دُنیا میں داخل ہو سکتے ہیں جسے ہم غیب کی دُنیا کہتے ہیں۔ غیب کیا ہے؟ جو ہماری نظروں سے اوجھل ہے وہ غیب ہے۔ عالم ارواح سے ہماری رُوح آئی وہ غیب ہے۔ مرنے کے بعد ہماری رُوح عالم برزخ میں چلی جائے گی۔ یہ غیب ہے۔ موجودہ زندگی میں آنے والا ہر لمحہ غیب ہے کیونکہ ہمیں معلوم نہیں کہ اگلے لمحے میں کیا ہونے والا ہے۔ ہم غیب میں رہے اور غیب میں چلے جائیں گے۔ اِس Aspect کے بارے میں رب تعالیٰ نے کہا کہ میں نے یہ سب تمھارے سینوں (قلب) میں رکھا۔ رُوحانیت میں ہم اِسے قلب جب کہ سائنس اِسے Brain کہتی ہے۔ سائنس کی رُو سے یہ سارا قصہ Positive thinking کا ہے جب کہ رُوحانیت اِسے نیکی کا نام دیتی ہے۔ اسی نیکی یا Positive thinking (مثبت سوچ) سے Concentration of mind اور Brain power (ذہنی قوت) Develop ہوگی۔

آپ مذہب کو Quote نہ کرنا چاہیں تو سائنسی زبان میں یوں کہہ لیجیے کہ Brain Power پیدا ہونے سے دماغ کے کچھ حصے (Cells) متحرک (Activate) ہو جائیں گے جس سے آپ اُس غیب کے قصے بھی دیکھ پائیں گے جہاں سے ہم آئے ہیں۔ امریکہ میں ایک نئے موضوع Distant viewing پر گزشتہ اٹھارہ سال سے کام ہو رہا تھا کہ نیویارک میں بیٹھا ایک شخص دریائے ایمزون کے کنارے بسے قبیلے کی خبر کیسے دیتا ہے۔ پھر انھیں اِس کی سمجھ آ گئی اور اُنھوں نے اِسے سائنس کی زبان میں Distant viewing کا نام دیا جب کہ رُوحانیت اِس کے لیے کشف کی اصطلاح استعمال کرتی ہے۔

بات ایک ہی ہے صرف Terminology کا فرق ہے۔ راہ ایک ہی اختیار کرنا پڑے گی۔ سائنس کے راستے سے جائیں تو Positive thinking جب کہ رُوحانیت کی زبان میں نیکی کی راہ اختیار کرنا ہوگی۔ مثبت سوچ اور نیکی ایک ہی بات ہے۔

توکل علی اللہ

یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے کہ لوگوں میں رُوحانیت کے حصول کا شوق بہت فراواں ہے۔ اِس شوق کے پیچھے ہمارے مقاصد اور Deep down ہمارے Subconscious میں کیا ہے اور ہم رُوحانیت سے دراصل حاصل کیا کرنا چاہتے ہیں، یہ ایک علیحدہ موضوع ہے۔ ہمارے ہاں بنیادی Problem یہ ہے کہ ہم نے اولیائے کرام کے بارے میں وہ کتابیں پڑھیں جو مریدوں کی لکھی ہوئی تھیں اور جن میں زیادہ زور کرامات پر دیا گیا تھا۔ اُن کرامات سے متاثر ہو کر ہمارے اندر بھی اُن قوتوں کے حصول کا شوق پیدا ہوا۔ حالانکہ اگر ہم اولیاء اللہ کی اپنی لکھی ہوئی کتب پڑھیں اور اُن کی زندگی کو Study کریں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نہ تو اُن کے درس و تدریس میں کرامات کا ذکر ہے اور نہ اُن کے Objectives میں۔ اگر اُن اولیاء اللہ نے کہیں کرامات کا ذکر کیا بھی ہے تو اُنھیں Condemn کیا ہے، اچھا نہیں گردانا۔

رُوحانیت کی راہ درحقیقت اُس وقت زیادہ مشکل ہو جاتی ہے جب ہمارا Aim and objective کرامات کا حصول ہو۔ جب ہم یہ حاصل نہیں کر پاتے تو ہمیں بڑی مشکل ہوتی ہے۔ اولیائے کرام کے مطابق اِس راہ کا چلن یہ ہے کہ انسان کو نہ تو اپنے کل کی فکر ہو نہ اپنے رزق کی۔ جس انسان کو اپنے کل کے رزق کی فکر لاحق ہو گئی وہ درویش نہیں۔ اگر خانقاہ پر کوئی ایسا آدمی نوٹس ہو جاتا جس نے اپنے آنے والے کل کے لیے رزق سنبھال رکھا ہوتا تو اُسے بددیانت سمجھا جاتا۔

بلکہ کل روٹی کہاں سے ملے گی؟ ملے گی یا نہیں؟ ایسی فکر کرنے والے آدمی کو اولیائے کرام اپنی خانقاہ سے رخصت کر دیا کرتے۔

بابا فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ نے ایک ایسے درویش کا ذکر کیا ہے جو جنگل میں رہتا تھا۔ ایک شخص اُس درویش کے پاس گیا اور اِس سوچ میں گم تھا کہ آبادی سے دُور اِس جنگل میں کھانے پینے کے اسباب نہ جانے کیسے دستیاب ہوں گے۔ جب کھانے کا وقت ہوا تو درویش نے آسمان کی طرف دیکھا، کھانا پیش ہو گیا۔ وہ شخص یہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ جب درویش کو پیاس لگی تو اُس نے زمین پر پاؤں مارا، چشمہ جاری ہو گیا۔ وہ شخص ایک بار پھر حیرت زدہ رہ گیا۔ رُخصت ہوتے وقت اُس نے دیکھا کہ درویش کا سیدھا ہاتھ کٹا ہوا تھا۔ وجہ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ درویش بہت سال پہلے رب کو یاد کرنے کے لیے جنگل کے غار میں مقیم ہو

گیا تھا۔ ایک روز اُس نے ایک دینار وہاں پڑا دیکھا تو اُسے گمان ہوا کہ شاید اللہ تعالیٰ نے وہ دینار بطور رزق اُس کے لیے رکھا ہے جیسے ہی اُس نے اُسے اُٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو ندا آئی کہ تم نے وعدہ خلافی کی۔ تم یہاں غار میں اِس توکل کی بنیاد پر مقیم ہوئے تھے کہ میرے سوا کسی پر رزق کے لیے توکل نہ کرو گے۔ تب شرمندگی کے مارے درویش نے تلوار سے اپنا وہ ہاتھ ہی کاٹ ڈالا جو دینار اُٹھانے کے لیے بڑھا تھا کیونکہ اُس ہاتھ نے اللہ پر توکل میں خلل ڈالا تھا۔

ہم جن بزرگوں سے Inspire ہوتے اور جنھیں Idealise کرتے ہیں وہ کل کی فکر سے آزاد ہوتے ہیں۔ جب انسان رب تعالیٰ پر بھروسا کرنے لگتا ہے اور دُنیاوی مال و زر سے منہ موڑ لیتا ہے، دُنیا سے توجہ ہٹا لیتا ہے تو ایک عجیب قانونِ فطرت دیکھنے میں آتا ہے کہ جو شخص بھی دُنیا سے دور بھاگا، دُنیا اُس کے پیچھے بھاگنے لگی اور جو دُنیا کی طرف بھاگا، دُنیا اُس سے آگے بھاگنے لگی۔ جو دُنیاوی مال و زر کا تعاقب کرتا رہا، مال و زر اُس سے آگے بھاگتا رہا۔

ہم اگر اپنی زندگی پر نظر دوڑائیں تو عجیب و غریب Phenomenon نظر آتا ہے کہ جب کام کے لیے شدت سے خواہش کی کہ ہو جائے اور شدت سے دُعا کی کہ یہ دُعا قبول ہو جائے تو وہ کام کبھی نہیں ہوا۔ وہ دُعا قبولیت کی سند نہ پا سکی۔ اِس کے برعکس کسی کام کے لیے ایک لمحہ کو سوچا اور پھر کہا کہ جیسے اللہ کو منظور...... کام ہونا ہوا تو ہو جائے گا۔ جس کام پر توجہ کر کے ہٹا دی، جس خواہش کو رب کے سپرد کر دیا اور بھول گئے...... وہ کام بہت جلدی ہو گیا اور خواہش بڑی جلدی پوری ہو گئی۔ وہ چیز حاصل ہو گئی۔

انسانی زندگی بڑی مزے کی چیز ہے۔ اگر ہم چھوٹے چھوٹے واقعات کو Analyse کرتے رہیں تو بہت Interesting حقائق سے آگہی ہوتی ہے مثلاً ہمارے کام اٹکے ہوں تو ہم دفتر نہیں جاتے اور کسی پیر صاحب کی تلاش میں رہتے ہیں کہ جو دُعا کریں اور ہمارے سارے کام ٹھیک ہو جائیں۔ ہم پیروں کا دروازہ چھوڑتے ہی نہیں...... میں بھی ایسا ہی کیا کرتا تھا۔ آفس جانے سے پہلے مرشد صاحب کے پاس حاضری دیتا، پھر ایک جگہ فٹ پاتھ کے کنارے تھڑے (چبوترے) پر بیٹھ کر ڈیوٹی دیتا اور اُس کے بعد آفس روانہ ہو جاتا۔ صبح سات بجے گھر سے نکلتا تھا۔ اُن دنوں پونے سات بجے ایک صاحب گھنٹی بجاتے۔ دروازے پر جاتا تو ایک ہی تکرار ہوتی ''شاہ صاحب! دُعا کر دیجیے کہ کہیں میری منگنی نہ ٹوٹ جائے۔'' جب میں دفتر جانے کے لیے گھر سے نکلتا اور گاڑی میں بیٹھنے لگتا تو وہ صاحب بھاگے بھاگے میرے پاس آتے اور کہتے ''دُعا کر دیجیے کہ میری منگنی نہ ٹوٹے۔'' جب میں سگنل پر رُکتا تو وہ صاحب وہاں بھی موجود ہوتے حتیٰ کہ جب تک میں میانی صاحب قبرستان نہ پہنچ جاتا وہ یہی گردان کرتے رہتے ''شاہ صاحب! دُعا کر دیجیے کہ میری منگنی نہ ٹوٹے۔''

بالآخر ایک روز میری زبان سے نکل گیا ''یار آپ کو منگنی کی اتنی فکر ہے تو دُعا کر دیتا ہوں کہ آپ کی شادی جو ایک سال میں ہونی ہے وہ اگلے پندرہ دن کے اندر ہو جائے۔'' یہ اتفاق کی بات ہے، اس میں میرا کوئی دخل نہیں کہ ایک ہفتے بعد اُن کی شادی کا کارڈ آ گیا کہ آئندہ ہفتے شادی ہے۔ شادی کے پندرہ دن بعد دوبارہ گھنٹی

بجی۔ دروازہ کھولا تو وہی صاحب تھے کہ "دُعا کر دیجیے کہ بیوی سے میری جان چھوٹ جائے۔"

جب بندہ اتنا اصرار کرتا ہے تو رب تعالیٰ گلے میں پھندا ڈال دیتا ہے۔ اگر ہم اپنی دُعاؤں میں محتاط ہو جائیں اور اپنے معاملات رب تعالیٰ پر چھوڑ دیں تو عام طور پر فائدہ میں رہتے ہیں۔

سوال: کیا موسیقی اسلام میں جائز ہے؟

جواب: ہم اکثر اسلام کے بارے میں بہت شدت پسند ہو جاتے ہیں۔ مولانا مودودی صاحب سے کسی نے داڑھی کے بارے میں پوچھا تو اُنھوں نے جواب دیا "اسلام میں داڑھی ہے، داڑھی میں اسلام نہیں ہے۔" اِسی طرح جن لوگوں کے نزدیک موسیقی اسلام میں منع ہے، اُن کی سوچ میں شدت پائی جاتی ہے حالاں کہ آپ ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو مدینہ کی بچیاں دف پر Welcome کے شعر گا رہی تھیں۔ جب ایک صحابیؓ نے بچیوں کو منع فرمانے کی کوشش کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اُنھیں کہنے دو۔"

دف میوزیکل Instrument ہے اور عرب میں بہت Popular ہے۔ اِسی طرح بہت سے اولیائے کرام کے مطابق سماع نہ صرف جائز ہے بلکہ اُن کے یہاں بڑی پابندی سے محفلِ سماع کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ اگر موسیقی رب کی طرف متوجہ کر دے تو یہ جائز ہے اور اگر رب تعالیٰ کی یاد سے غافل کر دے تو ناجائز۔

سوال: کیا ہمارے سات میں سے پانچ لطائف مختلف پیغمبروں سے روشنی لیتے ہیں؟

جواب: یہ میرے علم میں نہیں کہ ہمارے سات میں سے پانچ لطائف مختلف پیغمبروں سے روشنی (Light) لیتے ہیں البتہ یہ ضرور جانتا ہوں کہ ساتوں لطائف اُس وقت Activate ہوتے ہیں جب ہم اپنی ذات کے اندر نیکی اور پارسائی کا Combination (امتزاج) Develop کر لیتے ہیں۔

عبادات، اذکار اور نیک سوچ سے ہماری ذات میں پارسائی آجاتی ہے جب کہ نیکی کے حصول کے لیے ہم اپنے نفس کی مخالفت کر کے آپ ﷺ کی بتائی ہوئی راہ پر چلتے اور آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کی اِتباع کرتے ہیں۔ پارسائی اور نیکی کے اس Combination سے سات لطائف تو درکنار پوری رُوح لطیف اور بالیدہ ہونے لگتی ہے۔

جو صاحبان سات لطائف کو Activate کرنا چاہتے ہیں وہ مختلف قسم کے ذکر اذکار کرتے ہیں لیکن عام طور پر دیکھا یہ گیا ہے کہ ایسے صاحبان بتدریج عملیات کی طرف راغب ہونے لگتے ہیں۔ اگر Ultimate Objective رب کے قرب اور دوستی کا حصول ہے تو پھر ہمیں رُوح کی بالیدگی پر زور دینا ہوگا۔ اِس سے لطائف خود بخود Activate ہو جائیں گے۔ لیکن اگر ہمارے Objectives کچھ اور ہوں تو ہم مختلف مشقوں کے ذریعے لطائف کو اُجاگر کر سکتے ہیں۔ مثلاً ایک روز ایک Nostril (نتھنے) سے سانس لیں اور دوسرے Nostril سے Exhale کر دیں۔ دوسرے دن دوسرے Nostril سے Smoothly inhale کریں جب کہ پہلے سے جھٹکے سے ضرب لگا کر Exhale کر دیں۔ تیسرے دن یہ مشق کرتے ہوئے ساتھ ذکر بھی کریں۔ اس قسم کی مشقوں سے لطائف تو Activate ہو جائیں گے لیکن رب تعالیٰ کا قرب حاصل نہیں ہو

پائے گا۔ کیونکہ یہی ایکسرسائز بھکشو، سادھو، Saints وغیرہ بھی کرتے ہیں۔ اُن کی قوتیں بیدار ہوتی ہیں اور اُنھیں اِستدراج حاصل ہو جاتا ہے۔ اگر کسی مسلمان سے خلافِ فطرت کوئی عمل سرزد ہوتا ہے تو وہ کرامت، جب کہ غیر مسلم سے سرزد ہونے والا خلافِ فطرت فعل "اِستدراج" کہلاتا ہے۔ اِستدراج Through exercise ہر مذہب میں حاصل ہو جاتا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ ہم Ultimately کہاں پہنچنا چاہتے ہیں۔ اگر جنات کو قابو کرنا ہے تو مختلف عملیات اور ذکر اذکار سے یہ ممکن ہے۔ ہم کسی رُوح کے عامل بننا چاہتے ہیں تو تین دن کے معمولی عمل سے یہ ممکن ہے۔ اگر ہم کوئی اور کرامت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو مختلف ذکر اذکار سے لطائف Activate کر کے وہ کرامت دکھا سکتے ہیں لیکن ہمیں Clear ہونا چاہیے کہ دراصل ہمارا منتہائے مقصود کیا ہے۔

مسلمان کا منتہائے مقصود تو رب تعالیٰ کا قرب اور دوستی ہے۔ محض لطائف کو اُجاگر کرنے سے رب کی دوستی نہیں ملتی۔ رب کی دوستی پانے کے لیے ضروری ہے کہ پارسائی اختیار کی جائے، تمام معاملات میں آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کی پیروی کی جائے تاکہ ہم نیکی کی راہ پر گامزن ہو سکیں۔ پارسائی اور نیکی کا Blend ہمیں رب تعالیٰ سے قریب کر دے گا۔

سوال: کیا سورۃ التغابن پڑھنے سے یہ نشان دہی ہو جاتی ہے کہ کسی انسان کا راہِ تصوف میں مرشد یا گائیڈ کون ہے؟

جواب: ہمیں اِن تصورات سے باہر آجانا چاہیے۔ یہ عجیب وغریب تصور ہے کہ مرشد نہیں ہوگا تو شاید رب تعالیٰ نہیں ملے گا۔ رب تو ہر دل میں مل جاتا ہے۔ اگر ہم مرشد کی تلاش میں گزارنے والا وقت رب تعالیٰ کے ذکر، یاد اور نیکی کی راہ پر چلنے میں گزار دیں تو رب تعالیٰ کے انعامات کی بارش ہم پر ہو جائے گی۔ رب کا نظام ایسا ہے کہ ہر شے اور کام کا ایک وقت متعین ہے۔ جب مرشد سے آپ کے ملنے کا وقت آئے گا تو رب تعالیٰ از خود کوئی نہ کوئی بندوبست کر دے گا اور مرشد صاحب آپ کی تربیت فرما دیں گے۔ آپ اِس بات پر پریشان نہ ہوں۔

آپ سورۃ التغابن اس لیے نہ پڑھیے کہ اِس سے مرشد صاحب مل جائیں گے اِس طرح آپ سورۃ التغابن کے انعامات کو ایک بہت چھوٹے مقصد تک محدود کر لیں گے۔ سورۃ التغابن کی تلاوت کے وقت آپ کے پیشِ نظر یہ مقصد ہونا چاہیے کہ ہم سے جو رُوحانی کوتاہیاں سرزد ہو گئی ہیں، مختلف پڑھائیوں میں جو غلطیاں ہوئیں یہ تلاوت اُن کا مداوا کر دے گی اور ہماری رُوح کی تربیت اِس طرح کر دے گی کہ ہم اللہ کی راہ پر چل نکلیں گے۔ یہ بہت بڑا فائدہ ہے۔

سوال: غصہ کے عنصر کو اپنی ذات سے کیسے نکالا جا سکتا ہے؟

جواب: غصہ ہماری فطرت کا حصہ ہے اور ہماری حفاظت کے لیے بہت ضروری ہے لیکن ہم غصے کے گھوڑے کو بے لگام نہ ہونے دیں۔ اس کی لگامیں اور کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھیں۔ جب کبھی غصے سے بے حال ہونے لگیں تو سوچ لیں کہ آپ ﷺ غصہ پی جایا کرتے تھے۔ اِس سنت پر عمل کرتے ہوئے میں بھی غصہ پی لوں۔ اِس سوچ سے انسان غصہ پر قابو پا لیتا ہے۔

سوال: کیا ایسا ممکن ہے کہ انسان رُوحانیت کے سفر کی اِبتدا میں ہی اسرارِ الٰہی کی جھلک دیکھ لے تاکہ باقی رُوحانی سفر ثابت قدمی سے طے ہو سکے؟

جواب: رُوحانی راہ عقل اور Logic سے بالاتر ہے۔ ہم عقل اور Logic سے اُس کے کسی مقام پر نہیں پہنچ سکتے۔ جس انسان کو یہ بے چینی رہی کہ مجھے کچھ ملا یا نہیں، جو ہر نماز کے بعد اپنے آپ کو کھنگالتا رہا کہ میں آگے بڑھا یا نہیں، وہ خالی ہاتھ رہا، وہیں کھڑا رہا لیکن جس نے ان سوچوں سے بالاتر ہو کر رب کو لائق عبادت سمجھ کر پکارا اُسے سب کچھ مل گیا اور بڑی جلدی مل گیا۔

دیکھ کر تو سبھی ایمان لاتے ہیں۔ جو بن دیکھے رب پر ایمان لائے...... اُس کی قوتوں پر ایمان لائے...... وہ ایمان کے افضل اور اعلیٰ تر درجے پر ہے۔ اگر ہم کچھ دیکھ کر رب تعالیٰ پر ایمان لائے تو یہ ایمان کا Lower درجہ ہے۔ اس لیے ہم غیب پر ایمان لائیں جو ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے۔

اس تابنگ میں نہ رہیے کہ مجھے کچھ ملا یا نہیں۔ اس طرح کچھ نہیں ملے گا۔ یہ بھی نہ سوچیے کہ میں رب کو دیکھوں، اُس کی قدرت اور اسرار کا مشاہدہ کروں تو رب پر میرا ایمان پختہ ہو گا۔ اس طرح کی خواہشات رُوحانیت کی راہ میں ناکامی کا آسان نسخہ ہیں۔

سوال: خیال کی اِصلاح کیسے ممکن ہے؟

جواب: ہر عمل کی ابتدا سوچ سے ہے۔ جب سوچ کی اِصلاح ہو جائے تو عمل خود بخود بہتر ہو جاتا ہے۔ جب ذہن میں کوئی سوچ آئے تو اُسے ہم آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کی کسوٹی پر پرکھ لیں کہ کیا آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں ایسی کوئی نظیر ہے؟ اگر نظیر مل جائے تو اس سوچ پر عمل کر لیا جائے۔ یوں سوچ کی اصلاح خود بخود ہونے لگتی ہے۔

سوال: میں رُوحانیت کی راہ پر ہر طرح کی آزمائش اور مشکلات کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن چاہتا ہوں کہ میری فیملی کو مالی تنگی کا شکار نہ ہونا پڑے۔

جواب: اسلام ترکِ دُنیا اور رہبانیت کی مخالفت کرتا ہے۔ ہم رُوحانیت کی راہ پر دُنیا ترک کیے بغیر بھی چل سکتے ہیں۔ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ سے ہم سبق سیکھیں کہ آپ ﷺ نے دُنیا، دُنیاداروں سے زیادہ اور دین، دین داروں سے زیادہ نبھایا۔ آپ ﷺ زندگی کے ہر معاملے اور شعبے میں Excel کیے ہوئے ہیں۔ آپ ﷺ سے بہتر انسان آج تک دُنیا میں نہیں آیا اور نہ آئے گا۔

ہم مالی وسائل کی تنگی اپنی ذات پر سہہ لیں اور اپنے Dependents کو حتی المقدور اُس تنگی کا شکار نہ ہونے دیں۔ لیکن اگر کوئی چیز ہمارے اختیار سے باہر ہو جائے تو اللہ کے حضور اُس پر جواب دہی نہیں ہے۔ یوں بڑے آرام سے یہ راستہ طے ہو جائے گا۔

فیملی کی طرف سے شدید مخالفت کا آنا بھی رُوحانی راہ پر چلنے کا ایک Test ہے کیونکہ جب اپنوں کی طرف

سے دُکھ ملتے ہیں تو دل گداز ہوتا ہے۔ جب دُکھی انسان پلٹ کر جواب نہیں دیتا، زخم کھا کر بھی ہنستا رہتا ہے تو رُوحانی ترقی تیزی سے ہوتی ہے۔

ایک بار پھر زور دینا چاہوں گا کہ رُوحانیت کی راہ میں ہمیشہ اپنے Objectives (مقاصد) کے بارے میں Clear رہیں۔ کیونکہ Track سے ہٹنے کا خدشہ بہت ہوتا ہے۔ نظر اُسی Objective پر ہو کہ مجھے میرا رب چاہیے۔ مجھے نہ سیر چاہیے نہ کشف و کرامات۔ مجھے تو صرف اور صرف میرا رب چاہیے۔ اسی منزل پر نظر جما کے رکھیے۔ رب آپ کو مل جائے گا۔ Distractions بہت آئیں گی لیکن آپ اپنا Objective واضح رکھیں۔

ذوقِ مناجات سے شوقِ ملاقات تک

سوال: سورۂ یٰس کے فضائل بیان فرما دیجیے۔

جواب: حضرت انسؓ آپ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ ہر چیز کا ایک دل ہوتا ہے۔ قرآن کا دل سورۂ یٰس ہے۔ جو یٰس شریف پڑھے گا اُسے اُس کی قرأت کی وجہ سے دس بار قرآن مجید پڑھنے کا ثواب ملے گا۔

سورۂ یٰس مکی ہے۔ اس میں پانچ رُکوع اور 83 آیات ہیں۔ اس کی اِبتدا جس لفظ سے ہوئی وہی اِس سورہ کا نام ہے "یٰس"۔ علما میں اِس لفظ کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ یہ دراصل ہے کیا لیکن جو لوگ حروفِ مقطعات کا علم رکھتے ہیں، جن پر اللہ نے رحمت کی اور اُنھیں علم عطا کیا، وہ جانتے ہیں کہ یہ لفظ اُن 72 القابات میں سے ایک ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو شبِ معراج مخاطب فرمایا۔

"یٰس" درحقیقت "یا سید البشر" ہے جو کہ آپ ﷺ کا لقب ہے۔ سورۂ یٰس کی سب سے بڑی فضیلت اِس کا قرآن پاک کا قلب ہونا ہے۔ اِس کی مزید اہمیت کا اندازہ اِس حدیث مبارکہ سے لگایا جاسکتا ہے۔

"حضرت معقل بن یسارؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا یٰس کو اپنے موتوں[2] پر پڑھا کرو۔ (ابوداؤد، حدیث 3121)

سورۂ یٰس اموات کے قریب تلاوت کرنے کی تلقین کی گئی ہے تاکہ مرنے والا حالتِ نزع سے آسانی سے گزر جائے اور جاں کنی کی تکلیف سے اُسے راحت مل جائے۔

"حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری یہ تمنا ہے کہ یہ سورۂ یٰس ہر اُمتی کے دل میں ہوتی۔" (تفسیر ابن کثیر)

اگر شدید مشکلات میں اِس سورہ کی کثرت سے تلاوت کی جائے تو یا تو وہ مشکل اور مصیبت ٹل جاتی ہے یا پھر انسان اُس سے آسانی سے گزر جاتا ہے۔

سوال: سورۂ الملك کی فضیلت بیان فرما دیجیے۔

جواب: زیادہ تر علما کے نزدیک یہ سورہ مکی ہے اور آپ ﷺ کے نبوت کے ابتدائی ایام میں نازل ہوئی۔ اس کی 30 آیات اور دو رُکوع ہیں۔

"حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ سورۃ السجدۃ اور سورۃ الملك ہر رات پڑھتے اور سفر و حضر میں کبھی ترک نہ فرماتے۔" (ترمذی: 892)

"جو چاند دیکھ کر اِسے پڑھے گا وہ مہینے کے 30 دِنوں تک سختیوں سے محفوظ رہے گا۔ اس لیے کہ یہ 30 آیات ہیں اور 30 دن کے لیے کافی ہیں۔" (رُوح المعانی)

"حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "قرآن مجید میں ایک سورہ 30 آیتوں والی ہے۔ اُس نے میری اُمت کے ایک شخص کی سفارش کی اور اللہ نے اُس کی مغفرت فرما دی۔ یہ سورہ تبارک ہے۔" (ابوداؤد، نسائی)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ بعض صحابہؓ نے ایک جگہ خیمہ گاڑا۔ وہاں ایک قبر تھی جس کا اُنھیں علم نہ تھا۔ اُنھوں نے اُس قبر میں ایک شخص کو سورۃ الملك پڑھتے ہوئے سنا یہاں تک کہ اُس نے پوری سورہ ختم کر ڈالی۔ صحابہؓ نے آ کر آپ ﷺ سے یہ ماجرا بیان کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہ سورہ مانعہ (عذابِ الٰہی روکنے والی) ہے۔ یہ منجیۃ ہے جو عذابِ قبر سے نجات دیتی ہے۔ (ترمذی)

حضرت ابن عباسؓ نے ایک شخص سے فرمایا کہ "کیا میں تم کو ایسا تحفہ نہ دوں جس سے تم خوش ہو جاؤ۔" اُس نے عرض کی "بڑی مہربانی۔" آپ نے فرمایا "تبارك الذی بیدہ الملك پڑھا کرو۔ اپنی بیوی کو بھی سکھاؤ۔ اپنی ساری اولاد، اپنے گھر کے بچوں اور اپنے پڑوسیوں کو سکھاؤ کیونکہ یہ نجات دینے والی ہے، قیامت میں مجادلہ کرنے والی ہے۔" (رُوح المعانی، درمنثور، تفسیر ابن کثیر)

اگر ہم صبح و شام سورۃ الملك کی تلاوت کریں تو اللہ کے کرم سے یہی اُمید ہے کہ ہم بخش دیے جائیں گے۔

سوال: میں نے ذہنی ورزش کے طور پر مراقبہ شروع کیا۔ اِس سے دل میں سکون کے ساتھ ساتھ جسم میں کرنٹ بھی محسوس ہوتا ہے۔ اِس میں مزید بہتری کیسے لائی جائے؟

جواب: مراقبہ اِسی لیے کیا جاتا ہے تاکہ انسان کا تعلق کچھ وقت کے لیے اپنے Environment سے کٹ جائے۔ مراقبہ میں Concentration کی وجہ سے انسان اردگرد کے ماحول سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ بے سکونی ہے ہی اردگرد کے ماحول کی۔

اِن چیزوں میں بہتری کا کوئی Shortcut نہیں۔ صرف ایک ہی حل ہے کہ مسلسل محنت اور پریکٹس کی جائے جس کے نتیجے میں Perfection آ جائے گی لیکن یہ پریکٹس اُس عرب سٹوڈنٹ کی پریکٹس کی مانند نہ ہو جس نے اوکسفرڈ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اوکسفرڈ یونیورسٹی الفاظ کی دُرستی، ادائیگی تلفظ اور لب و لہجہ میں بہت Particular ہے۔ عربی حروفِ تہجی میں چونکہ "پ" نہیں ہے اس لیے عرب

"پ" کو "ب" بولتے ہیں۔ وہ عرب سٹوڈنٹ اپنی کلاس میں "P" سے شروع ہونے والے ہر لفظ کی جگہ "B" بولتے۔ ایک روز جب اُنھوں نے پاکستان کو باکستان کہا تو اُستاد نے جھنجلا کر کہا:

It's not Bakistan, it is Pakistan.

لیکن وہ عرب سٹوڈنٹ جب باوجود کوشش کے پاکستان کو باکستان ہی کہتے رہے تو اُستاد نے دھمکی دی کہ تلفظ ٹھیک نہ کیا تو یونیورسٹی سے نکال دیا جائے گا۔ مجبوراً عرب سٹوڈنٹ کئی دن چھٹی کر کے "P" کی پریکٹس کرتا رہا۔ اس کے بعد جب یونیورسٹی آیا تو اُستاد نے پوچھا کہ آپ نے اپنا "P" کا تلفظ ٹھیک کر لیا؟

عرب سٹوڈنٹ بولا "یس سر۔" اُستاد نے کہا "پاکستان Pronounce کرو۔" سٹوڈنٹ نے بڑے خوب صورت انداز میں کہا "پاکستان"۔

اُستاد نے خوش ہو کر پوچھا "کس طرح تم نے اپنا تلفظ ٹھیک کیا؟" عرب سٹوڈنٹ بولا:

Sir! By Bractice.

آپ مراقبہ کی ایسی پریکٹس نہ کیجیے گا۔ آپ اپنے طریقے کے مطابق مراقبہ کرتے رہیے۔ اس سے نہ صرف سکون بڑھتا رہے گا بلکہ آپ کا Vision بھی مزید Clear ہوتا جائے گا۔

سوال: یہ کیسے ممکن ہوا کہ کائنات یک دم سے وجود میں آ گئی؟

جواب: سائنس اور مذہب میں یہ بحث بہت پرانی چلی آ رہی ہے۔ اسلام کا پیش کردہ نظریہ سائنس سے بہت قریب ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ عدم سے وجود تک کا سفر بغیر کسی توانائی کے ہو نہیں سکتا۔ کائنات اگر لاموجود سے موجود میں آئے گی تو اس کے لیے Bases کا ہونا ضروری ہے۔ Bases کے بغیر یہ کام ہو نہیں سکتا اس لیے سائنس کی یہ تھیوری بالکل درست ہے۔

اسلام میں کائنات کے وجود میں آنے کی تھیوری یہ ہے کہ جب کچھ نہ تھا تو رب موجود تھا، جنات اور فرشتے موجود تھے۔ رب نے چاہا کہ وہ کائنات تخلیق کرے۔ اُس نے "کُن" کہا اور یہ کائنات چھ دن اور چھ راتوں میں عدم سے وجود میں آ گئی۔

سائنس کے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ رب تعالیٰ ہر شے کا Source of energy ہے۔ تمام قوتیں رب ہی کے پاس ہیں۔ تمام Energy وہیں سے Emit ہوتی ہے۔ اس Source of energy نے جب چاہا کہ کائنات وجود میں آ جائے تو اُس کے "کُــن" کہنے سے Source of energy سے انرجی Release ہوئی اور یہ کائنات وجود میں آ گئی۔ سائنس کہتی ہے کہ تخلیقِ کائنات سے قبل کچھ نہیں تھا جب کہ اسلام کہتا ہے۔ رب موجود تھا۔ چونکہ رب ہر شے کے لیے Source of energy ہے اُس نے جب اس کائنات کو وجود میں لانا چاہا تو کُــن کہا۔ کُــن کہنے سے انرجی Release ہوئی۔ یوں یہ کائنات بغیر کسی Reason کے نہیں بلکہ Energy ریلیز ہونے سے وجود میں آئی۔ اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ بلب روشن ہو جائے تو ہم بٹن دباتے ہیں جس سے اتنی انرجی ریلیز ہو جاتی ہے کہ وہ بلب روشن

ہو جاتا ہے۔ اسی طرح "کُن" کہنے سے وہ انرجی Release کی گئی اور رب نے جو چاہا تھا کہ ایسی کائنات تخلیق ہو تو کائنات نے ویسی شکل اختیار کر لی۔

Big Bang کی جو تھیوری آئی وہ یہی ہے۔ فرق بس اتنا ہے کہ ہم جسے "کُن" کہتے ہیں سائنس اُسے Big Bang کا نام دیتی ہے۔

سوال: انسان مختار ہے یا مجبور؟

جواب: حضرت علیؓ سے جب یہی سوال ایک شخص نے پوچھا تو اُنھوں نے اُسے کہا "اپنا ایک پاؤں اُوپر اُٹھاؤ۔" اُس نے اُٹھا لیا تو فرمایا "اب دوسرا بھی اُٹھاؤ۔" وہ شخص بولا "یہ تو میرے اختیار میں نہیں۔" حضرت علیؓ نے فرمایا "انسان اتنا ہی مجبور ہے اور اتنا ہی مختار ہے کہ ایک ٹانگ تو اُٹھا سکتا ہے، دوسری نہیں۔"

انسان تقدیرِ مبرم (معین) کے سامنے مجبور ہے لیکن وہ کُل تقدیر کا 5 سے 10 فی صد حصہ ہے۔ باقی 90-95 فی صد تقدیر انسان خود بناتا ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان نیم مختار اور نیم مجبور ہے۔

سوال: کیا دقیق مسائلِ تصوف کا علم حاصل کرنے سے پہلے بنیادیں مضبوط کرنا ضروری ہے؟

جواب: علم حاصل کرنا بڑا اچھا عمل ہے۔ ہمیں علم سیکھنا چاہیے لیکن لازم ہے کہ پہلے میں ایسا علم سیکھ لوں جو مجھے وہ روشن راہ دکھا دے جس پر رب مجھے چلانا چاہتا ہے۔

ہم عام طور پر سمجھتے ہیں کہ میں بہت اچھا مسلمان ہوں کیونکہ میں شراب نہیں پیتا، جوا نہیں کھیلتا، سوٗر نہیں کھاتا...... کیا ہوا اگر میں غیبت کرتا، جھوٹ بولتا اور لوگوں کا حق مارتا ہوں۔ اگر ہم ذرا غور کریں تو بڑی شرم آتی ہے کہ روزِ قیامت مجھ سے حقوق اللہ کی ادائیگی کے ساتھ اگر اللہ نے پوچھ لیا کہ تم نے میرے بندوں کے ساتھ کیا سلوک کیا تو تب حقوق اللہ کے بارے میں معافی مانگ لوں گا کہ "یا باری تعالیٰ! کوتاہی ہو گئی۔ تو رحیم و کریم ہے۔ میں تجھ سے تیرے رحم و کرم، تیری رحمتوں اور مہربانیوں کا گمان رکھتا ہوں کہ تو مجھے معاف فرما دے۔"

لیکن ذرا سوچیے کہ اُس وقت مَیں حقوق العباد کی ادائیگی میں ہونے والی کوتاہیوں کا جواب کیسے دے پاؤں گا، جس شخص کی میں دن رات غیبت کرتا رہا، روزِ محشر اُسے کیسے ڈھونڈوں گا، جن پر تہمتیں اور بہتان محض زبان کے چسکے کے لیے لگاتا رہا اُن سب کو کیسے ڈھونڈ کر اُن سے معافی مانگوں گا تاکہ رب تعالیٰ سے عرض کر سکوں کہ "اُن سب نے مجھے معاف کر دیا اب تُو بھی مجھے معاف فرما دے۔"

پہلے ہم اپنے بنیادی رویے درست کر لیں اور اُن پر پختہ ہو جائیں تاکہ روزِ قیامت ہمیں آپ ﷺ کے حضور شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ پھر علم کے ایڈوانس مقامات پر ہمارا سفر ہو سکتا ہے۔

سوال: آپ کسی کو ٹافی اور کسی کو کوئی اور چیز دیتے ہیں۔ جن کو کوئی اور چیز دیتے ہیں کیا وہ آپ سے زیادہ قریب ہوتے ہیں؟ اور کیا ٹافی دینے کا کوئی خاص مقصد ہوتا ہے؟

جواب: آپ ﷺ کے پاس جو بھی آتا آپ ﷺ اُسے کچھ نہ کچھ دے کر رخصت فرماتے۔ میں اس سنت پر عمل کرتا ہوں چونکہ کچھ اور دے نہیں سکتا اس لیے اپنے پاس آنے والوں کو ٹافی (سویٹس) دے دیتا ہوں۔ جہاں تک ٹافی کے سوا کوئی اور چیز دینے کا تعلق ہے تو بات یہ ہے کہ میرے پاس آنے والے کچھ لوگ

جب کوئی تحفہ لے کر آتے ہیں تو چونکہ تحفہ قبول کرنا سنت ہے اس لیے میں شکریہ کے ساتھ وہ لے تو لیتا ہوں لیکن جب کوئی بندہ میرے پاس آتا ہے اور دل سے آواز آتی ہے کہ وہ تحفہ اُسے دے دوں تو میں وہ چیز اُسے دے دیتا ہوں۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ کوئی مجھ سے زیادہ قریب ہے تو اس لیے وہ چیز دی۔ کوئی بدترین دشمن بھی اگر میرے پاس تشریف لے آئیں تو میرے پاس جو ہوگا وہ اُنھیں دے دوں گا۔ کیونکہ آپ ﷺ ہدیے اور تحائف قبول فرماتے لیکن گھر جانے سے پہلے اُنھیں سب میں تقسیم فرما دیا کرتے تھے۔

سوال: آپ دُعا کر دیجیے کہ میں اپنے ذمہ واجب الادا تمام قرض ادا کر دوں اور پھر اللہ مجھے موت دے دے۔

جواب: بھائی! آپ ﷺ نے مرنے کی دُعا مانگنے سے منع فرمایا ہے۔ قرض رب تعالیٰ اُتار دیا کرتا ہے صرف ہمیں اُس طرح کوشش کرنی چاہیے جس طرح ہم پر فرض ہے۔ آپ پوری قوت سے محنت کیجیے اور ساتھ رب تعالیٰ سے دُعا بھی کرتے رہیے "یا اللہ! مجھ پر رزق وسیع فرما دے تاکہ میں قرض اُتار سکوں۔ میں قرض کے ساتھ مرنا نہیں چاہتا۔" رب تعالیٰ رحیم و کریم ہے، وہ ضرور آپ کی دُعا سنے گا اور آپ کا قرض اُتر جائے گا۔

سوال: ایسا کیا کام کروں کہ اللہ تعالیٰ کے حضور سرخرو ہو جاؤں۔

جواب: آپ میں جتنی ہمت اور سکت ہے اُس کے مطابق اخلاص کے ساتھ اللہ کے بندوں کی خدمت کر لیجیے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے گا اور اُس کے صدقے آپ کی مشکلات آسان ہو جائیں گی۔

حضرت علیؓ نے فرمایا تھا کہ مصیبت کا مقابلہ صدقہ و خیرات سے کیا کرو۔ آپ کوشش کر کے تین کام کریں۔

1۔ کسی بھوکے کو کھانا کھلا دیا کریں۔

2۔ کسی قیدی کو آزاد کرا دیں یا اُس کا جرمانہ ادا کر دیں۔

3۔ کسی مقروض کا قرض ادا کریں۔

اللہ تعالیٰ کو یہ تینوں عمل بہت پسند ہیں۔

سوال: مجھے اپنے اعمال کی وجہ سے حج وعمرہ پر جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔

جواب: اگر انسان کے اندر رب تعالیٰ کے حضور جواب دہی کا احساس اتنا مضبوط ہو جائے کہ وہ واقعتاً شرم و حیا کے مارے رب تعالیٰ اور آپ ﷺ کے سامنے نہ جانا چاہے تو یہ احساس بہت مبارک ہے کیونکہ جب انسان کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے تو سمجھ لیجیے کہ وہ غلطی 50 فی صد ٹھیک ہو گئی۔ باقی 50 فی صد Effort کرنے سے ٹھیک ہو جائے گی۔

اگر وسائل اجازت دیں تو حج فرض ہے۔ آپ یہ فرض ادا کر لیجیے اور دُعا بھی کرتے رہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے آپ کو توفیق عطا فرما دے کہ آپ اُس کے بتائے ہوئے راستے پر چل سکیں۔

سوال: جب مرنے کے بعد رب تعالیٰ کی طرف ہی لوٹ جانا ہے تو پھر پریشانی کس بات کی؟

جواب: قرآن پاک میں ہے کہ ہر شے کو اپنے اصل کی طرف لوٹ جانا ہے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون کا یہی مطلب ہے۔ ہم سب عالمِ ارواح سے آئے تھے اور ہمیں لوٹ کر رب ہی کی طرف جانا ہے۔

آپ کا یہ کہنا کہ جب رب تعالیٰ ہی کی طرف لوٹ جانا ہے تو پھر پریشانی کس بات کی بھائی! پریشانی لوٹ جانے کی نہیں، حساب کتاب کی ہے جو بندے کو روزِ حساب دینا پڑے گا۔ فقیر موت کے منتظر ہوتے ہیں۔ رب سے ملاقات کے خواہش مند رہتے ہیں لیکن حساب کتاب کا سوچ کر کانپتے رہتے ہیں کہ میں کس منہ سے رب کے حضور حاضر ہوں گا کیونکہ نامۂ اعمال میں تو سیاہی بھری ہے۔

نامۂ اعمال کی سیاہی سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ گناہوں سے بچنے کی کوشش کی جائے، توبہ استغفار کو اپنا معمول بنا لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ غفور الرحیم اور کریم ہے وہ یقیناً معاف کر دے گا۔ میں نے اُسے اتنا مہربان پایا کہ اُس نے کبھی رحم کی درخواست رد نہیں کی بشرطیکہ وہ درخواست سچے دل سے اُٹھی ہو۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ ہمارے اردگرد کے لوگ ہماری آزمائش کے لیے بنائے گئے ہیں۔ جب آزمائش اسی طرح ہو جاتی ہے تو پھر سزا و جزا کا معاملہ کیوں؟

جواب: ہمارے اردگرد کے لوگ آزمائش کے لیے بنائے گئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں سے ہم پیار کرتے ہیں کہیں اُن کی محبت ہمیں اللہ کی راہ سے بھٹکا تو نہیں دیتی۔ اسی طرح کسی کے ساتھ ہماری دشمنی ہمیں حدود پار کرنے پر مجبور تو نہیں کر دیتی۔ یوں ٹیسٹ لوگ نہیں بلکہ یہ ہے کہ کسی کی محبت یا دشمنی میں ہم اللہ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز تو نہیں کر جاتے اور ہمارے رویے رب تعالیٰ کے پسندیدہ رویوں سے مختلف تو نہیں ہو جاتے۔ سزا و جزا کا معاملہ اِس لیے ہے کیونکہ رب تعالیٰ نے ہمیں مجبورِ محض نہیں بنایا بلکہ ہمیں بہت سے اختیارات دیے۔ ہم جو چاہیں سوچیں ...... اچھا یا بُرا سوچنے کی ہمیں مکمل آزادی ہے۔ پھر ہم نے جو سوچا ہو اُس کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کی بھی ہمیں مکمل آزادی اور اختیار حاصل ہے۔ پھر اُس فیصلے پر عمل کرنے یا نہ کرنے کی بھی ہمیں آزادی ہے۔

جواب طلبی اِس بات کی ہے کہ میں نے رب تعالیٰ کے عطا کردہ اِختیار کو استعمال کیسے کیا۔ سزا و جزا کی بنیاد بھی اِختیار کے استعمال کے طریقے پر ہے۔ اگر میں نے اللہ تعالیٰ کے احکامات کی خلاف ورزی کی ہو گی تو سزا جب کہ پیروی کی صورت میں جزا مل جائے گی۔

ہم غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ مجھ سے کوئی بُرے رویے یا عمل کی وجہ پوچھے تو میں ایک دم کہوں گا اُس نے بھی تو میرے ساتھ ایسا ہی کیا تھا۔ Justification دیتے وقت مجھے یہ خیال نہیں آئے گا کہ مجھے اپنے اعمال کا جواب دینا ہے۔ جس نے میرے ساتھ غلط سلوک کیا وہ اپنے اعمال کا خود جواب دہ ہے۔ میں رب تعالیٰ کے حضور یہ نہیں کہہ پاؤں گا کہ چونکہ فلاں شخص نے میرے گھر چوری کی تھی اس لیے میں نے دوسرے آدمی کے

گھر چوری کر لی۔ میرا یہ عمل Justify نہیں ہوگا۔ میری چوری پھر بھی چوری ہی رہے گی۔ اس لیے دوسروں کا سلوک دیکھے بغیر ہم اپنا سلوک بہتر کر لیں اور وہ کام کریں جو رب تعالیٰ نے ہم پر فرض کیا ہے۔

سوال: کیا ایک لاکھ بار اللہ تعالیٰ کا نام لینے سے حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مرتبے کو پہنچا جا سکتا ہے؟

جواب: نہیں۔ بالکل نہیں۔ جناب! داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کا مرتبہ اِتنا بلند اِس لیے ہے کیونکہ وہ محض اللہ کا نام نہیں جپتے تھے بلکہ اُنھوں نے اپنی زندگی مکمل طور پر اللہ کے بتائے ہوئے احکامات کے مطابق ڈھال رکھی تھی۔ وہ اُس Pattern of life سے بھی کہیں آگے چلے گئے تھے جو رب تعالیٰ اپنے بندے سے چاہتا ہے۔ نتیجہ یہ تھا کہ رب تعالیٰ اُن رحمۃ اللہ علیہ سے راضی ہو گیا اور اُنھیں بلند مرتبہ عطا فرمایا۔

تسبیح پڑھنے، ذِکر اذکار کرنے اور میرے جیسا زندگی کا Pattern بنانے سے انسان کبھی اُس مقام پر نہیں پہنچتا۔ یہ سب پانے کے لیے پارسائی اور نیکی کو یک جا کرنا پڑے گا۔ اِس یک جائی کے نتیجے میں بلند مقام حاصل ہوگا۔ صرف اللہ کا نام جپنے سے کچھ نہیں ہوگا۔

سوال: کوئی طریقہ بتا دیجیے کہ مرتے وقت جان آسانی سے نکل جائے۔

جواب: بہت سادہ جواب ہے کہ نفس مطمئنہ کے مقام پر آ جایئے۔ جس کا نفس اُس مقام پر آ گیا وہ رب سے ملاقات کا متمنی و منتظر رہتا ہے اور بڑی آسانی سے اُس کی جان نکل جاتی ہے۔

فضیلتِ تلاوتِ کلامِ پاک

قرآن پاک کی تلاوت کی بہت فضیلت ہے۔ جو بھی قرآن پاک کی کثرت اور باقاعدگی سے تلاوت کرتا ہے اُس کی آنکھیں دُکھنے نہیں آتیں۔ رُوحانی طور پر بھی تلاوت کے بے پناہ فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ تلاوتِ قرآن پاک کے وقت ہم براہِ راست رب تعالیٰ سے محوِ کلام ہوتے ہیں۔

اہلِ فقر کثرت سے تلاوت کرتے ہیں۔ چونکہ فقیر اپنے معمولاتِ عبادت پوشیدہ رکھتا ہے اِس لیے عام لوگوں پر یہ بات ظاہر نہیں ہوتی۔ لیکن اگر آپ اُس کی قربت میں رہیں تو یہ بھید عیاں ہو جائے گا۔

فقیر کو جو مشاہدہ حاصل ہوتا ہے اُس کی اِبتدا عموماً تلاوتِ قرآن کے دوران ہوتی ہے۔ قوتِ مشاہدہ یا اذنِ مشاہدہ اُسے تلاوت کے دوران حاصل ہوتا ہے۔ مختلف آیات کی تلاوت کے وقت اُن آیات کی مختلف کیفیات فقیر پر طاری ہونے لگتی ہیں اور اُن کیفیات میں فقیر جو مشاہدہ یا سیر کرتا ہے وہ کمال ہے۔ مشاہدہ یا سیر کے لیے تلاوت کلامِ پاک اکسیر کا کام کرتی ہے۔

اکثر فقیر قرآن پاک حفظ کر لیتے ہیں اور چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے دل میں قرآن پاک کی تلاوت کرتے رہتے ہیں۔ قرآن پاک بآسانی حفظ کرنے کا نسخہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عطا فرمایا کہ جو شخص سورۂ یوسف حفظ کر لے اُسے قرآن پاک بہت آسانی سے حفظ ہو جاتا ہے۔

کچھ لوگوں کی یادداشت کمزور اور Retention power کم ہو جاتی ہے جسے بڑھانے کا نسخہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ نے بتایا کہ جو شخص سورۃ الجمعۃ یاد کر لے اُس کی یادداشت بہتر ہو جاتی ہے۔

جب ہم کسی فقیر کے پاس جائیں اور درخواست کریں کہ ہمیں کوئی وظیفہ پڑھنے کے لیے دے دیجیے۔ لیکن فقیر کوئی وظیفہ بتانے کے بجائے ہمیں تلاوتِ قرآن پاک کی تلقین کرے تو ہم اُسے یہ سوچ کر سرسری طور پر نہ لیں کہ اصل چیز تو وظیفہ ہی ہے۔ یاد رکھیے! اگر وظیفہ کرنے کا مقصد دُنیاوی کام یا رُوحانی درجات کا حصول ہے تو پھر وظیفہ کا کوئی فائدہ نہیں لیکن اگر یہ سوچ کر وظیفہ کیا کہ میرا رب مجھے مل جائے تو پھر یہ بہت اعلیٰ اور مفید چیز ہے۔

ہم ہر نماز کے بعد تلاوت کرنے کی کوشش کریں۔ اگر روزگار کی مجبوریاں آڑے آتی ہوں تو کم از کم یہ کر لیں کہ جو سورتیں ہمیں زبانی یاد ہیں اُن کی دل ہی دل میں تلاوت کر لیا کریں۔ لیکن نماز فجر، عشاء اور تہجد

کے وقت روزگار کی مجبوریاں ہمارے آڑے نہیں آتیں۔ ان اوقات میں ہم تلاوت کو اپنا معمول بنا لیں۔

تلاوت کے وقت اُس کے آداب ملحوظ رکھیں۔ کوشش کریں کہ ہم تنہائی میں نفلی عبادت کریں۔ قرآن پاک کی تلاوت بھی تنہائی میں کریں۔ لباس پر خوشبو لگا لیں۔ کمرے میں کوئی خوشبو سا لگا لیں۔ اگر ہمیں اگربتی سے الرجی ہے تو فرنس آئل جلا لیں۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو روئی پر عطر ڈال کر اُسے جانماز کے ایک کونے پر رکھ دیں تو اُس کی خوشبو کمرے میں پھیلی رہے گی۔ فرشتوں کو خوشبو بہت پسند ہے اور وہ بہت خوشی سے خوشبودار جگہ پر آتے ہیں۔

ہم قرآن پاک اتنی آواز میں پڑھیں کہ وہ آواز خود سن سکیں۔ جب ہم اپنی ہی آواز کو بغور سنیں گے اور لفظوں پر دھیان دیں گے تو ہماری توجہ خود بخود ہماری آواز پر رہے گی۔ یوں ذہن بھٹکے گا نہیں اور ہمیں یکسوئی حاصل ہو جائے گی۔ اس طرح تلاوت کی بہت دینی و دُنیاوی برکات حاصل ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن پاک پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

سوال: کیا نام کا انسانی شخصیت پر اثر پڑتا ہے؟ کیا نام تبدیل کرنے سے پہلے والا اثر ختم ہو جاتا ہے؟ کیا نام، مقامِ پیدائش اور وقتِ پیدائش بھی شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے؟

جواب: آپ ﷺ کے فرمان ہے:

.....اُم المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اچھوں کے نام پر نام رکھو اور اپنی حاجتیں اچھے چہرہ والوں سے طلب کرو۔ (مسند الفردوس للدیلمی، حدیث 2329)

نام کا اثر یقیناً شخصیت پر ہوتا ہے۔ یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ کسی بچے کا نام تبدیل کرنے سے اُس کی شخصیت پر اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ تاریخِ پیدائش، وقتِ پیدائش اور مقامِ پیدائش کا جہاں تک تعلق ہے تو آپ جانتے ہیں کہ اللہ نے جو علوم Release کیے اُن میں سے اب تک انسان 8,111 علوم پر دسترس حاصل کر سکا ہے۔ ہر طرح کے علوم اس میں شامل ہے۔ پامسٹری، آسٹرالوجی، علم الاعداد (Numerology) بھی انہی علوم میں سے ہیں۔ چونکہ مسلمان رب پر بھروسا کرتا ہے کہ یہ میرا رب ہی ہے جو اس کائنات کو چلا رہا ہے جس کے حکم کے تحت اور تابع ہر شے ہے۔ ہر طرح کے علوم بھی اُسی کے تابع ہیں۔ مسلمان ان علوم پر یقین نہیں رکھتا بلکہ اُس کا یقین اس پر ہے کہ ہر چیز من جانب اللہ ہے۔ رب اتنا عظیم ہے کہ کسی کی محنت کو اُدھار نہیں رکھتا اور اُس کا Reward (اجر) بڑھا چڑھا کر عطا کرتا ہے۔ مسلمان اللہ کی قدرت اور رحمت پر بھروسا کرتا ہے۔ محنت، کوشش اور جدوجہد کرنے کے بعد انسان اس یقین کے ساتھ نتیجہ رب پر چھوڑ دیتا ہے کہ میرا رب بہت مہربان ہے، وہ میری کوششوں کا اجر میری محنتوں سے کہیں زیادہ عطا کرے گا اور یقیناً وہ عطا فرماتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ سب علوم میرے رب کے ماتحت ہیں۔ رب جو چاہے گا وہی کرے گا۔ وہ نہیں ہوگا جو علوم چاہیں گے۔ اس کا مظاہرہ خود میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ میرے مرشد سید یعقوب علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے

پاس ایک صاحب آئے جو علمِ رمل کے ماہر تھے، آسٹرالوجی اور علم الاعداد بھی جانتے تھے۔ وہ مرشد صاحب کے پاس بیٹھ کر علوم سیکھا کرتے۔ مرشد صاحب اُنھیں تعلیم دیا کرتے کہ یہ Figure (نمبر) تم نے غلط کر دیا۔ اسے یوں نہیں یوں کرو۔ ایک روز مرشد صاحب نے اُنھیں اس علم کو استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔

اس کے کچھ دن گزر جانے کے بعد جب میں مرشد صاحب کے پاس گیا تو وہ صاحب وہاں بیٹھے حساب کتاب کر رہے تھے۔ مرشد صاحب نے اور خود میں نے بھی کوئی توجہ نہ دی۔ اچانک اُنھوں نے کاغذ قلم ایک طرف رکھا اور مجھے مخاطب کر کہنے لگے "شاہ صاحب! آپ نے جو کمانا ہے، دو اڑھائی سال میں کما لیجیے کیونکہ اس کے بعد زندگی میں کچھ ہو جائے گا۔" میں نے حسبِ عادت اُن کی بات ہنسی میں اُڑا دی۔ مرشد صاحب کو اُن کا میرے بارے میں یہ سب کہنا اچھا نہ لگا۔ اُنھوں نے ماتھے پر تیوری ڈال کر پوچھا "آپ نے یہ سب کیسے کہا۔" وہ بولے "آپ نے جو علم سکھایا ہے اُس کی مدد سے حساب لگایا ہے۔" تب مرشد صاحب نے بہت خوب صورت بات کہی کہ "حساب تو تم نے ٹھیک کیا لیکن یہ مت بھولو کہ اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں جو اُنگلی کے اشارے سے ستاروں کی چال بدل دیتے ہیں۔" اس کے بعد اُنھوں نے آسمان کی طرف دائیں ہاتھ کی شہادت کی اُنگلی اُٹھائی اور کہا "بدل دے بھئی چال اپنی۔" ٹھیک ایک منٹ بعد مرشد صاحب نے اُن صاحب سے کہا "دوبارہ حساب کرو۔" اُنھوں نے حساب کیا تو اُن کے پسینے چھوٹ گئے۔ بے ساختہ گویا ہوئے "حضور! سارا حساب بدل گیا۔" مرشد صاحب کہنے لگے "تم اُس حساب کی بنیاد پر بات کہہ رہے تھے جو اللہ کے ایک عاجز بندے کی اُنگلی کے اشارے سے اپنا راستہ بدل دے۔"

صاحبو! اِن علوم کی حقیقت بس اتنی ہی ہے۔ سچی بات ہے کہ میرے پاس گناہوں کے سوا کچھ نہیں۔ ایک بار ایک صاحب مجھے ایک پیر صاحب کے پاس لے گئے۔ اُن کے شاگرد بھی وہاں بیٹھے تھے۔ میرا تعارف کرایا گیا کہ یہ سرکاری ملازم ہیں۔ میرا نام بتانے لگے تو میں نے Interrupt کرتے ہوئے کہا کہ سرفراز اے شاہ میرا سرکاری نام ہے۔ جب کہ اصل میں پورا نام سرفراز احمد ہے۔ چونکہ Ministry میں ہم دو سرفراز احمد تھے۔ دوسرے سرفراز احمد میری وجہ سے پستے رہتے تھے۔ میرے سارے غلط کام اُن کے کھاتے میں چلے جاتے اور وہ پٹتے رہتے۔ اُن کی تمام اچھائیاں میرے کریڈٹ پر آ جاتیں اور میں اچھا بن جاتا۔ تب میں نے اجازت لے کر اپنا نام سرفراز اے شاہ کر لیا۔

جب میں نے اُن پیر صاحب کے شاگرد کو اپنا نام سرفراز احمد بتایا تو وہ علمِ جفر کی مدد سے حساب کتاب کرنے لگے۔ پھر کہنے لگے کہ اپنا ہاتھ دکھائیے جسے دیکھ کر وہ مختلف باتیں مجھے بتانے لگے۔ تب میں نے کہا کہ "ذرا میرا ہاتھ چھوڑیے۔" جیسے ہی اُنھوں نے میرا ہاتھ چھوڑا میں نے اپنا بایاں ہاتھ تین بار دائیں ہاتھ پر پھیرا اور ہاتھ اُن کی طرف بڑھا کر بولا "دیکھ کر بتائیے کہ لکیریں وہی ہیں یا Change ہو گئیں۔" اُنھوں نے غور کیا تو حیرت سے اپنے پیر صاحب سے کہنے لگے "حضور! دُنیا میں یہ دوسرا آدمی دیکھا ہے جس نے ہاتھ کی لکیریں تبدیل کر لی ہیں۔" میں نے کہا "جناب! یہ نہ کہیے کہ ایسا میں نے کیا ہے۔ یہ تو رب آپ کو دکھا رہا ہے کہ آپ جن لکیروں پر بھروسا کرتے ہیں ایک گناہ گار بندہ بھی اُن لکیروں کو تبدیل کرنے پر قادر ہے۔ رب تو

عظیم ترین ہستی ہے۔ رب کا ایک حقیر بندہ بھی اپنے ہاتھ کی لکیریں اور اشارے سے ستاروں کی چالیس بدل سکتا ہے۔''

آپ یہ سب علم سیکھ لیجیے لیکن اس پر بھروسا نہ کیجیے۔ یہ نہ سمجھیے کہ تاریخ پیدائش، وقت پیدائش یا مقامِ پیدائش ہماری تقدیر کو بدل سکتا ہے۔ بالکل ایسا نہیں۔ تقدیر صرف رب بدلتا ہے۔

سوال: نماز تو بہت جلد ختم ہو جاتی ہے۔ عبادت میں تسلسل کے لیے کیا کیا جائے؟

جواب: ہمارا یہ تصور غلط ہے کہ عبادت صرف نماز تک محدود ہے۔ لفظ ''عبادت'' بندگی سے نکلا ہے۔ بندگی کا مطلب ہے کہ ہم کسی بات کو تسلیم کر لیں۔ جب ہم اللہ کی عبادت کرتے ہیں تو اللہ کے ہر فرمان کی اِطاعت کرتے ہیں۔ عبادت صرف Ritual کا نام نہیں کہ نماز پڑھ لیں، روزہ رکھ لیں، زکوٰۃ دے دیں، حج کر لیں۔

جو لوگ صحیح طریقے سے اللہ کی بندگی کرتے ہیں اُن کا سونا بھی عبادت ہے۔ مومن سوتا اِس لیے ہے تا کہ وہ جسم کو آرام دے کر بہتر طریقے سے رب کی عبادت کر سکے۔ جب ہم اللہ کی کسی بھی بات کو مانتے اور اُس کے فرمان کے مطابق قدم اُٹھاتے ہیں تو یہ بندگی ہے۔

اللہ کی بات یہ سوچ کر مانی جائے کہ وہ سب سے بڑھ کر عظیم، رحمٰن و رحیم اور کریم ہے۔ ہمارا خالق اور محسن ہے۔ میں اُس کی بندگی صرف اِس لیے کروں گا کہ وہ میرا رب ہے۔ میں اِس بندگی کا عوض اُس سے نہیں مانگتا۔ ایسی بندگی بہت افضل ہے۔ فقیر رب کے عشق میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو ہر وقت اُسے پکارتے رہتے ہیں، اُس کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ میرے علم میں نہیں کہ وہ کبھی کسی غرض کے تحت رب کو پکارتے ہوں۔ وہ تو اُسے صرف اس لیے پکارتے ہیں کہ وہ رب ہے اس لیے اُسے پکارا جائے۔ اُس کی بندگی اور اِطاعت کی جائے کیونکہ صرف وہی لائق بندگی و اِطاعت ہے۔

سوال: کیا غیر سید مسلمان کے لیے بھی رُوحانی سفر میں ترقی ممکن ہے یا اُنھیں محض ایک خاص حد تک ہی علم عطا ہوتا ہے؟

جواب: کسی بھی مسلمان کو دوسرے مسلمان پر سوائے تقویٰ کے کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ جو تقویٰ میں بلند ہے وہ ضرور دوسرے مسلمانوں میں افضل ہے۔ سید اور غیر سید کا اِس سے کوئی تعلق نہیں۔ حضرت شاہ عنایت قادری رحمۃ اللہ علیہ ، حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ غیر سید تھے لیکن اللہ نے اُنھیں بہت عطا کیا۔

اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ بہت سے اولیاء اللہ کا تعلق سید گھرانوں سے رہا۔ اُنھیں Edge مل گیا کہ اُن کے آباؤ اجداد نے جو محنت و ریاضت کی اُس کے اثرات اُن کی آنے والی نسلوں میں آ گئے جنھوں نے پھر تھوڑی سی محنت بھی اُس راہ میں کی تو اُن کی روحانی ترقی کی رفتار زیادہ تیز ہو گئی۔

سوال: تلاوتِ کلامِ پاک کے وقت کیا نیت اور مقصد پیشِ نظر ہونا چاہیے؟

جواب: ہماری بندگی اور اِطاعت کے جواب میں رب ہمیں وہی عطا فرماتا ہے جو ہماری نیت ہوتی ہے۔ اگر کوئی میری طرح ریاکار ہے اور خلقِ خدا میں عزت پانے کے لیے عبادت کرتا ہے تو رب اُسے دُنیا میں عزت عطا کر دیتا ہے لیکن اس عبادت کے دیگر انعامات سلب ہو جاتے ہیں۔

اہلِ فقر کے پیشِ نظر صرف یہ مقصد ہوتا ہے کہ رب راضی ہو جائے، رب کا دیدار ہو جائے، رب سے ملاقات ہو جائے۔ اِس لیے اُن کی ہر عبادت (تلاوتِ کلامِ پاک سمیت) کا Objective بھی یہی ہوتا ہے کہ اُنھیں رب مل جائے۔ اس لیے اُنھیں یہی حاصل ہوتا ہے۔

تلاوتِ کلامِ پاک کے دُنیاوی اور رُوحانی دونوں فوائد میں نے اسی لیے بتائے کہ شاید ہم میں سے کسی ایک آدھ آدمی کے دل کو یہ بات بھا جائے کہ وہ دُنیاوی فوائد کو نظر انداز کر کے رُوحانی فوائد کو ترجیح دے۔ ہر انسان کے لیے دونوں طرح کے فوائد Available ہیں۔ جیسی نیت ہو گی ویسا فائدہ اور اجر مل جائے گا۔

سوال: کائنات چھ دن اور چھ راتوں میں بنائی گئی۔ اللہ کے ''کُن'' کہنے سے کام ہو جاتا ہے پھر چھ دن کیوں؟

جواب: آپ آفس میں باس کے پاس جا کر کہتے ہیں میری ترقی کر دیں۔ باس کہتا ہے ٹھیک ہے آپ کی ترقی ہو گئی۔ آپ کو لیٹر ایشو کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد آپ کی ترقی کا عمل شروع ہو جائے گا۔ لیٹر لکھا جائے گا، اِسے Darft ہونا اور ہر سطح پر چیک ہونا ہے۔ اس کے بعد آپ کا باس اُس پر Sign کرے گا، اس لیٹر کی کاپیاں مختلف جگہ پر بھیجی جائیں گی، فائلز میں لگیں گی۔ اس عمل سے پہلے بجٹ چیک ہو گا کہ اس میں آپ کی پوسٹ کی گنجائش ہے یا نہیں۔ آپ کی Salary کے لیے Provision ہے یا نہیں۔

یہ سارا عمل بتدریج ہوتا رہا لیکن آپ کی ترقی اُس لمحے ہی ہو گئی جب باس نے کہا کہ ترقی ہو جائے گی۔ جب رب کسی کام کا حکم جاری کر دیتا ہے ''ہو جا'' تو وہ کام ہو جاتا ہے۔ یہ کائنات اُسی رب کی بنائی ہوئی ہے۔ اِس کائنات کا ایک توازن اور اُصول ہے جو بدلتا نہیں۔ ہر شے کو ایک Process (مرحلے) میں سے گزرنا ہے۔ اِسے نارمل حالات میں ہم Gestation period کہتے ہیں۔ ہر شے کا ایک Gestation period ہے۔ رب نے ''کُــــن'' کہا اور کام ہو گیا۔ پھر اس کا عمل جاری ہو گیا۔ یہاں عالم اور جہان Create ہوتے ہیں، سیاروں نے اپنے Orbit میں گردش میں رہنا ہے، اِس سب کے ہونے میں وہ وقت لگتا ہے جو ہر شے کا Gestation period ہے۔ جب کوئی بھی کام تدریج میں ہو رہا ہوتا ہے تو اُس تدریج میں بھی حکمت ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ ہر مرحلے پر بہت کچھ سکھا اور اپنی قدرت کی نشانیاں دکھا رہا ہوتا ہے۔

ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم دُعا کرنے کے فوراً بعد اُس کا نتیجہ دیکھنے کو بے تاب ہو جاتے ہیں۔ میں پرائم منسٹر بننے کی دُعا کرتا ہوں اور پھر جانماز سے اُٹھتے ہی باہر جھانک کر دیکھتا ہوں کہ پروٹوکول کی گاڑیاں کھڑی ہیں یا نہیں اور میرا گھر پرائم منسٹر ہاؤس میں تبدیل ہوا یا نہیں۔ جب کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی تو میں مایوس ہو جاتا ہوں حالاں کہ اِس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ دُعا قبول نہیں ہوئی۔ دعا قبول ہو چکی ہوتی ہے اور اُس کی تکمیل کے انتظامات شروع ہو جاتے ہیں۔

اللہ حکم تو فوراً جاری کر دیتا ہے لیکن اپنے بنائے اُصولوں کو نہیں توڑتا۔ ہر شے ایک Process اور Procedure سے گزرتی ہے۔ کام ہونا اور ہے، اُس کا Materialise ہونا اور ہے۔ Materialise ہونے میں ہی چھ دن لگے تھے۔

سوال: (الف) کیا فقر کے لیے غربت ضروری ہے؟

(ب) نفس امارہ کے تحت کی جانے والی بیعت اور پُر اخلاص بیعت میں کیا فرق ہے؟

جواب: (الف) فقر کے لیے غربت ضروری نہیں۔ عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ جب اہلِ فقر رب کی طرف جاتے ہیں تو اللہ کی خاص رحمت اُن پر ہوتی ہے۔ اللہ اُن کے دل سے دُنیاوی مال و دولت کی محبت اور قدر ختم کردیتا ہے اِس لیے وہ اِس کی پروا نہیں کرتے اور جس شے کی انسان پروا نہیں کرتا وہ اُس کے پاس رہتی نہیں۔ اس لیے بہت سے بادشاہ بھی جب فقر کی راہ پر آئے تو غربت میں چلے گئے۔

(ب) بیعت کے بارے میں صرف اِتنا عرض کردوں کہ مرشد کا ادب و احترام بائیولوجیکل فادر (Biological father) کے ادب و احترام سے اِس لیے زیادہ ہے کیونکہ بائیولوجیکل فادر ہماری Choice پر ہمارا فادر نہیں جب کہ مرشد ہماری Choice ہیں۔ جو شے By choice لی جائے وہ ہماری ذمہ داری ہے۔ ہم بیعت کے وقت محتاط رہیں۔ دو چار منٹ کی ملاقات میں متاثر ہو کر بیعت کرلی جائے تو پھر عموماً ہمیں یہی پوچھنا پڑتا ہے کہ نفس امارہ کے تحت کی گئی بیعت اور پُر اخلاص بیعت میں کیا فرق ہے۔ بیعت کا فیصلہ کرتے وقت ہم بہت محتاط رہیں تاکہ آنے والے وقت میں ہمیں پچھتانا نہ پڑے۔ آپ جن کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہتے ہیں، اُنھیں پرکھیے پھر بیعت کیجیے۔ انشاءاللہ پچھتاوا نہیں ہوگا۔

نشست نمبر 25

سورۂ محمد ﷺ اور مشاہدۂ اسرار

سورۂ محمد ﷺ مدنی سورہ ہے۔ اس میں چار رکوع اور 38 آیات ہیں۔ اس کی دوسری آیت میں آپ ﷺ کا ذکر ہے اِسی نسبت سے اِسے سورۂ محمد ﷺ کہا جاتا ہے۔ آیت نمبر 20 میں قتال کے ذکر کی وجہ سے یہ سورۂ قتال بھی کہلاتی ہے۔

''جب مکہ کی سرزمین کفار کے ظلم و ستم کے باعث اہل اسلام کے لیے تنگ ہوگئی تو وہ اپنی دولت ایمان کو اُن کی دست بُرد سے بچانے کے لیے اپنے گھر بار، زمینیں اور کاروبار سب چھوڑ چھاڑ کر مدینہ طیبہ پہنچ گئے۔ سب کچھ اُن سے چھن گیا تھا، لیکن وہ خوش تھے کہ دامنِ مصطفیٰ ﷺ تو اُن کے ہاتھوں سے نہیں چھوٹا۔ اُن کا خیال تھا کہ اب وہ یہاں پوری دل جمعی کے ساتھ اپنے رب کے ذکر اور اُس کی عبادت میں اپنے شب و روز بسر کریں گے۔ دعوت دین کا جو کام مکہ میں پوری طرح نہیں ہوسکا، یثرب کے پُرامن ماحول میں بآسانی تکمیل پذیر ہوگا، لیکن اہل مکہ نے اُنھیں یہاں بھی آرام کا سانس نہ لینے دیا۔ اُن کی مختلف ٹولیاں آتیں، مدینہ کے گردونواح میں لوٹ مار مچاتیں، اُونٹ، بھیڑ بکریاں ہانک کر لے جاتیں۔ اکادکا مسلمان ہتھے چڑھ جاتا، تو اُس کو بھی قتل کرنے میں گریز نہ کرتے۔ اب مزید صبر خودکشی کے مترادف تھا لیکن وہ تو اللہ تعالیٰ کے بندے اور اُس کے رسول ﷺ کے حکم کے پابند تھے۔ ازخود تو کچھ نہیں کرسکتے تھے چنانچہ سورہ الحج کی آیت 39 میں کفار سے جنگ کرنے کی اجازت مرحمت ہوئی۔

اِس سورۃ میں اہل ایمان کو صاف لفظوں میں بتا دیا گیا کہ اگر تم نے سچے دل سے اپنی پوری قوت اور توانائیوں کو بروئے کار لاتے ہوئے دین اسلام کی مدد کی، تو کفر کے تند و تیز ریلے کے سامنے اللہ تعالیٰ تمھیں تنہا نہیں چھوڑے گا، بلکہ اُس کی نصرت تمھاری پشت پناہی کرے گی۔'' (ضیاء القرآن، جلد چہارم)

غیر مسلم، مسلمانوں کے جذبۂ جہاد پر اعتراض کرتے رہتے ہیں۔ میں غیر ملکیوں سے بھی یہی عرض کیا کرتا ہوں کہ جہاد Aggression نہیں بلکہ جہاد امن کی ترغیب دلاتا ہے۔ زمانۂ امن میں جو شخص موم کی طرح نرم دکھائی دیتا ہے، اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں دیتا، مسکرا کر ہر بات برداشت کرلیتا ہے۔ میدان جنگ میں وہی مسلمان فولاد سے سخت ثابت ہوتا ہے۔ وہ دشمن پر بھرپور وار کرتا ہے حتیٰ کہ دشمن کے لیے جان بچانا مشکل ہوجاتا ہے یوں امن قائم رہتا ہے۔

جذبۂ جہاد کے ساتھ ساتھ مسلمان پر جہاد کے ضمن میں جو پابندیاں اسلام عائد کرتا ہے وہ بھی غیر مسلموں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہیں مثلاً ظلم کے خلاف جہاد کرتے ہوئے اللہ کے نام پر تلوار اُٹھاتے ہوئے مسلمان پر بہت سی پابندیاں ہیں۔ اُسے دیگر مذاہب کی طرح ''جو چاہو کر گزرو'' کا لائسنس نہیں ملتا۔ مسلمان کسی بوڑھے، عورت یا بچے پر تلوار بے نیام نہیں کرسکتا۔ مسلمان ہر اُس شخص کو پناہ دے گا جو اپنے گھر میں پناہ لے لے گا۔ اُسے گھروں کو مسمار کرنے اور درختوں کو کاٹنے کی اجازت نہیں۔ جو شخص ہتھیار پھینک دے اُس پر حملہ کرنے کی اجازت نہیں۔ جہاد کے دوران مسلمانوں کو یہ تمام شرائط پوری کرنا ہوتی ہیں جس پر غیر مسلموں کو حیرت ہوتی ہے۔

سورۂ محمد ﷺ کی فضیلت کا ایک اور رُخ بھی ہے۔ ہم میں سے بھی لوگ اسرارِ الٰہی کے مشاہدے اور سیر کے لیے بے حد مشتاق رہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ بغیر کسی محنت و تردد کے کوئی Shortcut اپنا کر وہ مقام حاصل کرلیں کہ جہاں اسرارِ الٰہی کا مشاہدہ ہو سکے۔

آج جب میں اِدھر آرہا تھا تو ذہن میں خیال آیا کہ اسرارِ الٰہی کا مشاہدہ کرنے کے Level تک پہنچنے کا Shortest route آپ کو بتادوں۔

بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار اپنے مریدین کے درمیان بیٹھے ہوئے فرمایا تھا:

''اگر کوئی شخص سورۂ محمد ﷺ کو ایک ہی Sitting (نشست) میں 41 بار پڑھ لے تو اُس پر اسرارِ الٰہی کا اظہار ہونے لگتا ہے۔''

لیکن یاد رہے کہ اسرارِ الٰہی کے مشاہدے کے لیے 41 بار سورۂ محمد ﷺ ایک ہی Sitting میں پڑھنے سے پہلے مجھے چند Prerequisites پوری کرنا ہوں گی۔ میں اپنے دل کو آلائشوں سے پاک کرلوں، غصہ، غیبت، حرام لقمہ، فریب، جھوٹ، حسد، بُغض، کینہ سے دل کو پاک کرلوں۔ اِن آلائشوں کو دل سے نکالنے کا آسان طریقہ جو میں نے Experience کیا وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مجھے بُرا بھلا کہہ دے، میری ذات پر تہمتیں لگائے سازشیں کرے، پراپیگنڈا کرے تو بجائے اُسے بُرا سمجھنے اور کینے کے اگر میں دل کو سمجھالوں کہ وہ بھی انسان ہے۔ ہر انسان کی طرح اُس سے بھی کوتاہی ہوگئی۔ میں بھی تو صبح سے شام تک ایسی کتنی کوتاہیاں اور غلطیاں کرتا ہوں اس لیے اُسے معاف کردوں۔ اگر معاف کرنے کے بعد بھی اُس کے خلاف دل میں کوئی خیال اُبھرے تو میں لاحول ولاقوۃ الا باللہ پڑھوں اور خود کو سمجھاؤں کہ جب کسی کو معاف کردیا جائے تو پھر اُس کے بارے میں کوئی وسوسہ یا پچھتاوا نہیں رکھنا چاہیے۔

سورۂ محمد ﷺ ایک ہی نشست میں 41 بار پڑھنے سے پہلے مجھے ایک اور Prerequisite پوری کرنا ہوگی یعنی میری ''انا'' ختم ہو جائے جو عموماً ہوتی نہیں ہے۔ اس کے لیے Herculean effort کی ضرورت ہوتی ہے، پہاڑ جیسی کوشش کرنا پڑتی ہے۔ جناب داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا بڑا کارگر اور آسان طریقہ بتایا ہے۔ اگر ممکن ہو تو میں داتا صاحب کا وہ فرمان ہمہ وقت یاد رکھوں:

''فقیر پر لازم ہے کہ وہ دوسرں کی خدمت اس طرح کرے کہ اُس سے خدمت لینے والے یہ سمجھیں کہ وہ یہ خدمت لے کر فقیر پر احسان کررہے ہیں۔''

میرے تجربے میں یہ آیا کہ انا کچلنے کا یہ بہترین طریقہ ہے۔ ہم لوگ کسی عزیز، رشتہ دار کے انتقال پر دیکھتے ہیں کہ مرحوم کے بڑے صاحب زادے کو لوگ سمجھا رہے ہوتے ہیں کہ بیٹا تمھارے والد دُنیا سے جاچکے اب والدہ اور بہن بھائیوں کا خیال رکھنا تمھارا فرض ہے۔

ہم ایک روٹین کے طور پر یہ نصیحت کررہے ہوتے ہیں اور اس کے پیچھے عموماً کوئی جذبہ نہیں ہوتا۔ آپ کو شاید ہی کوئی ایسا شخص ملے جو یہ کہہ رہا ہو ''بیٹا! تمھارے والد صاحب تو دُنیا سے چلے گئے اب تمھیں اس گاڑی کو کھینچنا ہے۔ ایسے میں ایک بڑا مشکل مقام آئے گا۔ تمھارے بہن بھائی تمھاری جان توڑ محنت اور دیانت دارانہ سپورٹ کے باوجود تمھیں بُرا بھلا کہیں گے۔ تب شیطان تمھیں اُکسائے گا کہ دیکھو یہ تم سے کھاتے بھی ہیں اور تم پر غراتے بھی ہیں۔ اُس وقت تم لاحول پڑھنا اور خود کو سمجھانا کہ یہ مجھ سے نہیں کھاتے۔ میں ان کے لیے کچھ نہیں کررہا۔ فقط اپنا ایک فرض ادا کررہا ہوں۔ جب میں ان کے لیے کچھ کر ہی نہیں رہا تو پھر یہ جیسے مرضی مجھ پر غرائیں۔ یہ احساس تمھیں اطمینان عطا کرے گا اور تم اپنی ذمہ داریاں ڈسچارج کرنے میں کبھی کوئی کوتاہی نہیں کروگے......'' یہ نصیحت اُس نوجوان کے بہت کام آئے گی۔

اِسی طرح فقر میں جب انسان کو انا بہت تنگ کرے تو وہ خود کو سمجھالے کہ میں جو کچھ کسی کے لیے کررہا ہوں درحقیقت یہ خدمت لے کر وہ مجھ پر احسان کررہے ہیں کیونکہ یہ اُن کا حق تھا جو مجھ پر Due تھا۔ یہ بھلے لوگ ہیں کہ مجھ سے اپنی خدمت کرا کے مجھے اِس فرض کی ادائیگی کی جواب دہی سے بچالیا۔

خدمت کرانے والوں کے لیے احسان مندی کا یہ جذبہ انسان کو کبھی تنگ نہیں ہونے دیتا اور یوں انسان ہنسی خوشی دوسرں کی خدمت کیے چلا جاتا ہے۔ جب کبھی میرے اندر نیکی کی رمق باقی تھی اور فقیروں سے ملاقات ہوتی تھی تو میں حیران ہوتا تھا کہ جینوئن فقیر سے جب ہم پوچھتے ''فلاں فقیر کیسا آدمی ہے؟'' تو وہ مسکرا کر جواب دیتا ''وہ بہت بھلا آدمی اور اچھا انسان ہے۔'' ہم پوچھتے ''وہ کس مقام پر ہے؟'' تو جواب آتا ''میاں صاحبزادے! میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ وہ جس مقام پر بھی ہے، مجھ سے بہت بلند ہے۔'' میں نے کبھی کسی جینوئن فقیر کو یہ کہتے نہیں سنا کہ وہ تو بے کار شخص ہے۔

میں جینوئن فقیر ڈھونڈنے کے لیے یہ کلیہ استعمال کرتا اور اُس سے جا کر پوچھتا ''فلاں شخص جو ڈھونگ رچائے بیٹھا ہے، وہ کیسا انسان ہے؟'' تو جواب ملتا ''وہ تو بہت اچھا انسان ہے۔ مجھ سے کہیں بہتر ہے۔ اُس کے مقام کے بارے میں اِس لیے نہیں بتا سکتا کیونکہ میں نے فقر کا سفر ابھی شروع نہیں کیا۔'' تب مجھے سمجھ آنے لگی کہ جب فقیر ایسی بات کرتے ہیں تو اصل میں اپنی کھال بچا رہے ہوتے ہیں اور خوب صورتی سے آپ کو جُل دے رہے ہوتے ہیں۔ جینوئن فقیر کبھی اپنے مقام کے بارے میں نہیں بتاتا، دوسروں کا بھید بھی نہیں کھولتا۔ وہ Vouch کر نہیں سکتا کہ کہیں خلقِ خدا دھوکے میں نہ آجائے۔ غیبت کر نہیں سکتا اور نہ ہی کسی کی اصلیت بیان

کرسکتا ہے کیونکہ نہ جانے اُس شخص نے اپنی اور اپنے مقام کی Projection کس انداز میں کی ہے۔ اصلیت ظاہر ہو جانے سے کہیں اُس کی عزت پر حرف نہ آجائے اور فقیر کی اپنی پکڑ نہ ہو جائے۔

بات انا کو کچلنے کی ہو رہی تھی۔ انا کچلنے کا آسان حل میں نے آپ کو بتا دیا۔ جب انسان دونوں Prerequisites کو پورا کرلے یعنی:

1۔ اپنے دل کو آلائشوں سے پاک کرلے تو دل ڈھل کر پاک صاف ہو جائے گا۔ یہ پاک صاف دل اب رب تعالیٰ کے قیام کے لیے تیار ہے۔

2۔ انا کو مار لے۔

اِن دونوں Prerequisites کو پورا کرنے کے بعد اگر وہ ایک ہی Sitting میں 41 بار سورۂ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پڑھ لے تو اُس پر اسرارِ الٰہی کا اظہار ہونے لگے گا۔ پھر انسان وقتاً فوقتاً اِس کو Repeat کرتا رہے تاکہ وقت کے ساتھ ساتھ اُس کی قوت کم نہ ہو۔ یوں اسرارِ الٰہی کے مشاہدے کا ہمارا شوق پورا ہو جائے گا۔

یہ میں آپ لوگوں کو بتا رہا ہوں ورنہ میں نے آج تک یہ سورہ اس انداز میں نہیں پڑھی اس لیے بابا فرید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے آپ کو بتا دی۔ میں اس لیے آج تک اُسے نہ پڑھ پایا کیونکہ میرے دل سے آلائشیں دور نہیں ہو پائیں۔ انا سے بھرا ہوا ہوں اِس لیے اسے پڑھنے سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

آج کل دعا کے سیشن میں کچھ لوگ اپنے Dependents کو لے کر آتے ہیں جو مرگی یا جنون کے مریض ہوتے ہیں۔ آپ کو پیر بننے کا آسان نسخہ بتاتا ہوں۔ دو رکعت نفل نماز پڑھ کر سلام پھیریں۔ 21 بار درودِ ابراہیمی پڑھنے کے بعد 70 بار سورۃ النحل پڑھیں اور آخر میں دوبارہ 21 بار درودِ ابراہیمی پڑھ کر مریض کو دم کریں اور پانی پر دم کر کے بھی اُسے پلائیں۔ رب اپنی رحمت کے صدقے اُس مریض کو صحت دے دے گا۔

فقیروں پر ایک اعتراض یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ بہت سی ایسی باتیں کہہ دیتے ہیں جن کو ظاہر کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ فوج میں جائے اور اُس کا عہدہ لیے بغیر ہمیں یہ پتا ہی نہیں ہو سکتا کہ کن اُمور کو Closely guarded سیکرٹ رکھنے کا حکم ہے اور کن باتوں کو Disclose کرنے کی اجازت ہے، کن باتوں کو ایک خاص عہدے کے لوگوں تک Pass on کرنے کی اجازت ہے اور کن چیزوں کو Inner circle میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ہمیں فقیروں پر اُنگلی اُٹھانے کی عادت ہے کہ اُس نے تو وہ بات بتا دی جو بتانے والی تھی ہی نہیں۔ فقیر چونکہ دوسروں کا بھرم اور عزت قائم رکھتے ہیں اس لیے کوئی فقیر کبھی یہ نہیں کہتا کہ ''میاں! تمھیں فقر کی زندگی کا کیا پتا کہ کس شے کو بتانے کی اجازت ہے اور کس کو چھپانے کا حکم۔''

حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ اس نکتے کو بہت خوب صورت انداز میں بیان کرتے ہیں کہ ایک بار وہ (حضرت بابا فرید صاحب رحمۃ اللہ علیہ) حضرت بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ (جو اپنے زمانے کے غوث تھے) کے پاس تشریف لے گئے اور اپنی ایسی واردات بیان کر دی جو غوثِ وقت کے خیال میں کسی کے سامنے ظاہر نہیں کی جا سکتی تھی۔ حضرت بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے وہ واردات سنتے ہی فرمایا کہ ''یہ بات تو ظاہر کرنے کا حکم نہیں

پھر آپ نے بھری محفل میں یہ کیوں بیان فرمائی؟'' بابا فرید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا ''جب اندر پوری طرح بھر جائے اور وہاں مزید کوئی چیز رکھنے کی گنجائش نہ رہے تو وہ باہر کو چھلک جائے گی۔''

فقیر جب ایسی بات جو صرف خواص پر ظاہر کرنے والی ہو، عوام پر ظاہر کرنے لگیں تو یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جب اُن کے اندر مزید کسی شے کے سمانے کی جگہ نہ رہے جیسے خالی گلاس میں پانی ڈالتے رہیں تو وہ بھرتا رہتا ہے حتیٰ کہ بھرے ہوئے گلاس میں ایک قطرہ بھی ڈال دیا جائے تو وہ Spill over ہو جاتا ہے۔ فقیر کے بھی Spill overs ہوتے ہیں کہ وہ چھلکنے لگتے ہیں۔ فقیر کی زندگی میں بھی کبھی وہ لمحہ آجاتا ہے کہ وہ علم سے Spill over ہو جاتا ہے اور اُس کے اندر کوئی جگہ نہیں بچتی اور یوں اُس کے اندر کا علم چھلک کر دوسروں تک پہنچ جاتا ہے۔ لیکن یہ مقام بڑی مشکل سے آتا ہے۔ بابا فرید گنج شکر صاحب رحمۃ اللہ علیہ جنھوں نے یہ بات اپنے وقت کے غوث بہاؤالدین زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے فرمائی، اُن کی پرواز بھی تو دیکھیے کہ سدرۃ المنتہیٰ تک ہے۔

سوال: فنا کیا ہے؟ میں میں نہ رہوں، تُو ہو جاؤں؟

جواب: فنا کی مختلف اقسام ہیں۔

1۔ فنافی اللہ

2۔ فنافی الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

3۔ فنافی الشیخ

فنافی اللہ یہ ہے کہ بندہ اللہ کی محبت میں یوں گم ہو جائے کہ دوئی ختم ہو کر یک جائی میں بدل جائے۔ لیکن یہ بہت اُوپر کا مقام ہے۔ Upper storey پر اگر میں زینہ بہ زینہ جانے کے بجائے جست لگا کر پہنچنا چاہوں گا تو گر کر جسمانی نقصان کا شکار ہو جاؤں گا۔

فنافی اللہ تو آخری مقام ہے۔ اِس سے پہلے ایک بڑا خوب صورت مقام ہے فنافی الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ اس سے پہلے ''فنافی الشیخ'' کا مقام ہے۔ جہاں انسان اپنی عقل، Logic، خواہشات، ارادے اور مرضی کو اپنے اندر سے نکال کر ایک لاکر میں Lock کر دیتا ہے اور صرف ایک ہی بات جانتا ہے کہ جو مرشد نے کہا وہی کرنا اور سوچنا ہے، اِس کے سوا کچھ کرنا ہے نہ سوچنا۔ اگر مرشد کامل اور جینوئن ہے تو وہ اپنے شاگرد کو وہی احکامات دے گا جو احکامِ الٰہی اور حیاتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تفسیر ہوں گے۔ مرشد اُنگلی پکڑ کر آپ کو اپنی راہوں پر چلائے گا۔

جب انسان جیتا بھی مرشد کے لیے اور مرتا بھی مرشد کے لیے ہے تو یہ 'فنافی الشیخ' کا مقام ہے۔ انسان 'فنافی الشیخ' سے آغاز کرے۔ وہاں سے وہ 'فنافی الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم' تک پہنچے گا اور پھر وہاں سے 'فنافی اللہ' کا مقام شروع ہو جائے گا۔

جب انسان اپنی تمام خواہشات، ارادے، مرضی، سوچ، خیالات اور عمل آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے مطابق ڈھال لیتا ہے تو یہ فنافی الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ اس کے بعد فنافی اللہ کا مقام شروع ہوتا ہے۔

رُوحانیت میں فنائی اللہ کی ایک اور قسم بھی ہے کہ انسان اپنی زندگی اِس طرح گزارتا ہے کہ دنیا میں زندہ رہنے کے لیے زندگی نہیں گزارتا بلکہ آخرت میں زندہ رہنے کے لیے زندگی بسر کرتا ہے۔ اُسے دنیا یاد ہی نہیں ہوتی۔ اُس کے دماغ میں دُنیا کے بارے میں کوئی سوچ نہیں ہے۔ وہ تو صرف یہ سوچ کر یہ زندگی گزارتا ہے کہ میں آخرت کی زندگی اچھی کرلوں۔

جب انسان کو ہر لمحہ موت اور یومِ حساب یاد رہے اور وہ اِس احساس کے تحت زندگی گزارے تو یہ بھی فنا ہے۔

سوال: کیا معاملات کی دُرستی کو ولایت کہتے ہیں؟

جواب: جی ہاں۔ معاملات کی دُرستی کو ولایت کہتے ہیں۔ جب انسان اپنے معاملات اِس حد تک درست کر لے کہ اُس میں کوئی کجی نہ رہے اور مرشد یہ سمجھے کہ مرید اِصلاح ے اِس مقام پر آگیا ہے کہ جہاں وہ اپنی اِصلاح کرنے کے بعد دوسروں کی اِصلاح کرسکتا ہے تو یہ مقامِ ولایت ہے۔

سوال: تجدید کسے کہتے ہیں؟

جواب: اگر یہ میز ایک ہی جگہ زیادہ دیر پڑی رہے تو اِس پر گردوغبار کی تہیں جم جائیں گی۔ اِس کی اصل رنگت اور شکل دکھائی نہیں دے گی۔ اگر کوئی شخص ہمت کر کے اِس میز پر جمی گرد صاف کردے تو یہ اپنی اصلی حالت میں آکر دوبارہ چمکنے دمکنے لگے گی...... یہ تجدید ہے۔

اسلام میں تجدید کا عمل جاری رہتا ہے۔ ہر صدی کے آخر میں مجدد اور ہر Millennium کے آخر میں مجدد کامل آتا ہے۔ اسلام کے ہزار سال مکمل ہونے کے بعد حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے۔ اِدھر دینِ اکبری کے فتنہ نے زور پکڑا، اُدھر مجدد کامل تشریف لے آئے۔ مجدد یا مجددِ کامل اسلام کا نام بدلتا ہے نہ اُس کا ٹائٹل اور نہ ہی ٹائٹل کا ڈیزائن۔ وہ تو صرف وقت کے ساتھ ساتھ اس میں در آنے والی غیر اسلامی رُسوم اور تبدیلیوں کو نکال کر اِسے اصل حالت میں دوبارہ پیش کردیتا ہے۔

نشست نمبر 26

کلامِ الٰہی

قرآن پاک کی 29 سورتیں حروفِ مقطعات سے شروع ہوتی ہیں۔ سورۂ قٓ بھی ان میں سے ایک ہے۔ سورۂ قٓ کے تین رکوع اور 45 آیات ہیں۔ علما کا اِس بات پر اتفاق ہے کہ یہ سورہ آپ ﷺ کی مکی زندگی کے تقریباً وسط میں نازل ہوئی۔ اگر چہ اِس کے نزول کے بالکل صحیح زمانے کا تعین نہیں ہوسکا لیکن سورۃ کے مضامین کے پیشِ نظر یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ یہ آپ ﷺ کے اعلانِ نبوت کے تیسرے یا چوتھے سال میں نازل ہوئی۔

حرفِ مقطعات ''قٓ'' کے بارے میں علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ ''قٓ'' کنجی ہے رب تعالیٰ کے اُن ناموں کی جو 'قٓ' سے شروع ہوتے ہیں جیسے ''القابض''، ''القہار'' اور ''القادر'' وغیرہ۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''قٓ'' کا علم اللہ اور رسول ﷺ کے درمیان ہی ہے یا علم کے ایک خاص مقام پر پہنچے والے چند صاحبانِ علم اِس کا راز جانتے ہیں۔''

ابن کثیر نے فرمایا کہ جتنی بھی ایسی روایات ہیں وہ مخالفین اسلام نے پھیلائی تھیں تاکہ اسلام کے بارے میں Confusions پیدا کردی جائیں۔

اِس سورہ میں کفار کو متنبہ کیا گیا ہے کہ انسان کے مرنے کے بعد اللہ اُسے دوبارہ پیدا کرے گا اور اُس کا حساب کتاب ہوگا۔

عجیب بات ہے کہ کفار یہ بات ماننے کو تیار نہ تھے کہ انسان مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوسکتا ہے اور اس سے حساب کتاب لیا جاسکتا ہے۔ اُن کا کہنا تھا کہ انسان جب موت کے بعد مٹی میں مل گیا، اُس کا جسم کیڑے مکوڑے کھا جائیں گے، اُس کی ہڈیاں راکھ بن کر مٹی میں مل جائیں گی اور وہ مٹی ہوا کے زور سے کہیں سے کہیں چلی جائے گی تو جو چیز اتنی باریک ہوکر مٹی میں مل گئی وہ دوبارہ کیسے زندہ ہوگی۔ (معاذ اللہ)

عجیب بات یہ بھی ہے کہ کفار تب بھی انسانی زندگی کی Reincarnation (دوسرے، تیسرے، چوتھے جنم) پر یقین رکھتے تھے۔ اُسی زمانہ میں کفار نے اپنی آنکھوں سے رب کی قدرت کا مظاہرہ دیکھا تھا جب ابرہہ نے خانہ کعبہ پر حملہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس طریقے سے اُس کے ارادے کو ناکام کیا اور ابابیل جیسے چھوٹے

پرندوں کی چونچوں میں دبی کنکریوں نے ابرہہ کے لشکر کو Pulverise کر کے رکھ دیا۔ یہ سب کفار کے لیے حیران کن تھا لیکن اپنی آنکھوں سے یہ سب دیکھنے کے باوجود کفار حیات بعد الموت پر یقین نہیں لاتے تھے۔

سورۂ ق کی تلاوت اگر سلیقے اور آداب کے ساتھ کی جائے تو علم میں اضافے کی صورت تلاوت کے اثرات ملتے ہیں۔ یہ علم انسان کو رب تعالیٰ کے قریب لے جاتا ہے اور پروردگار ایسے انسان کو عجائباتِ قدرت اور اسرار الٰہی کی سیر کرانے لگتا ہے۔

سورۂ ق کے سریع الاثر ہونے کا وقت نمازِ فجر سے پہلے کا ہے۔ اگر تہجد کے بعد انسان اوّل آخر درود پاک کے ساتھ سورۂ ق تین بار تلاوت کرے تو اُس کے علم میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔

سوال: کیا الفاظ کے بھی اثرات ہوتے ہیں؟

جواب: سارا کھیل لفظوں کا ہے۔ لفظ حروف سے بنتے ہیں۔ کچھ باتیں دل میں اُتر جاتی ہیں۔ کچھ باتیں ہم ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتے ہیں۔ کچھ لوگوں کی باتیں دل میں گھر کر جاتی ہیں اور کچھ باتوں سے دل اُکتا جاتا ہے۔

الفاظ نثر میں پڑھے جائیں، نظم یا ترنم کی صورت ادا کیے جائیں یا تحت اللفظ کی شکل میں سماعتوں میں اُتریں، ان سب الفاظ کے اثرات مختلف انداز میں مرتب ہوں گے۔

سوال: ہوائی چیزوں کی وجہ سے کچھ اوقات میں باہر نکلنے سے منع کیا جاتا ہے۔ ایسا کیوں؟

جواب: آپ ﷺ نے بہت واضح انداز میں اس کی وجہ بیان فرمائی ہے

...... جب غروب آفتاب قریب ہو جائے تو اپنے بچوں کو باہر نکلنے سے روکو کیونکہ اس وقت شیاطین پھیل جاتے ہیں۔ جب رات کا کچھ حصہ گزر جائے تو باہر جانے دیا جائے۔ (صحیح بخاری کتاب بدء الاخلاق۔ حدیث 3280)

...... غروب آفتاب کے وقت چوپایوں اور بچوں کو باہر نہ بھیجو کیونکہ غروب آفتاب کے وقت شیاطین پھیل جاتے ہیں۔ جب رات کا کچھ حصہ گزر جائے تو باہر جانے دو۔ (صحیح مسلم کتاب الاشربۃ۔ حدیث 3764)

اگر آپ نے یہ سوال اس تناظر میں پوچھا ہے کہ ہمارے گھروں میں یہ کہا جاتا ہے کہ رات کے وقت پودوں کے قریب مت جاؤ، جن بھوت چمٹ جاتے ہیں یا دھوپ کے وقت کھلے بالوں کے ساتھ چھت پر نہیں جانا چاہیے کہ جن چمٹ جاتے ہیں۔ اسی طرح غروب آفتاب کے بعد پھول توڑنے سے منع کیا جاتا ہے۔ اس کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔ بلکہ ہمارے بزرگوں نے ہمیں مختلف بیماریوں سے بچانے کے لیے ڈرا اور خوف کی یہ سب کہانیاں بیان کی ہیں۔ اس لیے کہ غروب آفتاب کے بعد درخت کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس خارج کرتے ہیں اور درختوں کے نیچے سونے سے انسان کے جسم میں آکسیجن کی کمی واقع ہوتی ہے۔ دوپہر کے وقت کھلے بالوں چھت پر جانے سے Heatstroke ہو سکتا ہے کہ کالا رنگ Heat کو Absorb کرتا ہے۔

سوال: باقاعدگی سے قرآن پاک کے دو تین رُکوع ترتیب سے ہر روز پڑھنے کے فوائد زیادہ ہوں گے یا کسی وظیفہ کے پڑھنے کے؟

جواب: قرآن پاک کی تلاوت کی فضیلت بے پناہ ہے۔ بدقسمتی سے ہم تصوف کے بارے میں غیر ذمہ دارانہ کتابیں پڑھ کر اور گفتگو سن کر وظائف کو اہم سمجھنے لگے ہیں۔ ہمیں یہ جان لینا چاہیے کہ جتنے بھی وظائف ہم پڑھتے ہیں سبھی قرآن پاک سے Derived ہیں۔ وظیفہ پڑھنا تو ایسا ہے گویا کہ میں پورا Wallet کسی سے لینے کے بجائے صرف دس روپے لینے کو ترجیح دوں۔ جب ہمارے پاس قرآن پاک کی صورت پورا مجموعہ موجود ہے تو ہم اِس میں سے گن اور چن کر کوئی آیت یا سورہ بطور وظیفہ کیوں پڑھیں؟ ترتیب سے قرآن پاک پڑھنے کے اثرات اور برکات زیادہ ہیں۔"

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ بلند پایہ ولی اللہ، عالم اور فقیہ تھے۔ آپ کو ایک بار خواب میں اللہ تعالیٰ کی زیارت ہوئی۔ اللہ نے پوچھا "کیا مانگتے ہو؟" آپ رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کی "یا باری تعالیٰ! مجھے اپنے تک پہنچنے کا کوئی آسان راستہ بتا دے۔" رب تعالیٰ نے فرمایا "قرآن کی کثرت سے تلاوت کیا کرو۔"

تلاوتِ قرآن پاک کے ذریعے رب کو پانے کی سند اس واقعہ کی صورت موجود ہے جب کہ وظائف، تسبیحات، چلوں، مجاہدوں کے بارے میں ایسی کوئی سند نہیں ملتی۔ ویسے بھی قرآن پاک کی تلاوت اللہ کے ساتھ کلام کرنے کے مترادف ہے۔ قرآن پاک سب سے افضل کتاب اور کلام ہے۔ اس کی تلاوت کی جانی چاہیے۔ لیکن تلاوت کے پیچھے اصل مقصد اور نیت کیا ہے اِس حوالے سے اجر میں فرق آ جائے گا۔ اگر میں نے تلاوت ثواب کے حصول کی نیت سے کی، رب تک پہنچنے کی نیت سے کی، رب تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کی نیت سے کی تو ہر نیت کا ثواب اور اثرات مختلف ہوں گے لیکن اُس تلاوت کا ثواب، اثرات، مقام اور درجہ کہیں زیادہ ہوگا جو محبت اور شوق سے اس نیت کے پیش نظر کی جائے کہ یہ میرے رب کا کلام ہے۔

رب تعالیٰ کی بات اس لیے مانی جائے کہ یہ اُس کا حکم ہے، یہ سوچ کر مانی جائے کہ یہ اُسی ہستی کا کہا لفظ ہے جس سے میں پیار کرتا ہوں اس لیے ہر لفظ میرے لیے محترم ہے، اس لیے رب تعالیٰ کی اطاعت کی جائے کہ وہ میرا خالق و مالک ہے۔ سوچ اور نیت کے مطابق اطاعت کا درجہ بدل جائے گا۔ اگر رب تعالیٰ کی ہر بات اِس جذبے کے ساتھ مانی جائے کہ مجھے اُس سے عشق ہے تو یہ اطاعت کا اعلیٰ مقام و درجہ ہے۔

قرآن کی تلاوت رب تعالیٰ کے عشق میں ڈوب کر کریں تو وجد طاری ہو جائے گا جو ہمیں اسرار الٰہی کے مشاہدے کی طرف لے جائے گا۔

سوال: کیا فقیر پر خدمت خلق کی ڈیوٹی Mandatory ہوتی ہے؟

جواب: یہ Mandatory ہوتی بھی ہے اور نہیں بھی۔ اِس کا جواب Yes بھی ہے اور No بھی۔ اگر وہ اسے یوں دیکھے کہ کیا اِس کے بغیر وہ چل نہیں سکتا تو جواب No ہے لیکن اگر خدمتِ خلق کے ذریعے رب کو راضی کرنا مقصود ہے تو جواب Yes ہے۔ جس طرح ماں کے دل میں اُترنے کے لیے ضروری ہے کہ اُس کے بچے سے

پیار کیا جائے۔ اسی طرح رب کو پانے کے لیے اُس کی مخلوق سے محبت ضروری ہے۔ فقیر اس راستے کو پکڑتا ہے اور مخلوق کی خدمت کر کے رب کو راضی کرتا ہے۔ یوں یہ Mandatory ہے۔ انسان رُوحانیت کی بلندی پر اُس وقت تیزی سے جاتا ہے جب وہ خلقِ خدا کی طرف سے دیے گئے جبر کو ہنسی خوشی برداشت کرتا ہے۔ وہ لوگوں کی طرف سے دی جانے والی اذیت، پھینکے ہوئے پتھر جس قدر Broad smile سے برداشت کرے گا، اُسی قدر جلد رُوحانیت میں ترقی کرے گا۔ جو شخص خلقِ خدا کے لیے یوں Footmat بن گیا کہ لوگ اُس پر پاؤں صاف کر کے گزر گئے، رب تعالیٰ نے اُسے لوگوں کے سر کا Hat بنا دیا۔ جب فقیر Counselling کر رہا ہوتا ہے تو ہر مزاج اور طبیعت کے لوگوں سے اُس کا واسطہ پڑتا ہے جن میں سے 95 فی صد فقیر کے منہ پر تھوک کر چلے جاتے ہیں۔ وہ خندہ پیشانی اور ہنستے چہرے کے ساتھ یہ سب برداشت کر لیتا ہے۔ اُسے رب تعالیٰ کی طرف سے اُس کے بے پایاں انعامات ملتے ہیں۔

سوال: باوضو رہنے کے فوائد کیا ہیں؟

جواب: ہر وقت باوضو رہنے والے شخص پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں، اُس کا رزق وسیع ہوتا ہے اور پریشانی دُور ہوتی ہے۔ رب تعالیٰ اپنی رحمت کے صدقے اُسے ذہنی سکون بھی عطا فرما دیتا ہے۔ انسان کو ہر وقت ضرور باوضو رہنا چاہیے۔ اِس کی بے حد برکات ہیں۔

سوال: سورۃ الواقعہ کی اس آیت کی وضاحت فرما دیجیے **"اس کو نہیں چھوتے مگر وہ جو پاک ہیں۔"**

جواب: اس آیت کے دو طرح سے معنی لیے جاسکتے ہیں۔ اگر انسان پاک حالت میں نہیں، اُس پر غسل فرض ہو چکا ہے تو اُسے قرآن پاک کو ہاتھ نہیں لگانا چاہیے۔ یہ ہے فرض۔ ادب کی بات یہ ہے کہ انسان بغیر وضو کے اسے ہاتھ نہ لگائے اور جان لے کہ بغیر ادب کے کچھ نہیں سیکھا جاسکتا۔ وہ خواتین جو نماز پڑھنے سے قاصر ہیں انھیں قرآن پاک کو نہیں چھونا چاہیے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ قرآن پاک میں ہدایت اُنھی لوگوں کے لیے ہے جن کے دل پاک اور صاف ہیں اور ہدایت کی جستجو میں ہیں۔ قرآن پاک اُن کے لیے کھلی ہدایت ہے اور اُنھیں حق کی طرف لے جاتا ہے۔

سوال: کیا سجدۂ تلاوت مؤخر کیا جاسکتا ہے؟

جواب: بہتر یہی ہے کہ قرآن پاک میں تلاوت کرتے ہوئے جہاں آیت سجدہ آئے ہم فی الفور سجدہ ادا کر دیں۔

جمعہ کی فضیلت

جب میرے مرشد سید یعقوب علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ حیات تھے اور اُن سے میری نئی نئی ملاقات ہوئی تھی تو میں نے نوٹ کیا کہ وہ نمازِ جمعہ کے بارے میں بہت Particular تھے اور بہت اہتمام سے نماز ادا کرتے۔ اُن کا ایک معمول میرے لیے تب بہت باعثِ حیرت تھا کہ وہ ٹھیک بارہ بجے مسجد میں داخل ہوتے اور اس میں ایک منٹ کی تاخیر بھی نہ کرتے۔ میں چونکہ ملازمت میں تھا اور میری چھٹی Sunday کو ہوتی تھی اس لیے جمعہ کو بہت زیادہ اہتمام نہ ہو پاتا۔ بعد ازاں Friday کی چھٹی Announce ہوگئی اور میں قریبی مسجد میں نمازِ جمعہ ادا کرنے لگا۔ ایک دن مرشد صاحب نے دریافت کیا "نمازِ جمعہ کہاں ادا کرتے ہو؟" میں نے عرض کیا "گھر سے قریبی مسجد میں۔" تب اُنھوں نے مجھے بھی یہ حکم دیا کہ جا کر 12 بجے مسجد میں بیٹھ جایا کرو۔ اس کے بعد میرا یہ معمول بن گیا کہ میں گیارہ سوا گیارہ بجے مرشد صاحب کے پاس جا کر بیٹھ جاتا اور 12 بجے اُنھی کے ساتھ مسجد چلا جاتا۔ ایک بار وہ 12 بج کر 02 منٹ پر مسجد پہنچے، جس کا اُنھیں بہت ملال تھا۔ نماز کے بعد مجھ سے فرمایا "آج تمھاری وجہ سے میں دو منٹ لیٹ ہوگیا۔"

اُس وقت مجھے یہ سب باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں لیکن گزرتے وقت کے ساتھ یہ سب سمجھ آنے لگا۔ مرشد صاحب دُنیا سے رُخصت ہوگئے اور یہ سب معاملات میری اپنی ذات تک رہ گئے۔

بعد میں سمجھ آئی کہ مرشد صاحب جمعہ کو دوپہر 12 بجے مسجد میں جا کر کیوں بیٹھ جاتے تھے۔ اصل میں جمعہ کے روز ایک ایسی گھڑی آتی ہے کہ جس میں مانگی ہوئی ہر دُعا قبول ہوتی ہے لیکن جس طرح شبِ قدر مخفی ہے اور طاق راتوں میں اسے تلاش کرنے کا حکم ہے اسی طرح جمعۃ المبارک کی اُس مبارک ساعت کے بارے میں مختلف بزرگانِ دین نے مختلف آراء کا اظہار کیا ہے لیکن زیادہ تر کا اتفاق اس بات پر ہے کہ وہ ساعت زوال کے وقت آتی ہے۔

جب یہ بھید کھلا تو سمجھ آئی کہ مرشد صاحب جمعہ کے بارے میں اتنے Particular کیوں تھے اور ٹھیک 12 بجے مسجد جا کر ذکر اذکار میں کیوں مشغول رہتے تھے۔

ہمیں بھی کوشش کرنی چاہیے کہ بروز جمعہ 12 بجے مسجد میں جا کر بیٹھ جائیں تا کہ قبولیت کی ساعت مل جائے۔ جمعہ کے روز کثرت سے نوافل پڑھیں اور تلاوت قرآن پاک کریں۔ تقریباً 12 بجے چونکہ زوال کا

وقت ہوتا ہے اس لیے اُس وقت نوافل تو ادا نہیں کیے جا سکتے۔ لہٰذا اُس وقت دل ہی دل میں سورۃ الاخلاص کا ورد کرتے رہیں۔ زوال کا وقت ختم ہونے کے بعد تحیۃ المسجد کے نوافل ادا کیے جائیں اور اس کے بعد چار نوافل اس طرح پڑھیں کہ ہر رکعت میں سورۃ الفاتحۃ کے بعد 50 مرتبہ سورۃ الاخلاص پڑھ لیں تو اُمید ہے کہ رب تعالیٰ ہمارے گناہ معاف فرما دے گا اور ہم پر کرم فرمائے گا۔

جمعہ کے دن کی اہمیت کے پیشِ نظر آپ ﷺ نے فرمایا:

سیدنا ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے جمعہ کے دن نمازِ عصر پڑھنے کے بعد اپنی جگہ سے اُٹھنے سے پہلے اسی مرتبہ پڑھا (اللھم صلی علی محمد النبی الامی وعلی آلہ وسلم تسلیما) تو اُس کے 80 سال کے گناہ معاف ہو جائیں گے اور اُس کے لیے 80 سال کی عبادت کا ثواب لکھا جائے گا۔ (القول البدیع فی الصلاۃ علی الحبیب الشفیع ،صفحہ 199)

اگر انسان سنتیں ادا کرنے سے پہلے تک کا وقت نوافل اور ذکر اذکار میں گزار دے تو نہ صرف اُسے ثواب ملتا ہے بلکہ اللہ اُس پر علم کی بارش بھی کرتا ہے۔

ہم اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ رب تسبیح کرنے سے ملے گا۔ حقائق اس سے مختلف ہیں۔ رب تعالیٰ تسبیح پھیرنے یا وظائف کرنے سے نہیں ملتا۔ رب تو ملتا ہے جب انسان رب کی مخلوق پر مہربان ہو جائے بلکہ یوں کہہ لیجیے کہ جب انسان خلقِ خدا کے لیے Footmat بن جائے کہ جس پر خلق پاؤں رکھ کر گزرتی رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انسان عبادت بھی کرتا رہے تو ایسے انسان کو رب تعالیٰ لوگوں کے سر کا Hat بنا دیتا ہے۔

لیکن یاد رہے اگر انسان اللہ کی راہ پر چلنا چاہتا ہے یا چل رہا ہے تو اُس پر گرفت بھی بڑی تیزی سے آتی ہے۔ ایسا نہیں کہ رب تعالیٰ (معاذ اللہ) اپنی راہ پر چلنے کی سزا بندے کو دے رہا ہوتا ہے۔ یہ تو اُس کی مہربانی اور عنایت کا ثبوت ہے۔ جن بندوں کو وہ عزیز رکھتا ہے اُن کی چھوٹی سی کوتاہی پر بھی اُنھیں جھٹکا دیتا ہے اور وہ اپنی غلطی کا احساس کر کے دوبارہ سنبھل جاتے ہیں اور سیدھی راہ پر چلنے لگتے ہیں۔ آپ نے اکثر لوگوں کو کہتے سنا ہوگا کہ نیکی کی راہ پر چلنے والوں کی راہ میں مصائب دوڑ دوڑ کر آتے ہیں۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ اللہ کی راہ پر چلنے والے سے جب کوئی غلطی ہوتی ہے تو رب تعالیٰ اُسے جھنجھوڑتا ہے کیونکہ وہ نہیں چاہتا کہ میری راہ پر چلنے والا بندہ بھٹک جائے۔

ان مصائب کی دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان خلقِ خدا کا جبر جس قدر ہنستے مسکراتے برداشت کرتا ہے، لوگوں کی طرف سے لگائے گئے چرکے خوش دلی اور مسکراتے چہرے کے ساتھ Face کرتا ہے، لوگوں کے طعن و طنز اور اُن کی طرف سے کی جانے والی تضحیک جس قدر ہنستے کھیلتے سہہ جاتا ہے۔ اُسی قدر زیادہ اُس پر رب تعالیٰ کے انعامات کی بارش ہوتی ہے۔

نیک لوگوں کو رب تعالیٰ اس بات کی سزا نہیں دے رہا ہوتا کہ تم میری راہ پر کیوں چلے۔ جوں جوں ایسا

انسان رب تعالیٰ کی راہ پر قدم آگے بڑھاتا جاتا ہے اُس پر اللہ کے انعامات کی بارش میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس راہ پر چلنے والے مالی تنگی کی شکایت کرتے ہیں۔ یہ شکایت درست نہیں۔ مال جسے ہم نعمت گردانتے ہیں۔ وہ ہمارے گلے میں پڑا ہوا پھندا ہے کیونکہ جس قدر مال زیادہ ہوگا اُتنا ہی زیادہ حساب دینا ہوگا۔ اس لیے پیغمبر علیہم السلام، صحابہ کرامؓ اور اولیاء کرام کی زندگی میں عموماً مالی تنگی نظر آتی ہے۔

میرے پاس ایک بہت پڑھے لکھے، Financially خاصے Affluent صاحب آیا کرتے تھے۔ پھر ایک دم اُن کی کایا پلٹ گئی۔ ایک روز آئے تو اُن کا لباس مجھ سے بھی گیا گزرا تھا حالاں کہ وہ بہت فاخرانہ لباس پہنتے تھے۔ میں نے وجہ پوچھی تو بولے ''حقیقت میری سمجھ میں آ گئی ہے۔ میں نے سب کچھ ترک کر دیا ہے۔ اب میں چیچہ وطنی کے پاس ایک فیکٹری میں کلرک لگ گیا ہوں۔ جو کچھ میرے پاس تھا سب چھوڑ دیا۔'' میں نے کہا'' آپ نے کمال محنت کی۔'' کہنے لگے مجھے فیکٹری سے ماہانہ 700 سو روپے تنخواہ ملتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ اس نوکری سے پہلے اُن کا ماہانہ خرچ 15 سے 20 لاکھ روپے تھا۔ اب وہ ایک عالی شان گھر چھوڑ کر 10x10 کی کوٹھڑی میں ڈیرہ ڈالے ہوئے تھے جس میں موجود چارپائی بھی یہ کہہ کر چوکیدار کو دے دی کہ میں زمین پر سویا کروں گا۔

وہ بہت محنتی تھے ایمان داری سے کام کرتے رہے۔ فیکٹری مالکان کو اُن کی خوبیوں کا اندازہ ہوا اور اُنھوں نے یہ بھی دیکھا کہ اُنھوں نے کبھی تنخواہ میں اضافے کا مطالبہ نہیں کیا۔ اُن کی کارکردگی اور رویے سے خوش ہو کر اُنھوں نے اُن کی تنخواہ بڑھا کر 1500 روپے کر دی۔ جب اگلے ماہ اُنھوں نے وہ تنخواہ وصول کی تو سیدھے اکاؤنٹنٹ کے پاس چلے گئے کہ آپ نے غلطی سے مجھے زائد رقم دے دی ہے۔ جب اُنھیں بتایا گیا کہ فیکٹری مالکان نے اُن کی تنخواہ بڑھائی ہے تو وہ فیکٹری مالک کے پاس جا کر کہنے لگے'' آپ نے مجھے کس غلطی کی سزا دی ہے؟'' مالک نے سمجھا کہ شاید یہ ایسا طنزاً کہہ رہے ہیں۔ وہ بولے'' ہم آپ کی تنخواہ میں مزید اضافہ کر دیتے ہیں۔'' اُنھوں نے کہا'' مجھ سے 700 کا حساب نہیں دیا جائے گا، 1500 روپے کا کیسے دوں گا؟''

میرے سامنے ایک صاحب بیٹھے ہیں جن کے چہرے پر اس وقت بڑی رونق دکھائی دے رہی ہے کہ شاید میں بھی نیک انسان ہوں جو پچھلے 25 سال سے مشکلات اور مالی تنگی کا شکار ہوں (یہ کلمات شاہ صاحب نے ازراہِ تفنن ادا کیے) یہ خوش فہمی ہے۔ کبھی کبھی نیکی کی راہ پر چلے بغیر بھی مالی تنگی آتی ہے۔

درحقیقت یہ مشکلات نہیں بلکہ انعام ہے۔ رب تعالیٰ ہماری مدد کر رہا ہوتا ہے کہ ہم اُس کی راہ پر چلتے جائیں اور وہ ہمیں علم سے نوازتا جائے۔

جمعہ کا ذکر ہو رہا تھا۔ جمعہ کے روز اگر ہم سورۃ الاخلاص کی پہلی آیت خطبہ کی اذان ہونے تک پڑھتے رہیں تو ہمیں بہت سے انعامات حاصل ہوں گے۔

سوال: حاضری سے کیا مراد ہے؟

جواب: حاضری کا لفظ بطور اِصطلاح استعمال ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کا جب کسی بزرگ سے رُوحانی رابطہ ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے حاضری ہو رہی ہے۔ بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی نیک بزرگ کو کوئی شخص پسند آ گیا تو جب وہ ملاقات کے لیے آتے ہیں تو اُس شخص کی ظاہری حالت تبدیل ہو جاتی ہے۔ ہاتھ پاؤں مڑ جاتے ہیں اور وہ ہوش سے بے گانہ ہو جاتا ہے۔ ایسے عالم میں جب اُس سے بات کی جاتی ہے تو وہ اُس (رُوح) نیک بزرگ سے پوچھ کر پوچھی گئی بات کا جواب دیتا ہے لیکن ظاہری حالت وہیں بدلتی ہے جہاں رُوحانی تربیت نہ ہو۔ جہاں رُوحانی تربیت ہوئی ہو وہاں ایسا رابطہ تو ضرور ہوتا ہے لیکن حلیہ نہیں بگڑتا اور ہوش وحواس قائم رہتے ہیں۔

یاد رکھیے! رب تعالیٰ بہت باوقار ہے۔ اُسے یہ پسند نہیں کہ اُس کے بندے بے وقار ہو جائیں۔ حاضری کے دوران عموماً کچھ لوگوں کا جس طرح حلیہ ہو جاتا ہے کہ فرش پر گر گئے، ہاتھ پاؤں مڑ گئے، آنکھیں پلٹ گئیں...... یہ بے وقار انداز ہے۔ اِس سے متاثر نہ ہوئیے۔

اولیائے کرام بہت باوقار، صاف ستھرے اور خوش اخلاق ہوتے ہیں۔ خواہ لباس پیوند شدہ ہو لیکن پاک اور صاف ہوتا ہے۔ وہ اُٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے میں باوقار ہوتے ہیں۔ ذرا سوچیے کہ جو رب خود بے حد باوقار ہے اُس کے دوست بے وقار کیسے ہو سکتے ہیں۔

سوال: ہم رب تعالیٰ پر مان کیسے پیدا کر سکتے ہیں؟

جواب: جب کسی شخص کو یہ اعتماد حاصل ہو جائے کہ آپ اُس کے دوست ہیں، اُسے پورا یقین ہو کہ آپ مشکل وقت میں اُس کے کام آئیں گے، جب اُسے ضرورت ہوگی آپ میدان چھوڑ کر نہیں بھاگیں گے، اُس کے حوالے سے کوئی آپ کے پاس آئے گا تو آپ اُسے بھی Entertain کریں گے...... یہ یقین ہی مان ہے۔

ایک صاحب جو مجھ سے خاصے بڑے ہیں، 35 سال سے میری اُن کے ساتھ دوستی ہے۔ ایک بار وہ میرے آفس تشریف لائے اور بڑے رُعب سے بولے "کھڑے ہو جاؤ۔" جب آپ ایگزیکٹو پوسٹ پر کام کر رہے ہوں تو یہ رُعب بڑا عجیب لگتا ہے۔ میں کھڑا ہو گیا۔ اُنھوں نے میری جیب سے Wallet نکال کر اُس میں سے پیسے نکالے، جیب میں واپس Wallet ڈالا اور دروازے کے پاس جا کر بولے "شاہ جی! آپ کے لیے سو روپے چھوڑے جا رہا ہوں۔" یہ مان ہے۔

ایک روز اُنھوں نے خاصی بڑی رقم کا مطالبہ کیا۔ میں نے کہا "میں بھی آپ کی طرح سرکاری ملازم ہوں۔ میرے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئیں گے۔" کہنے لگے۔ شاہ جی!

It's your problem, not mine. I need money.

یہ مان ہے۔ جب یہ یقین ہو کہ یہ میرا دوست ہے، میرا اس پر حق ہے۔

رب پر مان پیدا کرنے کا ایک ہی نسخہ ہے کہ بندہ نہ صرف رب کا ہو جائے بلکہ رب کو اپنا مان لے اور پھر اُس سے عشق کرنے لگے۔ لیکن اس راہ کا ایک خطرہ عرض کر دوں کہ جب ہم یہ دعویٰ کرنے لگتے ہیں کہ میں

رب کا ہوں اور رب میرا مالک ہے اور کہتے ہیں "یا باری تعالیٰ! آج سے میں نے اپنے تمام معاملات تیرے سپرد کر دیے ہیں اِس یقین کے ساتھ کہ تو جو میرے لیے کرے گا وہ یقیناً میرے مفاد میں بہترین ہوگا۔"

رب تعالیٰ اس دعویٰ کو قبول تو کر لیتا ہے لیکن اس کی حقیقت پرکھنے کے لیے چکی کے دو پاٹوں میں دعویٰ کرنے والے کو پیستا ہے۔ جب چکی کے دو پاٹوں میں وہ پس رہا ہوتا ہے تو چاہے اُس کی زبان لٹک کر باہر آ جائے تو پھر وہ اُف تک بھی نہ کرے کیونکہ یہ مرحلہ کامیابی سے گزار لینے کے بعد انعامات کی بے پناہ بارش ہوتی ہے۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ شاہی قلعہ لاہور میں موجود موتی مسجد میں نیک اور بزرگ جنات رہتے ہیں وہاں دو نفل حاجت پڑھ کر جو دُعا مانگی جائے قبول ہوتی ہے۔

جواب: یہ بھی عجب کمال بات ہے کہ رب تعالیٰ کے ساتھ بھی ہم نے Transactional اور Commercial relationship پالی ہوئی ہے کہ اے اللہ! میں مسجد میں دو نفل اس لیے ادا کروں گا کہ تُو میری حاجت پوری کر دے۔ یہ افسوس ناک رویہ ہے۔ رب تعالیٰ کی عبادت تو اس لیے کی جانی چاہیے کہ وہ معبودِ حقیقی اور لائقِ عبادت ہے۔ مسلمان جب بھی مسجد میں جائے دو رکعت تحیة المسجد کے نوافل ضرور ادا کرے چاہے وہاں جنات رہتے ہوں یا نہیں۔

میں تو کسی جگہ اس نیت سے نماز پڑھنے کو تیار نہیں کہ چونکہ یہاں جنات رہتے ہیں اس لیے میں نماز پڑھ کر دُعا مانگوں گا تو میری حاجات پوری ہو جائیں گی۔

آپ وہاں ضرور نوافل ادا کریں (دو، چار یا جتنے بھی چاہیں) لیکن تحیة المسجد کے نوافل کی نیت کر لیجیے کیونکہ یہ مسجد کا حق ہے کہ ہم جب بھی کسی مسجد میں داخل ہوں تو وہاں نوافل ادا کریں......

سوال: کہا جاتا ہے کہ تقویٰ کے حصول کے لیے انسان ذلت کو عزت پر ترجیح دے کہ اِس سے انا کے بت ٹوٹ جاتے ہیں۔ اِس کی وضاحت فرما دیجیے۔

جواب: انسان کو کسی بھی حال میں ذلت کو عزت پر ترجیح نہیں دینی چاہیے۔ مسلمان ذلت سے بہت دُور رہتا ہے۔ جس رویے کو آپ نے ذلت پر محمول کیا ہے وہ شاید آپ کو اس لیے ایسا لگا ہو کیونکہ فقیر دوسروں کی طرف سے کی گئی ہر تنقید اور تلخ بات ہنسی خوشی سہہ جاتے ہیں۔ اُنھیں کوئی گالی دے تو وہ جواب میں مسکرا دیتے ہیں...... یہ ذلت نہیں عزت ہے۔

آپ سب کے سامنے اگر کوئی صاحب آ کر مجھے بدترین الفاظ کہیں، میں جواباً خاموش اور مسکراتا رہوں۔ وہ جانے لگیں تو میں بڑے احترام سے کہوں "جناب! آپ تشریف رکھیے۔ روزہ ہے ورنہ میں آپ کی خدمت کرتا۔" لیکن وہ مجھے گالیاں دیتے ہوئے رُخصت ہو جائیں تو آپ کسے بُرا سمجھیں گے؟ مجھے یا اُن صاحب کو؟ یقینی بات ہے گالیاں دینے والے کو۔ میرے بارے میں آپ یہی سوچیں گے کہ یہ بہت متحمل مزاج انسان ہے۔ یوں ذلت مجھے تو نہیں ملی۔

جب ہم کسی کی زیادتی خاموشی سے برداشت کر کے مسکراتے رہتے ہیں اور اپنے رویے میں کوئی منفی تبدیلی نہیں آنے دیتے بلکہ گالیاں سن کر بھی نرمی اور تحمل سے کہتے ہیں "بھائی! یقیناً مجھ سے کوئی کوتاہی ہوگئی ہے کہ جس کی وجہ سے آپ مجھ سے ناراض ہیں۔" اِس رویے سے انسان کا مقام بلند ہوتا ہے گرتا نہیں۔ سنت بھی یہی ہے۔ آپ ﷺ نے کبھی کسی کو پلٹ کر اُس کی سخت بات کا جواب نہیں دیا۔ جب ہم لوگوں کی تنقید کھلے دل سے برداشت کرتے اور بعد ازاں غور کرتے ہیں کہ اُس میں کہاں کہاں واقعی میری غلطی تھی تو یہ تنقید باعث رحمت ہے۔ اِسی طرح اگر کوئی شخص آ کر مجھے بُرا بھلا کہتا ہے اور میں اُسے خوش دلی سے برداشت کرتا ہوں اور اُس کے جانے کے بعد اپنا تجزیہ کرتا ہوں کہ کہاں مجھ سے کوتاہی ہوئی کہ اُس آدمی کو مجھے یہ سب کہنا پڑا۔ اِس تجزیے کا فائدہ یہ ہوگا کہ میں اپنی اصلاح بھی کرلوں گا اور میری انا کا بت بھی ٹوٹ جائے گا۔

یہ انا ہے جو مجھے ستاتی ہے کہ میں گالی کا جواب پتھر سے دوں۔ یہ انا ہے جو انسان کو ذلیل و خوار کرتی ہے۔ مسلمان ذلت سے دُور رہتا ہے اور کوئی ایسا کام نہیں کرتا جس کی وجہ سے اُس کی ذلت ہو۔

سوال: حدیث کا مفہوم ہے رب پر اچھا گمان رکھو۔ رب تمھارے گمان کے مطابق فیصلہ کرے گا۔ اِس کی وضاحت فرما دیجیے۔

جواب: حدیث مبارکہ یوں ہے:

"میرا بندہ مجھ سے جیسا گمان رکھتا ہے میں اُسی طرح اُس کے ساتھ پیش آتا ہوں۔"

(صحیح بخاری، حدیث 7066)

یہ انسان کی سوچ کو اچھا رکھنے کے لیے فرمایا گیا۔ انسان کی سوچ اُس کے احوال پر اثر انداز ہوتی ہے۔ جو انسان منفی باتیں سوچتا ہے اُس کے چہرے پر ہر وقت عجیب سی Tension، بے رونقی اور روکھا پن دکھائی دے گا لیکن جو آدمی Positive سوچ کا حامل ہو اُس کے چہرے پر چمک اور رونق دکھائی دیتی ہے جسے ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص کے چہرے پر بہت نور ہے۔ یہ انسان کی سوچ ہے جو چہرے سے جھلکتی ہے۔

اگر انسان یہ سوچتا رہے کہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا میرا کوئی کام رُک نہیں سکتا جب تک میرا رب زندہ و قائم ہے اور بے شک وہ زندہ اور قائم رکھنے والا ہے یہ سوچ اتنی Strong اور Positive ہے کہ اِس کے اثرات کے نتیجے میں انسان کے حالات بدلنے لگتے ہیں۔ ہم اللہ سے اچھے گمان رکھیں مثلاً میں نے کسی کام کے لیے کوشش کی تو گمان رکھوں کہ اللہ مجھے اِس میں کامیاب کردے گا۔ اگر میں مشکل میں ہوں تو یہ گمان رکھوں کہ میرا رب مجھے ضرور اِس میں سے نکال لے گا۔ ہم ہمیشہ رب تعالیٰ سے اچھائی کی اُمید رکھیں، وہ اچھا ہی کرے گا۔

رُوح کی لطافت

ہم سبھی جانتے ہیں کہ انسانی آنکھ میں نہ کوئی بینائی ہے نہ اس کے اندر نُور۔ یہ کسی بھی شے کو اُس وقت تک دیکھ نہیں پاتی جب تک اُس Object پر روشنی نہ پڑے جس کو ہماری آنکھ فوکس کیے ہوئے ہو۔ جب کسی Object پر روشنی پڑتی ہے تو اُسے وہ Reflect کرتی ہے۔ اُس Reflected light beam سے ہماری آنکھ اُس Object کو دیکھ پاتی ہے۔ ہماری بینائی کتنی ہی تیز کیوں نہ ہو وہ کسی شے کو دیکھنے پر اُس وقت تک قادر نہیں جب تک چیزوں پر روشنی یا نور نہ پھیلے۔ اِسی طرح انسان چیزوں کو دیکھ نہیں سکتا جب تک وہ نور یا روشنی کو حاصل نہ کرلے۔

رب تعالیٰ نے دُنیا میں پاک اور ناپاک اِسی طرح کثیف اور لطیف اشیا پیدا فرمائیں۔ ہماری ظاہری آنکھ کثیف اشیا کو تو فوری طور پر دیکھ لیتی ہے مثلاً جب ہم کسی انسان پر نظر ڈالتے ہیں تو اُس کا جسم فوراً دیکھ لیتے ہیں لیکن اُس کا باطن کیا ہے، اُس کی روح کیا ہے، اُس پر نظر نہیں جاتی۔

جب انسان کسی اہلِ باطن سے ملتا ہے تو وہ جسم کے ساتھ رُوح پر بھی نظر ڈال لیتے ہیں کہ یہ انسان کثافت یا لطافت کے کس مقام پر ہے۔

انسان اِرتقا کے مراحل سے گزرتے ہوئے یہاں تک پہنچا۔ اس ارتقا کی ایک Quick جھلک قطرے سے پیدائش تک کے 37 ہفتوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ انسان کے اندر حیوان موجود ہے۔ ہوسکتا ہے بہت سے لوگ اِس بات پر Eyebrows raise کریں۔ بقول مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ انسان ایک گھنا جنگل ہے جس میں حیوانات اور نباتات سبھی موجود ہیں۔ انسان کو آپ شیر کی طرح بہادر، کچھ لومڑی کی طرح چالاک اور کچھ بھیڑ کی کھال پہنے دکھائی دیتے ہیں لیکن جب ہم کسی کے بارے میں رائے کا اظہار کرتے ہیں تو کبھی بھی اُس کی صرف ایک صفت کو نہیں دیکھتے اور نہ ہی ایسا کرنا چاہیے۔ ہمیں چاہیے کہ اُس کی تمام صفات کو یک جا کر کے اِس انسان کی Overall assessment کریں اور جو خوبی Heavier ہو اُس کی بنیاد پر اُس کی شخصیت کا فیصلہ کریں۔

بات ہو رہی تھی نگاہ کی۔ انسانی آنکھ کثیف اشیا کو دیکھتی ہے۔ جب کبھی آندھی یا تیز ہوا چلے تو غور کیجیے کہ اِس ہوا میں اُڑنے والی مٹی کو تو آنکھ دیکھ لیتی ہے لیکن ہوا کو نہیں دیکھ پاتی۔ عجیب بات ہے کہ جس Prime mover نے مٹی کو اُڑایا ہے ہم اُس کو نہیں دیکھ پاتے حالانکہ مٹی بذاتِ خود اُڑ نہیں سکتی۔

ہمارا جسم از خود چلنے پر قادر نہیں اِس کا Prime mover جو اُسے چلائے ہوئے ہے، رُوح ہے۔ لیکن ہم اِس رُوح کو ہی نہیں دیکھ پاتے۔ جسم کا تعلق مٹی سے ہے اور وہ مٹی میں ہی چلا جاتا ہے۔ رُوح کا تعلق رب تعالیٰ سے ہے کیونکہ وہ امر ربی ہے اس لیے رُوح مرتی نہیں بلکہ اپنے اصل کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ اِس لیے قرآن پاک میں فرمایا گیا کہ ہر شے کو اپنے اصل کی طرف لوٹ جانا ہے۔ جس شے کا تعلق اپنے رب سے ہے وہ رب کی طرف سے آئی اور رب ہی کی طرف لوٹ جائے گی۔ اس کی اصل پاکیزہ ہے۔ یہ اور بات کہ ہم اپنے اعمال سے اِسے کثیف کر لیں یا اِسے لطافت کے اعلیٰ مدارج تک لے جائیں۔ گزشتہ کسی نشست میں ایک صاحب نے فنا کے بارے میں سوال پوچھا تھا جس کا تفصیلی جواب تو میں نے عرض کر دیا تھا لیکن ''فنا'' کو ایک Sentence میں بھی بیان کیا جا سکتا ہے۔ جب ہم ہر طرح کے غیر اللہ کو یوں بھلا دیتے ہیں کہ صرف رب یاد رہ جاتا ہے تو یہ ''فنا'' ہے جسے فنافی اللہ بھی کہا جاتا ہے۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ ہر ماسوا اللہ کو بھلا دینے کا نام ''فنا'' ہے۔

رُوحانیت حاصل کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ انسان کے باطن کا تعلق رب سے جڑ جائے۔ اِس لیے میں عرض کیا کرتا ہوں کہ عبادات سے پارسائی آتی ہے جب کہ نیکی سے رب ملتا ہے۔ عبادت رفتہ رفتہ ہماری عادت بن جاتی ہے۔ ایک نمازی کی کبھی نماز قضا ہو جائے تو اُسے بے چینی ہوتی ہے جیسے سگریٹ نوش کو سگریٹ نہ پینے سے ہوتی ہے۔ یہ دراصل عبادت کی عادت ہے، جس میں ناغہ انسان کو بے چین کرتا ہے۔ عادتاً کی جانے والی عبادت سے رب نہیں ملتا۔ رب اُس وقت ملے گا، جب ہم اپنی رُوح کا تعلق رب سے قائم کر لیں گے۔ پانی کے بہت بڑے Pond (تالاب) کا تعلق دریا یا نہر سے نہ ہو تو اُس میں موجود پانی کچھ عرصے بعد Stale (باسی) ہو جائے گا اُس پانی کا رنگ بھی بدل جائے گا اور اُس میں Bad smell (بدبو) بھی پیدا ہو جائے گی لیکن اگر اُس تالاب یا جھیل کا تعلق نہر یا دریا سے ہو تو اُس میں نیا اور تازہ پانی شامل ہوتا رہے گا اور اُس میں پانی کی مخلوق بھی زندہ رہ پائے گی۔ اِسی طرح جب انسانی رُوح کا تعلق رب سے نہیں ہوتا تو وہ کثیف ہوتی چلی جاتی ہے اور اِس کثافت کی وجہ سے انسان مرئی اشیا کو تو دیکھ پاتا ہے لیکن غیر مرئی اشیا تک اُس کی رسائی نہیں ہو پاتی۔

انسان رُوح سے تعلق اُسی وقت جوڑ پائے گا جب وہ اپنے سے زیادہ صالح لوگوں میں بیٹھے گا کیونکہ صالح صحبت کے اثر سے رُوح میں لطافت پیدا ہوگی۔ چونکہ رُوح کی پرواز کے بغیر انسانی رُوح اِس قابل نہیں ہوتی کہ وہ عالمِ اسرار کی سیر کر سکے اس لیے رُوح کی لطافت پر بہت زور دیا جاتا ہے۔

لطافت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان دو چیزوں کو یک جا کر دے:

1۔ حقوق اللہ کی ادائیگی

2۔ مثبت سوچ۔ جسے آسان لفظوں میں یوں کہہ لیں کہ آپ خلقِ خدا پر مہربان ہو جایئے رب تعالیٰ آپ پر مہربان ہو جائے گا۔

جب انسان میں یہ مثبت سوچ پیدا ہو جاتی ہے تو وہ اُس مقام پر آ جاتا ہے کہ جب کوئی اُس سے زیادتی یا بُرا سلوک کرتا ہے تو وہ ہمدردانہ لہجے میں کہتا ہے کہ اُس بے چارے سے غلطی ہو گئی۔ وہ کبھی یہ نہیں کہتا کہ اُس نے ظلم کیا۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ بے چارے سے غلطی ہو گئی تو پھر اُس کی غلطی فوراً معاف کر دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پھر نہ کسی سے گلہ شکوہ ہوتا ہے، نہ غصہ آتا ہے اور نہ کسی کے لیے دل میں کینہ پیدا ہوتا ہے بلکہ دوسروں کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

جب ہم کسی کو مادی لحاظ سے پھلتا پھولتا دیکھتے ہیں تو پھر اس کا Grudge نہیں کرتے بلکہ اپنی مثبت سوچ کی وجہ سے اُسے دیکھ کر بے ساختہ دُعا دیتے ہیں کہ رب تعالیٰ اُسے مزید رزق اور خوش حالی عطا کرے۔ ایسا انسان بدگمان نہیں ہوتا کہ اُس نے لوٹ مار اور کرپشن کر کے یہ مال اکٹھا کیا ہے۔

یہ رویہ اپنانے سے اُن دس آلائشوں سے جان چھوٹ جاتی ہے جن کو حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے رُوحانیت کی راہ کی رُکاوٹ قرار دیا ہے۔

انسان حقوق اللہ کی ادائیگی صراحت کے ساتھ کرے اور عبادت عادتاً نہیں بلکہ اِس شوق اور جذبے سے کرے کہ میرا رب لائقِ عبادت ہے اور مجھے اُس کی عبادت کرنی ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ اپنی سوچ کو مثبت کر لے۔

جب یہ دونوں خوبیاں انسان میں اکٹھی ہو جاتی ہیں تو پھر اُس کی رُوح میں لطافت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اللہ کی راہ پر چلنے لگتا ہے۔

سوال: کیا کامیابی کے حصول کے لیے محنت ضروری ہے؟ رب تعالیٰ تو کبھی محنت کے بغیر بھی عطا کر دیتا ہے۔ سعودی عرب میں تو لوگوں کے گھر سے تیل نکل آتا ہے۔

جواب: آپ نے بالکل صحیح فرمایا لیکن میں کیا کروں کہ میرے سامنے رب کا وہ فرمان رہتا ہے کہ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے۔ یہ جو رب تعالیٰ کبھی کسی کو محنت کے بغیر عطا کر دیتا ہے تو یہ Exceptions (مستثنیات) ہیں اور یاد رکھیے کہ Exceptions (مستثنیات) کو ہم کبھی مثال کے طور پر پیش نہیں کر سکتے۔

آپ نے سعودی عرب کی مثال دی۔ آپ کی نظر اُن کے آج پر ہے۔ اُن کا ماضی آپ نے نہیں دیکھا۔ دودھ اپنی اصلی حالت میں بڑا Vulnerable ہوتا ہے لیکن اُس میں پانی ڈال دیں تو اُس کی خالص پن کی صفت متاثر ہو جائے گی۔ اس دودھ کو جب آپ Boil کرتے اور رفتہ رفتہ دھیمی آنچ پر پکاتے ہیں اور اس کے بعد اسے جما کر بلوتے (Beat) ہیں تو اس میں سے جو مکھن نکلتا ہے وہ Vulnerable نہیں ہوتا۔ جس پانی نے دودھ کا خالص پن ختم کیا مکھن اُسی پانی میں تر و تازہ رہتا ہے لیکن دودھ سے مکھن تک کا سفر طے کرنے میں دودھ کئی گھنٹے دھیمی آنچ پر پڑا رہا حتیٰ کہ اُس کا رنگ بدل گیا۔ پھر اُسے جاگ لگا کر جمایا گیا۔ اس کے بعد اُس

نے گھنٹہ بھر کی Beatingلی تو مکھن حاصل ہوا۔ وہ مکھن خوش ذائقہ و خوش شکل بھی ہے اور Vulnerable بھی نہیں ہے۔

سعودیوں کے چودہ سوسالہ سفر کو دیکھیے۔ اُنھوں نے اپنے وقت کی دو سپر پاورز کو زیر کیا ہے، ریگستان میں مار کھائی ہے، قربانیاں دی ہیں۔ پھر وہ وقت بھی یاد کیجیے جب اُن کے جدِ امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دُعا فرمائی کہ میری قوم کو دُنیا کی ہر نعمت عطا فرما۔ اِن سب کے نتیجے میں سعودیوں کے گھروں سے تیل نکلا ہے اور آج وہ آرام سے بیٹھے ہیں۔ میں اور آپ چودہ سو سال کے بجائے صرف چالیس سال ہی صحیح طریقے سے محنت کر لیں تو انشاء اللہ ہمارے گھروں سے بھی تیل نکل آئے گا۔

سوال: کیا رزق کی تنگی کی صورت میں ہجرت کرنا مناسب ہے؟ رزق میں وسعت کے لیے کوئی وظیفہ بتا دیجیے۔

جواب: ہجرت میں بڑی برکت ہے۔ جب ایک جگہ انسان پر رزق تنگ ہو تو وہ ہجرت کر لے، رزق وسیع ہو جائے گا۔

رزق میں اضافے کے لیے میں تو ایک ہی وظیفے سے واقف ہوں کہ بھرپور کوشش اور محنت کر کے دُعا کر لی جائے۔ اللہ اُن لوگوں کو پسند کرتا ہے جو مجاہدوں کی طرح ہر وقت محنت اور عمل کے لیے کمر کس کے رکھتے ہیں۔ اللہ کو کاہل لوگ پسند نہیں۔

سوال: درود پاک پڑھتے ہوئے ہم اللہ سے التجا کرتے ہیں اللھم صل علی سیدنا محمد۔ وضاحت کر دیں کہ صل علی کتنی بڑی نعمت ہے؟ کیا پوری کائنات کا نظام اِس کی وجہ سے چل رہا ہے؟

جواب: میں صاحب علم تو ہوں نہیں کہ اِتنی باریک باتوں کو جان سکوں۔ صرف یہ جانتا ہوں کہ آپ ﷺ اللہ کے محبوب اور اللہ کے بعد سب سے بڑے ہیں۔ یہ بات میرے ذہن پر نقش ہے۔
آپ ﷺ کو اپنے حق میں میری دُعاؤں یا درود کی قطعی ضرورت نہیں۔ میں آپ ﷺ کا احسان مند ہوں کہ آپ ﷺ نے نہ صرف پیغامِ حق ہم تک پہنچایا بلکہ اپنی ذاتی زندگی میں تکلیفیں اُٹھا کر اِس پیغام کو اپنی ذات پر Implement (منطبق) کر کے بہترین نمونہ ہمارے لیے چھوڑا۔ آپ ﷺ کے اِس احسان کے جواب میں بطور اِظہارِ تشکر درود پاک پڑھا جاتا ہے۔
کیا "صلِّ علیٰ" کائنات کے نظام کو چلا رہا ہے؟ یہ میرے علم میں نہیں۔ میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ ہم دل میں آپ ﷺ کے احسان مند ہوں اور اِس احسان مندی کے اِظہار کے طور پر آپ ﷺ پر زیادہ سے زیادہ درود بھیجیں۔

سوال: عالم مثال کے اثرات عالم اسباب پر کیسے مرتب ہوتے ہیں؟

جواب: رُوح مِن جانب اللہ ہے۔ اُسے رب تعالیٰ کی طرف لوٹ جانا ہے۔ ہم اِس عالم اسباب میں جو ذکر اذکار اور اعمال کرتے ہیں اُن کے اثرات عالم مثال میں موجود ہمارے جسم مثالی پر پڑتے ہیں اور ہمارا جسم مثالی کمزور یا توانا ہوتا ہے۔ جوں جوں ہمارا جسم مثالی کمزور ہوتا ہے توں توں عالم اسباب میں ہمارے مادی جسم

کی رُوح کثیف ہوتی چلی جاتی ہے۔ ہم گناہوں میں ڈوبتے چلے جاتے ہیں اور ہماری باطنی آنکھ دھندلاتی چلی جاتی ہے۔ اِس کے برعکس جب ہمارا جسم مثالی صحت مند اور توانا ہوتا ہے تو ہماری رُوح لطیف ہوتی چلی جاتی ہے۔ اُس کی پرواز بڑھنے لگتی ہے اور ہماری نگاہ بہت دُور تک جانے لگتی ہے۔

عالم اسباب کے اثرات عالم برزخ پر مرتب ہوتے ہیں۔ عالم اسباب میں ہمارے اعمال دراصل ہماری آخرت کا فیصلہ کرتے ہیں اور یہی اعمال عالم مثال میں ہمارے جسم مثالی کی صحت کا فیصلہ کرتے ہیں ــــ اگر ہم اپنے جسم مثالی کو توانا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں عالم اسباب میں اپنی سوچ کو مثبت کرنا ہوگا جس کے نتیجے میں ہمارے اعمال بہتر ہوتے چلے جائیں گے۔ اعمال کا تعلق براہِ راست ہماری سوچ سے ہے۔ سب سے پہلے انسان کسی کام کا سوچتا ہے، پھر نیت و ارادہ کرتا ہے اُس کے بعد عمل کرتا ہے۔ جب سوچ Positive ہو جائے تو اعمال خود بخود ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ پھر ہمارا جسم مثالی توانا ہو جاتا ہے اور رُوح کی پرواز بڑھ جاتی ہے تب ہم پر انعامات کی بارش عالم اسباب میں بھی ہوتی ہے اور آخرت میں بھی ہوگی۔

رب کی رضا اور قرب

بڑی مشکل سے سمجھ آئی ہے کہ عبادت گزاری، پرہیزگاری اور تقویٰ ہے کیا؟

اگر انسان حقوق اللہ ادا کرلے، جو عبادات اُس پر فرض کی گئی ہیں اُنھیں پوری طرح ادا کرلے تو وہ عبادت گزار کہلائے گا۔

اگر انسان عبادت کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کاموں سے باز بھی رہے جن سے رب نے منع کیا ہے تو وہ پرہیزگار ہوجائے گا۔

یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ حرام کیا ہے اور حلال کیا ہے۔ لیکن وقت وہاں پیش آتی ہے جہاں حلال اور حرام میں بہت باریک سا فاصلہ ہوتا ہے۔ جب انسان عبادت گزار اور پرہیزگار ہو جاتا ہے تو وہ حلال اور حرام کے درمیان پائی جانے والی مشکوک اشیا سے بھی اجتناب کرتا ہے تاکہ اُس کی راہ کھوٹی نہ ہو جائے۔

امام ترمذی نے امام حسنؓ سے روایت کی، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو چیز شک میں ڈالے اسے چھوڑ کر اس چیز کو اختیار کرو جو شک میں نہ ڈالے بے شک سچائی سکون قلب کا باعث ہے اور جھوٹ انسان کو مضطرب اور پریشان رکھتا ہے۔(جامع ترمذی، حدیث 2518)

اس حدیث کی تشریح یہ ہے کہ جب حلال اور حرام کے درمیان موجود چیز کے بارے میں دل میں یہ شک پیدا ہونے لگے کہ یہ ٹھیک یا حلال ہے بھی یا نہیں...... تو اُس چیز کو ترک کر دینا چاہیے۔ علم کے بلند مقام پر فائز ہستیوں کے حالاتِ زندگی پڑھیں تو بڑی حیران کن بات سامنے آتی ہے کہ جہاں کسی شے میں حرام کی ملاوٹ کا ہلکا سا شائبہ بھی تھا وہ اُس سے بہت دُور رہتے تھے۔

حضرت بی بی رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا ایک بہت کمال کی دُعا فرمایا کرتی تھیں جو کبھی کسی اور ولی اللہ کو کرتے میں نے دیکھا، نہ سنا۔ شاید اسی لیے وہ علم کے بلند درجے پر پہنچیں۔ وہ یہ تھی:

"یا اللہ! دُنیا میں جو میرا حصہ ہے وہ اپنے دشمنوں کو عطا فرما دے اور آخرت میں میرا جو حصہ ہے وہ اپنے دوستوں کو عطا کر دے۔ میرے لیے تو بس تُو ہی کافی ہے۔"

دُعا کا یہ رنگ بہت کمال ہے۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ رشوت سے کمائی ہوئی دولت میں سے ایک پھوٹی

کوڑی دینے کو کوئی تیار نہیں ہوتا اور ایک بی بی رابعہ بصری صاحبہ رحمۃ اللہ علیہا ہیں کہ اپنے اعمال کا ثواب دوسروں کو دے رہی ہیں۔

اگر ہم واقعی اللہ کی دوستی چاہتے ہیں تو اپنی ذات سے باہر نکل آئیں۔ اپنی ذات کو ختم کر دیں۔ ایک بہت بڑے عہدے پر فائز ایک انسان کی ایسی باتیں میرے ذاتی علم میں آئیں کہ میں حیران رہ گیا کہ اتنے بڑے مقام پر بیٹھ کر ایک ایسا انسان لوگوں کے ساتھ خدا لگتا سلوک کیسے کر پائے گا جس کے نزدیک یہ اہم ہے کہ اُس کی اولاد کے لیے فلاں نے کام کیا یا نہیں، اُس کو Accommodate کیا یا نہیں۔ فقیر ان باتوں سے بہت بلند ہے۔ اُسے کبھی یہ شکایت نہیں ہوتی کہ "میرا بیٹا آپ کے پاس آیا تھا آپ نے اُسے بیٹھنے کے لیے کرسی نہیں دی۔ میری بیٹی کو آپ نے چائے کا نہیں پوچھا۔"

فقیر ان چھوٹی باتوں سے بہت اُوپر چلا جاتا ہے۔ اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے ہمیں اُس مقام تک جانا ہوگا جہاں انسان دوسروں سے گلے شکوے کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ کوئی ایسی بات مائنڈ نہیں کرتا جس کی وجہ سے اُس کی اپنی ذات یا Immediate family متاثر ہوئی ہو۔ درحقیقت اُس کے دل میں ایمان ہوتا ہے کہ میرا اور میری فیملی کا مالک رب تعالیٰ ہے۔ ان کی ضروریات، معاملات اور کام سب اللہ کے حوالے ہیں۔

فقیر تو بس یہ کام کرے گا کہ رات کی تنہائی میں رب کے حضور بیٹھ کر عرض کرے گا:

"یا باری تعالیٰ! آج سے میں نے اپنے تمام معاملات، اولاد، ماں باپ سب تیرے حوالے کیے۔ تُو ان کا بہترین نگہبان ہے اور مجھے یقین ہے کہ تُو میرے سارے معاملات میرے بہترین مفاد میں حل کردے گا۔ آج سے میرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔"

جب انسان اِس کامل یقین اور بھروسے سے اپنے معاملات رب کے حوالے کرتا ہے تو Ultimately اللہ بہتر ہی کرتا ہے۔

اگر اللہ کا قرب حاصل کرنے کا شوق ہے تو پھر اُس راہ پر چلے جائیے جہاں انسان کی ضروریات، کام کاج یوں اللہ کے سپرد ہو جاتے ہیں کہ پھر وہ پلٹ کر اُن کی طرف نہیں دیکھتا کیونکہ یہ بددیانتی ہے کہ معاملات اللہ کے سپرد کر کے پریشان ہوا جائے کہ کیا ہوگا۔ لیکن یاد رہے کہ کوشش ہم پر فرض ہے۔

ہمیں سب سے زیادہ شکایت یہ ہوتی ہے کہ فلاں شخص نے ہماری بے عزتی کر دی، ہمیں عزت نہیں دی، ہمیں صحیح طریقے سے Look after نہیں کیا حالاں کہ ہم اکثر و بیشتر یہ جملہ دہراتے رہتے ہیں کہ عزت دینے والا صرف رب ہے۔

ذرا غور کیجیے جب میری عزت، رزق، جان سب رب تعالیٰ کے اختیار میں ہے، کوئی شخص اُنھیں گھٹا نہ بڑھا سکتا ہے تو پھر گلہ کیسا کہ فلاں نے میری بے عزتی کر دی۔ ہمیں فیصلہ کرنا ہوگا کہ دونوں میں سے کون سی بات درست ہے "کسی نے میری بے عزتی کر دی" یا یہ کہ "عزت اور ذلت سب رب کے ہاتھ میں ہے"۔

جب رب تعالیٰ ہمیں عزت دینے پر آئے گا تو سارا جہان مل کر بھی اُسے روک یا گھٹا نہیں سکے گا۔ لہٰذا

ڈیانا کی موت کے وقت ایک دوست نے کہا "سرفراز! سمجھ نہیں آئی۔ ڈیانا کی دُنیاوی زندگی دیکھیں اور جنازہ دیکھیں۔" میں نے جواب دیا "رب تعالیٰ نے اپنی بات ثابت کی ہے کہ وہ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے۔"

عزت Demand کرنے سے نہیں ملتی بلکہ یہ Earn کی جاتی ہے۔ انسان کے اپنے رویوں اور افعال کی بنیاد پر اُس کی عزت کی جاتی ہے۔

سیدنا امیر معاویہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص چاہے کہ لوگ اُس کے لیے (تعظیم میں) اُٹھ کھڑے ہوں اُسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانا جہنم کر لے۔ (جامع ترمذی، باب ماجاء فی قیام الرجل للرجل، حدیث نمبر: 2754)

اگر اللہ کے قریب جانا ہے تو پھر ان قضیوں اور Demands سے نکلنا پڑے گا۔

سوال: 13 اگست 2013ء کو سید یعقوب علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے عرس مبارک کے موقع پر وہاں حاضری دے کر بہت رُوحانی تسکین حاصل ہوئی۔ افسوس! بہت سے لوگ اس سے فائدہ نہ اُٹھا سکے۔ ایسا کیوں؟

جواب: مجھے اپنی زندگی کا ایک رویہ یاد آ گیا۔ ماہِ رمضان میں جب ڈھول بجا کر جگانے والے آتے تو میری آنکھ کھلتی اور پھر بند ہو جاتی۔ اگلے روز میں مولانا صاحب سے جا کر پوچھتا ہوں کہ میں روزہ رکھنے کی سعادت سے محروم کیوں رہ گیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ لیکن کبھی کسی مولانا نے یہ نہیں کہا کہ بھائی! تم اپنے آپ کو خود درست کر لو۔ یہ مت سوچو کہ ڈھول بجا کر جگانے والے آئیں گے تو بیدار ہو جائیں گے۔

بھائی! جو عرس کے اس موقع سے فائدہ نہیں اُٹھا سکے وہ دراصل خود فائدہ اُٹھانا نہیں چاہتے تھے۔ اُن کی Priority (ترجیح) دوسری تھی۔

سوال: لیلۃ القدر عطائے رب ہے یا یہ جاگنے والے کو نصیب ہوتی ہے؟ کیا اس شب دُعائیں قبول ہوتی ہیں؟

جواب: درخت پر پکا ہوا پھل ٹپکتا ہے اور پکا ہوا پھل زیادہ مزے کا ہوتا ہے۔ پکے ہوئے پھل درخت سے گرتے ہی رہتے ہیں۔ یہ انسان کی اپنی کوشش اور فراست ہے کہ وہ جھولی پھیلائے اور عین اُس وقت درخت کے نیچے پہنچ جائے جب پھل نیچے گر رہا ہو تب وہ لازمی اُس کی جھولی میں آن گرے گا۔

لیکن اگر گھر میں بیٹھا شخص بغیر تگ و دو کیے اپنے نصیب کو دوش دے کہ یہ پھل تو میری قسمت میں تھا ہی نہیں بلکہ اُس کے نصیب میں تھا جو جھولی پھیلائے ہوئے ہے تو یہ نامناسب رویہ ہے۔

آپ جیسے نیک لوگ جو ماہِ رمضان کے آخری عشرے کی ہر طاق رات میں شب بیداری کرتے اور لیلۃ القدر تلاش کرتے ہیں وہ اللہ کی رحمتوں سے محروم نہیں رہتے۔

روایات کے مطابق قبولیت دُعا کا وقت اندھیرا پھیلنے سے لے کر صبح فجر تک ہے۔ جو شخص میری طرح عشاء کی نماز پڑھ کر سو جاتا ہے اور پھر فجر کے وقت اُٹھ کر نماز ادا کرتا ہے، رب تعالیٰ اپنی رحمت کے صدقے اُس انسان کی اتنی سی عبادت کو بھی رات بھر کی عبادت کے برابر Consider کر لیتا ہے۔

سوال: جمعہ کے روز دُعا کی قبولیت کا وقت کون سا ہے؟

جواب: ایک روایت کے مطابق جمعہ کے روز دُعا کی قبولیت کا وقت خطبے کی اذان کے وقت ہے۔ اس لیے درویش دوپہر 12 بجے مسجد میں جا کر بیٹھ جاتے ہیں اور مسلسل ذکرِ الٰہی میں مصروف رہتے ہیں، جونہی خطبہ کا وقت ہوتا ہے دُعا مانگ لیتے ہیں۔ ایک حدیث کے مطابق قبولیت کی وہ ساعت عصر کے بعد آخری وقت میں ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جمعہ کا دن بارہ ساعت کا ہوتا ہے۔ ان میں ایک ساعت (گھڑی) ایسی ہوتی ہے کہ اگر اس وقت کوئی مسلمان اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگے تو اُس کو ضرور دیا جاتا ہے۔ بس اُس گھڑی کو عصر کے بعد آخری وقت میں تلاش کرو۔ (سنن ابی داؤد شریف باب الاجابة ایة ساعتی ھی یوم الجمعة، حدیث 1035)

سوال: کیا قرآن پاک ترتیب سے پڑھنا ضروری ہے؟

جواب: تلاوتِ قرآن پاک افضل عبادت ہے۔ بہتر یہی ہے کہ انسان ترتیب سے قرآن پاک پڑھے اور قرآن پاک ختم ہونے کے بعد دُعا کرے "یا اللہ! یا رحیم! یا کریم! یا پروردگار! جو قرآن پاک میں نے تلاوت کیا اسے تیرے اور تیرے حبیب کریم ﷺ کی خدمت میں بطور نذر پیش کیا...... تُو اسے قبول فرما لے اور اس کا ثواب بطور ہدیہ آپ ﷺ کی رُوحِ مبارکہ کی خدمت میں پہنچا دے۔"

رب تعالیٰ دُعائیں سننے والا ہے۔ اس کلام پاک کی تلاوت کی برکت سے ہماری دُعائیں قبول فرمائے گا۔ انشاءاللہ!

سوال: غیبت اور مشورہ میں کیا فرق ہے؟

جواب: ہر ایسی بات غیبت ہے جو ہم کسی شخص کی غیر موجودگی میں کہتے ہیں، اگر اُس کی موجودگی میں کہیں تو اُس کی دل آزاری ہو گی۔

مشورہ وہ ہے جو انسان کسی کام یا معاملے کے سلسلے میں خود آ کر مانگتا ہے کہ مجھے یہ معاملہ درپیش ہے۔ آپ کی رائے کے مطابق مجھے کیا کرنا چاہیے؟

جب کوئی شخص ہم سے مشورہ مانگے اور ہم اُسے کوئی جواب دیں تو یہ جواب نہیں بلکہ دراصل ایک امانت ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی جس محلے میں رہتے تھے اُسی میں ایک تھانے دار بھی رہتا تھا۔ ماں باپ کے انتقال کے بعد اُس کے گھر ناپسندیدہ حرکتیں ہونے لگیں۔ اُس وقت چونکہ سوسائٹی کی Values کچھ اور تھیں۔ لہٰذا محلے داروں نے تھانے دار کی حرکتوں سے تنگ آ کر مولانا اشرف علی تھانوی سے مشورہ مانگا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ مولانا نے جواب دیا "اگر کوئی پراپرٹی ڈیلر اُس پولیس آفیسر کو مکان فروخت کرنے پر Convince کر لے تو میں وہ مکان خرید لوں گا۔ یوں وہ محلے سے چلا جائے گا۔"

پراپرٹی ڈیلر پولیس آفیسر کے پاس گیا اور جا کر زبان کا ہنر آزمایا کہ آپ اتنے بڑے پولیس آفیسر ہیں اور

اس پرانے محلے میں رہتے ہیں۔ یہ آپ کی شان کے خلاف ہے۔ آپ یہ مکان فروخت کر کے کسی ماڈرن کالونی میں گھر کیوں نہیں لے لیتے؟ پولیس آفیسر کافی حد تک Convince ہو گیا لیکن کہنے لگا کہ میں کل آپ کو حتمی جواب دوں گا۔ اگلے روز جب پراپرٹی ڈیلر نے پولیس آفیسر سے جا کر اُس کا فیصلہ جاننا چاہا تو اُس نے مکان فروخت کرنے سے انکار کر دیا اور وجہ یہ بتائی کہ میں نے محلے کے ایک نیک اور دین دار شخص مولانا اشرف علی تھانوی سے اس بابت مشورہ مانگا تھا۔ اُنھوں نے مجھے کہا ''شریف لوگ ماں باپ کی بنائی گئی جائداد کو فروخت نہیں کیا کرتے بلکہ اس میں اضافہ کرتے ہیں۔ اگر آپ کو کسی پوش علاقے میں گھر بنانا ہے تو ماں باپ کا بنایا ہوا گھر نہ بیچیے بلکہ ایک ایڈیشنل گھر بنا لیجیے۔'' میرے پاس ایڈیشنل گھر خریدنے کے لیے رقم موجود نہیں لیکن میں اپنے والدین کا یہ گھر فروخت نہیں کروں گا۔

پراپرٹی ڈیلر یہ سارا قصہ سن کر دنگ رہ گیا۔ غصے سے بولا ''جناب! مولانا اشرف علی تھانوی صاحب جنھوں نے آپ کو یہ مشورہ دیا اور جنھیں آپ اِس قدر نیک گردان رہے ہیں اُنھوں نے ہی مجھے آپ کے پاس اس مکان کی ڈیل کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ اُن کا یہ تضاد میری سمجھ میں نہیں آیا۔ چلو اُن کے پاس جا کر اِس کی وجہ دریافت کرتے ہیں۔ وہ دونوں صاحبان مولانا صاحب کے پاس گئے اور وجہ پوچھی تو مولانا نے بہت خوب صورت بات کہی کہ مکان خالی کرانا محلے والوں کی ضرورت تھی اور اِس کے لیے میں نے اپنے آپ کو Volunteer کیا تھا کہ جس قیمت پر بھی گھر فروخت ہوا میں خرید لوں گا۔ لیکن جب مالک مکان پولیس آفیسر میرے پاس مشورے کے لیے آئے تو وہ مشورہ میرے پاس امانت تھا جس میں میں خیانت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ان سے وہی بات کہی جو میں اپنے لیے پسند کرتا۔ اگر میرے ماں باپ کا گھر ہوتا تو میں کبھی اُسے فروخت نہ کرتا۔ اس لیے میں نے اپنی ضرورت کو پس پشت ڈال دیا اور وہی مشورہ دیا جو صحیح تھا۔

یاد رکھیے! مشورہ امانت ہے۔ ہم جب بھی کسی کو مشورہ دیں تو ہماری اپنی کوئی غرض، ضرورت یا Angle اس مشورے کو Colour نہ کرے۔ مشورہ ہمیشہ بہت محتاط ہو کر دینا چاہیے۔ جو ہم خود کرنا چاہیں ہمیشہ وہ مشورہ دیں۔

سوال: کیا مرشد بدلا جا سکتا ہے، جس طرح اگر ایک ڈاکٹر سے آرام نہ آئے تو ہم ڈاکٹر بدل لیتے ہیں؟

جواب: مرشد بدلا نہیں کرتے۔ رُوحانیت میں کہا جاتا ہے کہ اُوپر ایک رجسٹر ہے۔ جب کوئی آدمی کسی ولی اللہ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے یا دونوں کے دل میں یہ بات آجاتی ہے کہ میں اُن ولی اللہ کو اپنا مرشد مانتا ہوں اور وہ مرشد اُس آدمی کو اپنا مرید مان لیں تو اُس آدمی کا نام اُس رجسٹر میں ولی اللہ کے نام کے نیچے لکھ دیا جاتا ہے اور یہ نام یومِ حساب تک وہاں سے کٹتا نہیں۔

جب ہم کسی کو مرشد مان لیتے ہیں اور دل سے تسلیم کر لیتے ہیں کہ یہ ہمارے مرشد ہیں اور وہ ولی اللہ بھی دل سے ہمیں شاگرد یا مرید تسلیم کر لیتے ہیں خواہ زبان سے نہ کہیں تو بیعت ہو جاتی ہے۔ ہاتھ میں ہاتھ لے کر بیعت کرنے کا ظاہری اُسلوب کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اصل معاملہ دل کا ہے۔

ایک بار جب ہم کسی ولی اللہ کو دل سے مرشد مان لیں گے تو ہمارا نام اُس رجسٹر میں اُن کے مریدوں کی فہرست میں درج ہو جائے گا۔ البتہ حصولِ علم کے لیے ایک سے زیادہ اساتذہ سے فیض حاصل کیا جا سکتا ہے۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک سو سے زائد اساتذہ سے اکتسابِ فیض کیا لیکن اُن کے مرشد ایک ہی تھے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ مرشد کا مقام باپ سے بلند ہے، اس کی Logic یہ ہے کہ Father by choice نہیں لیکن مرشد By choice ہوتے ہیں۔ اس لیے بہت سوچ سمجھ کر مرشد کا انتخاب کرنا چاہیے۔ محض ایک ملاقات میں Convinced ہو کر اُنھیں مرشد بنانے کا فیصلہ نہیں کر لینا چاہیے۔ جہاں آپ کا دل مطمئن ہو جائے کہ آپ صحیح جگہ پر آ گئے ہیں وہاں کچھ وقت گزاریے۔ اُن درویش کو قریب سے دیکھیے اور اس کے بعد اُنھیں اپنا مرشد بنانے کا فیصلہ کیجیے۔ ایسا فیصلہ دیرپا اور درست ہو گا۔

سوال: کوئی ایسی عبادت یا عمل بتا دیجیے کہ رب راضی ہو جائے۔

جواب: رب تعالیٰ کو تین فعل بہت پسند ہیں:

1۔ غلام کو آزاد کرنا یا کرانا۔

2۔ بھوکے کو کھانا کھلانا۔

3۔ مقروض کا قرض ادا کرنا۔

آج کل غلاموں کا سلسلہ تو موقوف ہو گیا، اُن کی جگہ قیدیوں کو آزاد کرایا جا سکتا ہے۔ اس عید سے چار پانچ روز قبل ایک کھرب پتی فیملی میرے گھر آئی ہوئی تھی، اُنھیں میں نے یہ راہ دکھائی تھی کہ اللہ نے آپ کو بے حساب دولت سے نوازا ہے۔ اگر آپ ہر عید پر اُن قیدیوں کا جرمانہ ادا کر دیں جو اپنی سزائیں پوری کر چکے ہیں لیکن جرمانہ ادا نہ کرنے کی وجہ سے جیل میں ہیں تو جرمانہ ادا ہو جانے کی صورت میں وہ اپنی فیملیز کے ساتھ عید منا سکیں گے اور رب تعالیٰ کو آپ کا یہ عمل بہت پسند آئے گا۔

ایک فعل جو میں عموماً کسی کو بتاتا نہیں ہوں، میں نے اُن سے عرض کیا کہ عید کے دن دوپہر کا کھانا کسی یتیم خانہ میں کھایئے۔ آپ یتیم خانہ کی مینجمنٹ کو بتایئے کہ دوپہر کا کھانا آپ کے ذمہ ہے۔ آپ اُس کھانے کا انتظام اُتنے ہی شاندار انداز میں کیجیے جس قدر اپنے بیٹے کی دعوتِ ولیمہ کے لیے کرتے ہیں۔ اُس سٹینڈرڈ کے مطابق ٹیبلز لگوایئے، اُن پر امپورٹڈ کٹلری، ٹیبل کلاتھ، پھولوں کے گل دان سجایئے۔ اس تمام اہتمام کے ساتھ آپ اور آپ کی Wife یتیم بچوں کے ساتھ کھانا کھائیں۔ اُن صاحب نے فاؤنٹین ہاؤس میں ذہنی طور پر معذور چار سو بچوں کے ساتھ نہ صرف کھانا کھایا بلکہ اُن بچوں کے لیے دو دو سوٹ بھی سلوائے۔ اُنھوں نے ایک ٹیلر کو فاؤنٹین ہاؤس میں بٹھا دیا جس نے ہر بچے کے سائز کے مطابق اُس کے لیے دو دو سوٹ سلائی کیے۔ اُن صاحب نے بچوں کو لنچ اور لباس کے علاوہ عید گفٹس بھی دیے۔ عید کے بعد اُنھوں نے مجھے بتایا کہ مجھے نہیں معلوم کہ بچے کتنا خوش ہوئے لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ خوشی کے مارے میرے پاؤں زمین پر نہیں ٹک

رب۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی اندرونی خوشی میرے اندر بھر دی ہے جو مجھے پہلے کبھی میسر نہیں ہوئی۔

اللہ کو راضی کرنے کا ایک عمل یہ بھی ہے، آپ کرنا چاہیں تو بسم اللہ۔

سوال: آپ فرمایا کرتے ہیں کہ خلقِ خدا پر مہربان ہو جایئے، اُس کی مدد کیجیے، قربانی دیجیے۔ جو شخص خود مالی طور پر مستحکم نہیں وہ کسی کی کیا مدد کرے گا؟

جواب: ہم مسلمانوں نے اسلام کے اِبتدائی ایام میں وہ وقت بھی گزارا کہ بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھنے پڑے لیکن اس کے باوجود مسلمان ایک دوسرے کے لیے بہت مہربان تھے، ایک دوسرے کی بہت مدد کیا کرتے تھے۔

اگر ایک شخص کے پاس دولت ہے تو وہ اپنے مسلمان بھائیوں میں اُسے تقسیم کر دے۔ اگر کسی کے پاس صرف بھوک ہے تو وہ اُسے بھی دوسروں میں بانٹ سکتا ہے مثلاً مجھے بھوک لگی ہے، میرے پاس دو روٹیاں ہیں تو میں صرف ایک چوتھائی اپنے پاس رکھوں اور روٹی کے باقی سات حصے دوسرے بھوکے بھائی کو کھلا دوں۔

ایک صاحب جن سے UK میں بات ہوتی رہتی ہے اُن کا کہنا ہے "شاہ صاحب! میں اللہ کی راہ میں بہت خرچ کروں گا بس ذرا مجھے غربت سے نکل کر ارب پتی بن لینے دیں۔" اُن کی غربت کا عالم یہ ہے کہ شاہ عالم مارکیٹ میں شاید آٹھ یا نو دُکانیں اُن کی ملکیت ہیں جن کے اُوپر فلیٹس بھی ہیں، بانسوں والے بازار میں اُن کی حویلی ہے، ڈیفنس میں بھی دو چار پلاٹس ہیں لیکن ان سب کے باوجود وہ غربت کا رونا روتے رہتے ہیں۔

جو لوگ اللہ کا شکر اس انداز میں کرنا چاہتے ہیں کہ جو کچھ اُن کے پاس اللہ کا عطا کردہ ہے اُس میں دوسروں کو حصہ دار بنانا چاہتے ہیں تو اس کے لیے یہ شرط نہیں کہ آپ کے پاس بے تحاشا پیسہ ہو۔ اگر ہمارے پاس بھوک ہے تو ہم دوسروں کے ساتھ بھوک ہی بانٹ لیں۔

اعمال میں اخلاص کی اہمیت

ایک شخص نے ایک طوطا پال رکھا تھا۔ اُس نے اُسے بہت محنت سے بولنا سکھایا۔ وہ طوطا مالک کی غیر موجودگی میں گھر کی حفاظت کرتا اور مالک کی موجودگی میں اُس کی دُکان میں آنے والے Customers کو گائیڈ کرتا۔ ایک روز مالک طوطے کو یہ کہہ کر دُکان پر چھوڑ کر دوسرے شہر چلا گیا کہ دُکان کا خیال رکھنا۔ تھوڑی دیر بعد ایک چوہا دُکان میں داخل ہوا جس کے تعاقب میں ایک بلی تھی۔ چوہا بلی کے خوف سے بھاگا، بلی نے اُس پر جست لگائی جس کے نتیجے میں دُکان میں موجود روغن اور لوشن کے مرتبان گر کر ٹوٹ گئے۔ طوطے کو اس بات کا اِتنا صدمہ ہوا کہ اُس کے سر کے بال صدمے سے اُڑ گئے اور اس نے بولنا چھوڑ دیا۔ مالک واپس آیا، دُکان کی ناگفتہ بہ حالت دیکھی۔ طوطے سے کچھ جاننا چاہا تو اُسے خاموش پایا۔ یہ سب دیکھ کر مالک پریشان ہو گیا۔ طوطے کو مختلف عاملوں اور فقیروں کے پاس لے کر گیا لیکن سب کوششیں ناکام ہو گئیں اور طوطا کسی طور نہ بولا۔ کافی دن گزر گئے۔ ایک روز اتفاقاً دُکان کے سامنے سے ایک ایسا شخص گزرا جس کے سر پر کوئی بال نہ تھا۔ طوطے نے اپنے جیسے ایک گنجے شخص کو دیکھا تو بے ساختہ بولا" بھائی! کیا تم سے بھی دو تین مرتبان گر کر ٹوٹ گئے تھے جو تم گنجے ہو گئے؟"

ہم اپنے اور دوسروں کے ظاہری اعمال کی بنیاد پر اندازہ کر لیتے ہیں کہ یہ ہمارے جیسا انسان ہے جب کہ ہمارے اعمال کا اِنحصار ہماری نیتوں پر ہے۔ جس طرح دو ہرن ایک جیسی گھاس کھاتے ہیں لیکن ایک ہرن جو گھاس کھاتا ہے وہ جزوِ بدن بن جاتی ہے اور باقی ضائع ہو جاتی ہے جب کہ دوسرا ہرن جب وہی گھاس کھاتا ہے تو اُس کے جسم میں کستوری بن جاتی ہے۔ اگرچہ ہمارے اعمال اور عبادات ایک سے دکھائی دیتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اگر ایک ولی اللہ نماز پڑھتا، روزے رکھتا اور رب کو پکارتا ہے اور مجھ جیسا گناہ گار شخص بھی نماز پڑھتا، روزے رکھتا اور رب کو پکارتا ہے تو دونوں کا عمل یکساں ہے۔ بظاہر تو دونوں کا عمل ایک جیسا ہے، دونوں ایک جیسے انسان ہیں لیکن نیتوں میں فرق کی وجہ سے وہ ظاہری عمل ایک جیسا نہیں رہا۔ میری نیت میں فتور ہے۔ میری تمام عبادت، ریاضت اور اعمال ریاکاری سے بھرے ہیں کہ لوگ مجھے نیک اور عبادت گزار سمجھیں، مجھے جھک کر سلام کریں کہ اس سے میرا نفس پھلتا پھولتا ہے جب کہ فقیر ہر غرض سے پاک ہو کر رب کو پکارتا ہے۔ اس میں تو یہ غرض بھی نہیں ہوتی کہ میرا رب مجھ سے راضی ہو جائے۔ وہ تو

رب سے یہ توقع بھی نہیں رکھتا اور نہ یہ صلہ مانگتا ہے کہ عبادت کے نتیجے میں رب اُسے قریب کر لے۔ وہ تو صرف یہ سوچ کر رب کو پکارتا ہے کہ رب میرا ہے اس لیے میں اُسے پکاروں۔ اس لیے کسی کے ظاہری اعمال کو دیکھ کر بھی یہ گمان نہ کریں کہ چونکہ میں بھی اُس نیک انسان کی طرح نماز پڑھتا ہوں اِس لیے میں بھی اُس جیسا ہوں۔ یاد رہے کہ آپ ﷺ کے فرمان کے مطابق اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔

بہت ضروری ہے کہ ہم عبادات کو صلے کی توقع سے خالی کر دیں۔ ہماری عبادات میں کہیں یہ ڈر نہ ہو کہ میں اس لیے عبادت کروں تا کہ جہنم سے نجات مل جائے اور نہ ہی یہ لالچ ہو کہ مجھے جنت مل جائے اور نہ یہ خوف ہو کہ چونکہ میرے رب کا حکم ہے کہ میری عبادت کرو اس لیے میں اس حکم کی تابع داری کروں تا کہ کل کو مجھے سزا نہ ملے، اس لیے بھی عبادت نہ کروں تا کہ رب مجھ سے راضی ہو جائے۔ عبادت کے پیچھے صرف یہ جذبہ ہو کہ میرا رب اتنا مہربان ہے کہ بن مانگے مجھے عطا کرتا ہے، وہ اِتنا مہربان ہے کہ اُس نے مجھے مکمل حالت میں پیدا کیا، میرا کوئی عضو ضائع بھی تو ہو سکتا تھا۔ میرا رب اِتنا عظیم ہے کہ میں صبح سے شام تک اُس کی سرکشی کرتا ہوں، اُس کی کوئی بات نہیں مانتا لیکن وہ اِتنا ظرف والا ہے کہ اُس نے کبھی میری گرفت نہیں کی۔

اگر کوئی شخص مجھ سے صرف دو روپے مانگ لے تو میرا پہلا سوال یہ ہوتا ہے ”یہ پیسے تمھیں کیوں چاہئیں؟“ وہ جواب دیتا ہے ”میں بھوکا ہوں۔“ میں اُس کی بات کا یقین نہیں کرتا اور کہتا ہوں ”نہیں۔ تم نے اِن دو روپوں سے نشہ کرنا ہوگا۔“ لیکن میرا رب اِتنا عظیم ہے کہ کبھی نہیں پوچھتا کہ میں تمھیں تمھارے مانگے اور بن مانگے جو رزق عطا کرتا ہوں تم نے اُسے کس کس غلط کام پر خرچ کیا۔ اب مزید رزق عطا کروں گا تو کیا کرو گے؟

جو رب اِتنا عظیم ہے وہ Deserve کرتا ہے کہ بغیر کسی لالچ یا غرض کے صرف اور صرف اُسے لائق عبادت سمجھ کر اُس کی عبادت کی جائے۔ اگر عبادت میں یہ رنگ آ جائے تو یہ بہت کمال کی بات ہے۔

اگر ریاکاری، دکھاوا، غرض اور لالچ ہماری عبادت سے نکل جائے تو پھر اُس عبادت کا ذکر کبھی ہماری زبان پر نہیں آئے گا کیونکہ جب انسان کسی فرض کی ادائیگی کرتا ہے تو وہ اُسے جتاتا نہیں بلکہ شکر ادا کرتا ہے کہ میں کسی کا حق ادا کر سکا۔ تب عبادت کے بعد انسان میں تکبر کے بجائے شکر گزاری اور عاجزی کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے اور انسان عبادت کو خود اپنی ذات سے بھی چھپانے لگتا ہے۔ خواتین وحضرات! میں اور مجھ جیسے سیاہ کار انسان اپنے اندر مختلف بت چھپائے ہوئے ہیں۔ کوئی اپنے اندر علم کے بت کی پوجا کر رہا ہے۔ اُسے یہ تکبر ہے کہ میرے پاس بہت علم ہے۔ کوئی شخص اپنے اندر موجود انا کے بت کی پوجا کرتا ہے۔ کوئی اِس زعم میں ہے کہ کوئی مجھے آنکھ اُٹھا کر دیکھے کیسے..... ! کسی شخص کو اپنی دولت کا تکبر ہے۔

میرے نزدیک تکبر کی بدترین شکل ”عاجزی کا تکبر“ ہے۔ یہ تکبر ہمیں کسی کی تنقید برداشت نہیں کرنے دیتا۔ کوئی مجھ پر اُنگلی اُٹھائے، میں یہ گوارا نہیں کرتا لیکن جب میں کسی سے ملتا ہوں تو جھک کر ملتا ہوں۔

اگر ہم نے اس انداز میں عبادت کر لی جو میں نے ابھی عرض کیا تو ہمارے اندر موجود تکبر کے بت ایک

ایک کر کے ٹوٹنے لگیں گے، پھر وہ وقت آئے گا جب مومن کی سی عاجزی ہم میں پیدا ہو جائے گی۔ یہ عاجزی رب کو پسند آتی ہے۔ ظاہری عاجزی رب کو پسند نہیں آتی کیونکہ اس میں تکبر پوشیدہ ہوتا ہے۔

سوال: رب کی راہ پر چلتے ہوئے Level of motivation میں Ups and downs آتے رہتے ہیں۔ کیا یہ لیول Permanent نہیں ہو سکتا؟

جواب: آپ ﷺ کے فرمان کے مطابق خلافِ فطرت دُعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ ہماری فرسٹریشن کا ایک سبب یہ ہے کہ ہم دُعا کو غلط سمجھتے ہیں۔ جس طرح سپاہی کا Main weapon اُس کی رائفل ہے اور توپ خانہ کا فائر اُس کا Supporting fire ہے۔ جب وہ بہت مشکل میں گھر جائے اور دشمن کا دباؤ بہت بڑھ جائے تو وہ توپ خانہ کی گولہ باری کرا کے دشمن کے پریشر کو کم کر دیتا ہے۔

بالکل اِسی طرح ہمارا Main weapon کوشش (Effort) ہے جب کہ دُعا Supporting weapon ہے۔ پوری دیانت داری سے بھرپور Effort کرنے کے بعد ہم دُعا کریں ”یا باری تعالیٰ! تو نے مجھے جو ذہنی و جسمانی صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں اُن سے پوری طرح کام لے کر میں نے بھرپور Effort کی۔ اب تو مجھے اس میں کامیابی عطا فرما دے۔“

لیکن ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم کوشش کیے بغیر دُعا کرنے کو ترجیح دیتے ہیں حالاں کہ رب تعالیٰ نے ہر شے کے جوڑے پیدا کیے۔ سکھ کے ساتھ دُکھ، خوش حالی کے ساتھ تنگ دستی، عزت کے ساتھ ذلت اور راحت کے ساتھ تکلیف ہے۔ ہماری زندگی دُکھ اور سکھ سے رقم ہے۔ اس کی جہاں Strengths ہیں وہاں اس کی Down sides بھی ہیں۔

میں جن بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا، اُن کی خدمت میں ایک روز ایک صاحب نے آ کر عرض کیا ”میں آج کل بہت مصیبت میں ہوں۔“ یہ سن کر اُن بزرگ کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات بھانپ کر میں نے اُن صاحب کو اشارہ کیا کہ دوبارہ یہ بات نہ کریں لیکن میرے منع کرنے کے باوجود جب اُن صاحب نے دوبارہ اور سہ بارہ ایک ہی بات کی تکرار کی تو اُن بزرگ نے قدرے جلال میں ایک ایسی بات کہی جو میرے لیے تو انتہائی سبق آموز تھی کہنے لگے ”میاں! اچھے دن گزارنے کے لیے تم تھے، بُرے دن تمھاری جگہ کوئی اور گزارے گا کیا؟“

اُس دن کے بعد سے میرے دل سے نکل گیا کہ زندگی کی Down side پر کوئی ملال بھی ہونا چاہیے۔ زندگی کا Natural formation مختلف Opposite کیفیات و حالات سے رقم ہے۔ اگر اچھا وقت میں نے دیکھا ہے تو بُرا وقت بھی مجھے ہی گزارنا ہے۔ جس مسکراتے چہرے کے ساتھ میں نے اچھے وقت کو خوش آمدید کہا تھا اُسی Smiling face سے بُرے وقت کا استقبال کروں حتیٰ کہ میری زبان پر اُف تک نہ آئے۔

یہ اُتار چڑھاؤ ہماری زندگی کا حصہ ہے۔ ہماری باڈی کیمسٹری Consistent نہیں رہتی۔ ماحول کا اثر، دوسرے Planets اور موسم کا اثر، سب ہماری زندگی پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ وہ اثرات ہمارے موڈ کو

Change کرتے اور ہمارے Level of motivation کو Affect کرتے رہتے ہیں۔ جب تک ہم اُس مقام پر نہیں پہنچ جاتے کہ جہاں ہم ہر طرح کے حالات کو ہنسی خوشی قبول کرنا سیکھ جائیں تب تک Level of motivation میں اُتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے Level of motivation میں فرق نہ آئے تو ہم خود کو یقین دلا دیں کہ رب بڑا مہربان ہے، وہ میرے ساتھ بُرا کر ہی نہیں سکتا۔ اُس کی طرف سے عطا ہونے والی ہر چیز کو ہمیں مسکراتے چہرے کے ساتھ قبول کرنا ہے اگر ہم Level of motivation کو Consistent رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اِس مقام پر آنا ہوگا۔

سوال: مایوسی کفر ہے یا گناہ۔ بعض اوقات پوری نہ ہونے والی دُعائیں اور خواہشات انسان کو مایوس کر دیتی ہیں۔ اِس مایوسی سے کیسے نکلا جا سکتا ہے؟

جواب: مایوسی کفر ہے۔ جب انسان حالات، دُنیا اور سب لوگوں کو اپنی خواہشات کے مطابق چلانے کی کوشش کرتا ہے کہ سب لوگ مجھ سے اُس طرح Behave کریں جو مجھے Suit کرتا ہے اور جس سے میری خواہشات کی تکمیل ہو جائے یا انسان یہ توقع رکھے کہ حالات ہمیشہ ایسے رہیں گے کہ میری خواہشات پوری ہوتی رہیں گی۔ چونکہ یہ ہو نہیں سکتا کیونکہ Unnatural ہے اِس لیے مایوسی در آتی ہے۔

اِس کائنات کے Jigsaw puzzle میں رب ہر Piece کو اپنی جگہ پر رکھتا ہے تا کہ کائنات اپنی اصل جگہ پر قائم رہے۔ جب ہم بحیثیت ایک Piece دوسرے Piece کی جگہ لینے کی کوشش کرتے ہیں تو خرابی پیدا ہوتی ہے، ناکامیاں آتی ہیں اور مایوسی جنم لیتی ہے۔ لیکن متوکل لوگ مایوسی سے بچے رہتے ہیں۔

توکل کی تین گھاٹیوں میں سے آخری گھاٹی ''تفویض'' ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسان کے تمام ارادے، آرزوئیں، چاہتیں اور خواہشات رب کے ارادوں، چاہتوں اور خواہشات کے تابع ہو جاتے ہیں۔ یہ مقام صرف آپ ﷺ کو حاصل ہوا۔

کوشش کرنی چاہیے کہ جس حد تک ممکن ہو انسان توکل میں آگے جائے اور اپنے ارادوں اور خواہشات کو رب تعالیٰ کے ارادوں اور خواہشات کے ماتحت کر دے۔ ایسا انسان مایوسی سے بچا رہے گا۔

سوال: Personality development کے لیے کیا کیا جائے؟

جواب: یہ ایک ایسا Subject ہے جس کے لیے کئی گھنٹے درکار ہوں گے لیکن مختصراً عرض کر دوں۔ ہم لوگ اپنی اولاد کو Textbook پڑھنے کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ ایک Tunnel vision میں چیزوں کو دیکھ پاتے ہیں اور یہ Tunnel vision آگے چل کر اُن کے آگے بڑھنے میں رُکاوٹ بنتا ہے۔

انسان کی کامیابی میں ٹیم سپرٹ کے ساتھ ساتھ سپورٹس مین سپرٹ بھی بہت ضروری ہے جو ہمارے بچوں میں پیدا نہیں ہو پاتی کیونکہ ہم اپنے بچوں کو کھیلنے کی اجازت ہی نہیں دیتے۔ ہم اپنے بچوں کو Textbooks کے علاوہ کچھ پڑھنے کی ترغیب نہیں دلاتے حالانکہ مطالعہ سے وہ بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں لیکن ہم اپنے بچوں کو صحت مند مطالعہ سے Deprive کرتے ہیں۔

جب تک انسان کا Vision اور Mental horizon (ذہنی اُفق) Broad (وسیع) نہیں ہوتا وہ اپنی زندگی میں کامیابی کی شاہراہ پر قدم اُٹھانے کے لائق نہیں ہو پاتا۔

ایک زمانہ تھا جب UK تعلیم میں بہت آگے تھا لیکن ایک اندازے کے مطابق اس وقت امریکہ تعلیم میں UK سے پچاس سال آگے چلا گیا ہے کیونکہ وہاں کا طریقہ تعلیم انسان کو اندر سے Develop کرتا ہے، وہاں انسان کی Ability کا Test ہے، Memory کا نہیں۔ جب کہ پاکستان میں Memory کا Test ہے۔

مجھے امریکہ میں کچھ کورسز کرنے اور دو چار یونیورسٹیز میں بطور وزٹنگ فیکلٹی لیکچر دینے کا اتفاق ہوا۔ اس دوران میں نے دیکھا کہ وہاں Case study-based education ہے۔ مثال کے طور پر مارکیٹنگ پڑھاتے ہوئے پروفیسر جب Price theory کی بات کرے گا تو وہ پرائس تھیوری کی Definition بیان کر کے Explain کرے گا کہ کسی بھی Product کی Price مینوفیکچرر کے بجائے مارکیٹ Determine کرتی ہے۔ اِس کے بعد وہ تمام کلاس کے گروپس بنا دے گا جسے ہم گروپ سٹڈی کہتے ہیں۔ ہر گروپ میں ایک سٹوڈنٹ لیڈر ہوگا۔ پروفیسر اُنھیں مختلف اداروں کے Case دے کر Pricing کرنے کو کہے گا۔ مثلاً جینو موٹرز نے تھنڈر موٹر کے نام سے کار متعارف کرائی ہے اُس کی Pricing کریں۔ لیور برادرز نیا شیمپو لے کر آیا ہے آپ اُسے کس قیمت پر بیچیں گے؟

اگر کلاس میں 45 سٹوڈنٹس ہیں تو 10+1 کا گروپ بنے گا جن میں ایک سٹوڈنٹ لیڈر ہوگا۔ ہر Case پر Paper لکھا جائے گا۔ ہر سٹوڈنٹ اپنے Views دے گا۔ Discussion ہوگی اور Finally وہ Paper پروفیسر کو Submit کر دیا جائے گا جسے بعد ازاں گروپ لیڈر ساری کلاس کے سامنے Explain کرے گا بلکہ پروفیسر اور باقی ساری کلاس کی طرف سے اُٹھائے گئے مختلف سوالات اور اعتراضات کا جواب بھی دے گا اور اپنے Paper کو Defend بھی کرے گا۔ اِس سارے عمل کے دوران سٹوڈنٹس جو کچھ سیکھ رہے ہیں اُس کے نتیجے میں اُن میں Application اور Mind application آ جائے گی۔ Discussion کی وجہ سے اُن میں ایک دوسرے کو Tolerate کرنے کا جذبہ پیدا ہوگا اور ٹیم ورک کی بدولت وہ ایک دوسرے کو سپورٹ کرنا اور ایک Common goal کے لیے کام کرنا سیکھ جائیں گے۔ یہ Personality grooming کا ایک Aspect ہے۔

Personality grooming صرف اُسی صورت ہوگی جب گھر اور سکول میں بچوں کو ایسا ماحول Provide کیا جائے جہاں وہ مطالعہ پر زور دیں محض Textbook پڑھنے پر نہیں۔ جس زمانہ میں میں Cardiff University سے ایم بی اے کر رہا تھا تو لائبریری میں چار سے پانچ گھنٹے گزارا کرتا تھا۔ امریکہ میں آج بھی سٹوڈنٹ آٹھ سے دس گھنٹے لائبریری میں گزارتا ہے۔ وہ Textbook نہیں پڑھتا بلکہ اس Subject سے Related پیپرز، آرٹیکلز، نیوز پیپرز سب Study کرتا ہے۔ یوں وہ اپنے Subject کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہے لیکن اُسے Textbook قطعاً نہیں آتی۔ اس کے برعکس ہم اپنے Subject کو

Memorise کیے ہوتے ہیں جس کا نقصان یہ ہے کہ جب ہم پریکٹیکل لائف میں جاتے ہیں تو انٹرویو میں فیل ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کسی اہم پوسٹ کے لیے سینئر ایگزیکٹو نے اُمیدواروں کو Appoint کرنا ہے تو انٹرویو بورڈ دو Candidate سینئر ایگزیکٹو کو Refer کردے گا۔ جو اُن دونوں اُمیدواروں سے کبھی یہ نہیں پوچھے گا کہ آپ نے کیا پڑھا۔ بلکہ وہ اُس سے دیگر مختلف سیاسی وسماجی اُمور پر گفتگو کرے گا۔ جب وہ Candidate سے بات کر رہا ہوگا تو اُس کی Personal traits دریافت (Discover) کرتا چلا جائے گا۔ آخر میں کہے گا Thank you very much. See you! ۔آپ کل کلب میں لنچ میرے ساتھ کیجیے گا۔ لنچ کے دوران وہ اُس سے دُنیا بھر کی باتیں کرے گا۔ اِس کے بعد وہ اُسے اپنے گھر ڈنر پر Invite کرے گا یوں اُس اُمیدوار کا اندر کھل کر سینئر ایگزیکٹو کے سامنے آجائے گا۔

Qualifications کچھ معنی نہیں رکھتیں۔ اداروں کو محض کوالیفائیڈ نہیں بلکہ Learned persons درکار ہوتے ہیں۔ لیکن ہم اپنے بچوں کو کوالیفائیڈ تو بناتے ہیں Learned person نہیں۔ ہم اپنے بچوں کو مختلف میگزین، پیپرز اور ریسرچ پیپرز مہیا کیا کریں تا کہ اُنھیں نہ صرف اپنے Subject کے بارے میں مکمل علم ہو بلکہ اُن میں Vision بھی پیدا ہو اور اُن کا Mental horizon (ذہنی اُفق) بھی Broad ہو سکے۔ یہی چیز اُن کی شخصیت کو Impressive (متاثر کن) بنائے گی۔

سوال: بعض اوقات انسان ماضی میں کیے گئے گناہوں سے توبہ تو کر لیتا ہے لیکن اُن کی یاد ذہن سے محو نہیں ہوتی۔ کیا اِسی کا نام توبہ ہے؟

جواب: ایک روز حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس گئے اور اُنھیں کافی ملول و رنجیدہ پایا۔ وجہ دریافت کرنے پر اُنھوں نے بتایا کہ ایک نوجوان نے یہاں مناظرے اور بحث کی صورت میں مجھ سے پوچھا "توبہ کیا ہے؟" میں نے اُسے جواب دیا "گزشتہ گناہوں پر شرمندگی وندامت اور آیندہ گناہوں سے دُور رہنے کے وعدہ کا نام توبہ ہے۔" اُس نوجوان نے سوال کیا "کیا سابقہ گناہوں کو بھلا دیا جائے؟" میں نے کہا "نہیں، اُن کو یاد رکھا جائے۔" میرا یہ جواب سن کر وہ نوجوان بولا "آپ غلط کہتے ہیں، سابقہ گناہوں کو بھلا دینا ہی توبہ ہے۔" یہ واقعہ سنانے کے بعد حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا "آپ کی اِس بارے میں کیا رائے ہے؟" حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا "میرے خیال میں وہ نوجوان بھی ٹھیک کہہ رہا تھا۔"

دراصل جب ہم گناہ کر رہے ہوتے ہیں تو ہم حالتِ جفا میں ہوتے ہیں...... ہم اللہ تعالیٰ سے جفا کر رہے ہوتے ہیں۔ لیکن جب ہم توبہ کر لیتے ہیں تو ہم حالتِ جفا سے حالتِ وفا میں چلے جاتے ہیں۔ ایسے میں اگر ہم نے اپنی حالتِ جفا بھلا دی تو حالتِ جفا میں لوٹ جانے کا خدشہ باقی رہے گا لیکن اگر حالتِ وفا میں حالتِ جفا یاد رہی تو ہمیں یہ چبھن ہوتی رہے گی کہ ہم سے غلطی ہوئی تھی۔ رب سے جفا کرنے کی شرمندگی وندامت ہمیں

دوبارہ حالتِ جفا میں جانے سے روکے گی۔ یوں گناہوں کا یاد رہنا اِس Sense میں مبارک ہے کہ یہ ہمیں دوبارہ گناہوں کی طرف مائل ہونے سے روکے گا۔

سوال: Old age میں ذریعہ معاش کے لیے سرمایہ کاری کے کون سے ذرائع ہو سکتے ہیں؟

جواب: الحمد للہ! ہم مسلمان ملک میں رہتے ہیں۔ اسلام کے نفاذ کے ساتھ ساتھ اِس بات کو Ensure کرنا کہ اِس میں رہنے والوں کے تمام چلن اسلام کے مطابق ہوں، حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اگر حکومت کچھ ذرائع کے بارے میں یہ فتویٰ جاری کر دے کہ اِس میں سود کا کوئی عنصر شامل نہیں اور یہ حلال ہیں تو ہمیں اُن فتاویٰ کو تسلیم کر لینا چاہیے کیونکہ کوئی بھی فتویٰ جاری کرنے کے بعد اِس کا سارا بوجھ یا گناہ حکومت پر ہوتا ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل جس بھی ذریعہ سرمایہ کاری کو سود سے پاک قرار دے وہ Safe ہے۔ آپ اُس میں سرمایہ کاری کر سکتے ہیں۔

سوال: اگر مرشد دُور ہوں اور مرید کسی مشکل میں ہو اور کسی مسئلہ کا حل چاہتا ہو تو کیا وہ مرشد کا تصور کر کے اپنا مسئلہ اُن کے سامنے بیان کر سکتا ہے؟

جواب: تصور نہ کیجیے کیونکہ یہ بات تو ہم پرستی میں آئے گی لیکن اُن کی طرف توجہ باندھ لیجیے اور بغیر تصور کے اُن سے اپنا مسئلہ بیان کیجیے۔ اگر آپ کے مرشد کامل ہیں تو یقینی طور پر یا تو آپ کے ذہن میں اُس مسئلہ کا حل آجائے گا یا آپ کو خواب میں آکر اُس مسئلہ کا حل بتا دیں گے۔ اگر آپ کے مرشد وصال پا چکے ہوں یا دُور ہوں تو عشاء کی نماز کے بعد دو رکعت نفل پڑھیں۔ اِس کے بعد آنکھیں بند کر کے اپنے مرشد کی طرف رُجوع کریں اور اُن کا پورا نام لے کر اُن سے مخاطب ہو کر کہیے کہ مجھے یہ Guidance چاہیے۔ آپ مجھے گائیڈ کر دیجیے۔ اُسی وقت ذہن میں Guidance آجائے گی یا وہ خواب میں آکر بتا دیں گے بشرطیکہ وہ کامل فقیر ہوں۔

نیتِ اعمال

فی زمانہ ہمارے جو احوال ہیں اِس پر ایک بڑا پرانا لطیفہ یاد آ گیا جو مجھے امجد اسلام امجد نے سنایا تھا۔ یہ کچھ یوں ہے کہ دو دوست تھے ایک ہندو اور ایک مسلمان۔ دونوں سنگاپور میں مقیم تھے۔ ایک شام باہر نکلے اور Drink کرنا شروع کر دیا۔ اتفاق سے ہوا بند تھی۔ موسم خاصا Hot اور Humid تھا۔ Drink کرنے کی وجہ سے اُنھیں اور بھی گرمی لگی۔ اُنھوں نے سوچا کہ کسی ٹاپ سٹوری پر بیٹھ کر Drink کرتے ہیں تا کہ ہوا نہ ہونے کے باوجود ہوا لگتی رہے۔ وہ لفٹ میں سوار ہو کر ٹاپ سٹوری پر پہنچے اور Drink کرنے لگے۔ ہوا کی وجہ سے نشہ دو آتشہ ہو گیا اور بحث چھڑ گئی۔ مسلمان نے ہندو دوست سے کہا کہ تم اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے بتوں کو پوجتے ہو، بہتر ہے کہ تم مسلمان ہو جاؤ اور ایک رب کی عبادت کرنا شروع کر دو۔ ہندو نے اپنے بھگوان کو Defend کرنا شروع کر دیا۔ دونوں اپنے اپنے موقف ٹھیک ہونے پر ڈٹے ہوئے تھے اور کوئی قائل ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ آخر بحث کو سمیٹنے کے لیے طے یہ پایا کہ دونوں یکے بعد دیگرے اِس ٹاپ سٹوری سے چھلانگ لگاتے ہیں جس کا مذہب سچا ہو گا اُس کا رب یا بھگوان اُسے بچا لے گا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ پہلے کون چھلانگ لگائے۔ ٹاس کیا گیا جس کے مطابق ہندو کو پہلے چھلانگ لگانا تھی۔ ہندو نے بھگوان کے حضور پرارتھنا کی "اے بھگوان! تُو میری رکھشا کیجیو، میں تیرے نام کی بلندی کے لیے یہ سب کر رہا ہوں۔ اگر میں مر گیا تو تیرا نام نیچا ہو جائے گا۔" اِس پرارتھنا کے بعد اُس نے جے بھگوان کا نعرہ لگایا اور نیچے چھلانگ لگا دی۔ مسلمان نے اُسے نیچے جاتے دیکھا تو ہاتھ جھاڑ کر بولا "خس کم جہاں پاک۔" مسلمان واپس آنے لگا تو سوچا کہ دیکھوں تو سہی کہ اِتنی بلندی سے گر کر ہندو کے جسم کے کتنے ٹکڑے ہوئے ہیں۔ اُس نے نیچے جھانکا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ہندو اپنے کپڑے جھاڑ کر اُٹھ کر کھڑا ہو رہا ہے۔ جیسے ہی مسلمان دوست کو دیکھا، چلا کر بولا۔ "اب تم لگاؤ چھلانگ۔" مسلمان نے یہ سنا تو اللہ کے حضور رونا پیٹنا شروع کر دیا "یا اللہ! میں تیرے نام کی عظمت کے لیے یہ سب کر رہا تھا۔ یہ مقصد تھوڑی تھا کہ واقعی چھلانگ لگاؤں لیکن اب تو میں پھنس گیا ہوں اس لیے مہربانی فرما کر تُو میری مدد کر اور فرشتے بھیج جو مجھے زمین پر گرتے ہی اُٹھا کر کھڑا کر دیں۔" کافی دیر تک اللہ کے حضور دُعا کرنے کے بعد اُس نے دوسری طرف رُخ موڑا اور ہاتھ جوڑ کر بولا "بھگوان! تُو بھی میرا خیال رکھیو۔"

مسلمانوں کے احوال بھی کچھ اسی حد تک پہنچ گئے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے دُنیاوی کام حل ہونے چاہییں خواہ کوئی بھی طریقہ اختیار کرنا پڑے۔ خواہ کسی بھگوان کے حضور ہی درخواست کرنی پڑے، چاہے کسی جن بھوت یا چڑیل کے پاؤں پکڑنے پڑیں یا کالے جادو کا سہارا ہی لینا پڑے حالاں کہ ہم جانتے ہیں کہ کالا جادو کرنے اور کرانے والے کا ایمان باطل ہو جاتا ہے لیکن ہم پھر بھی دُنیاوی کام کرانے کے لیے کالے جادو کا سہارا لیتے ہیں۔

انسان راہ ہدایت اُس وقت تک نہیں پکڑ سکتا جب تک دُنیا کی محبت اُس کے دل سے نکل نہ جائے۔ عہدہ، اختیار، مال و دولت، آسائش، اولاد سب دُنیا کی محبت کے زمرے میں آتے ہیں۔

جب ہم بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں "یا رسول اللہ ﷺ! میرے ماں باپ، اولاد، مال سب آپ پر قربان۔" اِسی سے اندازہ لگا لیجیے کہ دُنیاوی محبت کس قدر کم تر ہے لیکن ہم اپنی دُنیا سے محبت کو سپورٹ کرنے کے لیے بہت سی Justifications اور دلائل گھڑتے ہیں مثلاً یہ کہ ہم جو دُعا کرتے ہیں ربنا اتنا فی الدنیا حسنة و فی الاخرة حسنة وقنا عذاب النار۔ اس میں بھی تو پہلے دُنیا اور پھر آخرت کی بھلائی مانگی گئی ہے۔ ہم اِس دُعا کی تفسیر یوں کرتے ہیں "اے اللہ! ہمیں دُنیا کا مال بھی بے پناہ عطا کر دے اور آخرت کا مال و زر بھی بے پناہ دے دے۔" ہم دُعا کے اصل مفہوم کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے "یا اللہ! ہماری دُنیا بھی خوب صورت کر دے اور آخرت بھی۔"

دُنیا مال و زر سے خوب صورت نہیں ہوتی بلکہ اُن اعمال سے خوب صورت ہوتی ہے جن کی بنیاد اخلاص پر ہو۔ پُر اخلاص اعمال کا جو صلہ اللہ عطا کرتا ہے اِس کا ہلکا سا عکس ہمیں اُس وقت دکھائی دیتا ہے جب ہم حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر جاتے ہیں۔ اُن کے وصال کو 948 سال ہو گئے ہیں۔ اُن کے پاس رہنے، پہننے اور کھانے کا کوئی عمدہ انتظام نہ تھا۔ ساری عمر لوگوں کی خدمت کرتے اور اِن کے جوتے سیدھے کرتے گزار دی لیکن اِن 948 سالوں میں دُنیا نے دیکھا کہ بڑے سے بڑا حکمران بھی جب اُن کے مزار پر جاتا ہے تو جھک کر سلام کرتا اور اُلٹے پاؤں واپس آتا ہے۔ کبھی پیٹھ موڑ کر نہیں آتا۔ داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس دولت کا یہ عالم ہے کہ روزانہ تقریباً 10 ہزار آدمی لنگر سے کھانا کھاتے ہیں۔ بڑے سے بڑا شہنشاہ بھی اِتنے سو سال تک اِتنے آدمیوں کو کھانا نہیں کھلا سکتا۔ یہ اُن لوگوں کے احوال کا ہلکا سا عکس ہے جنھوں نے اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے زندگی گزار دی۔

اگر انسان یہ جاننا چاہے کہ رب مجھ سے راضی ہے یا نہیں تو یہ دیکھ لے کہ خلقِ خدا مجھ سے راضی ہے یا نہیں۔ جس شخص نے اللہ کی رضا کے لیے اِس دُنیا کے آرام و آسائش اور مال و زر کو حقیر جانا، اللہ تعالیٰ نے اُسے دُنیا میں عزت عطا فرمائی۔ اِس لیے میں عرض کیا کرتا ہوں کہ جو لوگ اللہ کی رضا کی خاطر دوسروں کے لیے Footmat بن گئے، لوگوں کی خدمت کرنے لگے، اللہ نے اُنھیں لوگوں کے سر کا Hat بنا دیا۔

ایک بات یاد رکھیں، پانی کا بھرا کوئی برتن ہو، تالاب یا جوہڑ، اُس میں جب پانی کھڑا رہے تو نہ صرف وہ

کثیف ہو جاتا ہے بلکہ اُس میں Smell بھی پیدا ہو جاتی ہے لیکن اگر بدبودار پانی نکال کر اُس تالاب کی صفائی کر دی جائے، پھر اس کے بعد نہر یا کسی اور Source سے اُس میں پانی داخل کیا جائے تو اُس میں مچھلیاں اور دوسری آبی حیات نہ صرف جنم لیتی ہے بلکہ نشوونما بھی پاتی ہے اور یہ پانی انسان کے پینے اور نہانے دھونے کے کام بھی آتا ہے۔ جو مال وزر ہمارے پاس آتا ہے اگر اُسے ہم جمع رکھیں تو اس کی مثال ٹھہرے ہوئے پانی کی مانند ہے جو کثیف اور بدبودار ہو جاتا ہے لیکن اگر وہ دوستوں، عزیزوں اور ضرورت مندوں کے کام آتا ہے تو اللہ تعالیٰ تازہ پانی کی مانند اُس میں مزید مال و دولت داخل کرتا رہتا ہے اور یوں اُس مال میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

سوال: کشف القبور، کشف الصدور کا آسان اور تیر بہدف نسخہ کیا ہے؟

جواب: آج کل لوگ گھر میں چیزیں گرم کرنے کے لیے مائیکروویو اوون کا استعمال کرتے ہیں۔ کھانا گرم کرنے کا یہ بہت سہل اور Quick طریقہ ہے۔ لیکن آپ نے کبھی نوٹ کیا کہ جس تیزی سے مائیکروویو اوون میں چیزیں گرم ہوتی ہیں اُسی تیزی سے ٹھنڈی بھی ہو جاتی ہیں لیکن اگر کھانا چولہے پر گرم کیا جائے تو اگرچہ دقت تو ہوتی ہے اور ٹائم بھی صرف ہوتا ہے لیکن وہ کھانا جلدی ٹھنڈا نہیں ہوتا۔

سارے آسان اور تیر بہدف نسخے مائیکروویو اوون میں گرم ہونے والے چیزوں کی مانند ہوتے ہیں۔ رُوحانیت میں کوئی بھی چیز آسان اور Quick نہیں ہے۔ رُوحانیت سیکھنے کا عملِ مسلسل ہے۔ اس میں ہم کسی سٹیج پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں سیکھ گیا۔ اس میں ایک دستور نرالا ہے کہ جس انسان نے کوئی بھی کام خواہ عبادت یا خدمتِ خلق اس طرح کیا کہ اُسے یہ انتظار رہا کہ اب تک مجھے کیا ملا، اُسے کبھی کچھ نہ ملا۔ جس شخص نے یہ دھیان تک نہ رکھا کہ مجھے کیا حاصل ہوا اُسے سب کچھ حاصل ہو جاتا ہے۔

کشف القبور کا طریقہ تو خود مجھے بھی نہیں معلوم۔ جب مجھے کشف القبور حاصل ہوا تو مجھے اس کا وہم و گمان تک نہ تھا۔ میں نے اس کے لیے نہ کوئی Effort کی تھی اور نہ کوئی وظیفہ کیا تھا۔ بس مختلف مزارات پر حاضری دیتا رہتا تھا۔ ایک روز ایک مزار پر فاتحہ پڑھی تو دیکھا کہ قبر کا منہ کھل گیا اور صاحبِ قبر اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ ایک اور مزار پر گیا تو اُن بزرگ سے ملاقات ہوگئی۔ میں نے خود سے کہا کہ معلوم نہیں یہ قصہ کیا ہے، کون پروا کرے کہ یہ سب کیا تھا؟ یوں کشف القبور جاری ہو گیا۔

ایک ملنے والے صاحب کی بیگم نے مجھ سے اپنا مسئلہ بیان کیا۔ میں اُن سے دُنیاوی بات کر رہا تھا کہ اچھا کوئی حل نکالتے ہیں۔ اچانک میں نے دیکھا کہ ایک پرانی طرز کا چھوٹا سا گھر ہے جس کے صحن میں ایک چارپائی بچھی ہے۔ اُس چارپائی پر تین مرد بیٹھے ہیں جن کی Back مجھے دکھائی دے رہی تھی۔ ذہن میں آیا کہ یہ ان خاتون کے بھائی ہیں۔ میں نے اُن خاتون سے پوچھا "آپ کے بھائی آبائی گھر میں رہتے ہیں؟" کہنے لگیں "جی ہاں۔" میں نے پوچھا "اس قسم کا چھوٹی اینٹوں سے بنا گھر ہے۔" بولیں "جی ہاں۔" پوچھا "آپ کے بھائی صحن میں چارپائی بچھا کر بیٹھتے ہیں۔" انھوں نے جواب دیا "جی ہاں۔" میں نے کہا "آپ اپنے بھائیوں کے پاس جا کر کہیے کہ اس مسئلے کو حل کریں، وہ کر دیں گے۔" کہنے لگیں "ابھی کل تو اُن سے مل کر

آئی ہوں۔" میں نے کہا "دوبارہ جائیے، اب مسئلہ حل ہو جائے گا۔" یوں کشف جاری ہو گیا۔ اس کشف کے حصول کے لیے نہ تو میں چھت کے ساتھ اُلٹا لٹکا نہ پنکھے کے ساتھ لٹک کر اُسے پوری سپیڈ پر چلایا اور نہ کسی قبر پر جا کر بیٹھا اور نہ دریا میں ایک ٹانگ پر کھڑا ہوا۔ کشف کے حصول کے لیے یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

مجھے آج تک کوئی ایسا بندہ نہیں ملا جس نے کبھی کسی بھی قسم کے کشف (کشفِ قلبی، کشفِ شخصی، کشف القبور، کشف الصدور) کے حصول کے لیے Effort کی ہو اور اس Effort کے نتیجے میں اُس کا کشف جاری ہو گیا ہو۔ اِن قصوں میں نہ پڑیں، بصرف رب کے حصول کی جستجو میں رہیے کہ رب مل جائے۔

جن لوگوں کو کشف و کرامات حاصل ہو جائیں وہ ذہنی طور پر اُس بلندی پر چلے جاتے ہیں کہ انھیں یہ سب مداری کی شعبدہ بازی سے بڑھ کر کچھ محسوس نہیں ہوتا۔ وہ تو بس ہر وقت اِسی دھیان میں گم رہتے ہیں کہ رب میرا ہو جائے۔ جو لوگ اِس دھیان اور جستجو میں رہے کہ رب میرا ہو جائے اور مجھے اپنا بنا لے، کشف و کرامات اُن کے راستے میں خود بخود آ گئیں۔

جن صاحب نے یہ نسخہ پوچھا ہے اُن کی خدمت میں گزارش ہے کہ سب سے تیر بہدف نسخہ یہ ہے کہ آپ رب کو اپنا بنانے کے چکر میں پڑ جائیے کہ رب میرا ہو جائے اور مجھے اپنا بنا لے۔ یہ سب چیزیں خود بخود آپ کو حاصل ہو جائیں گی۔ لیکن یہ بھی یاد رکھیے کہ جب آپ رب تعالیٰ کو اپنا بنانے کے چکر میں پڑ جائیں گے تو کشف و کرامات آپ کو مداری کے شعبدے سے زیادہ محسوس نہیں ہوں گی۔ یہ اپنی سب Value کھو دیں گی۔

سوال: سید یعقوب علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مرشد کون تھے؟

جواب: میرے مرشد سید یعقوب علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کراچی میں مقیم بابا رحمت وارثی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے، وہیں سے اُن کے سب سلسلے جاری ہوئے۔

سوال: اشفاق احمد نے کہا تھا "جب آپ پہاڑی مقام پر جاتے ہیں جہاں زمین و آسمان آپس میں مل رہے ہوں، وہاں آپ ایک دائرہ سا مکمل ہوتا محسوس کریں گے۔" اِس کی وضاحت فرما دیجیے۔

جواب: میں نے اشفاق احمد کا یہ فرمان نہیں پڑھا لیکن میرے خیال میں اُنھوں نے یہ فرمایا ہوگا کہ جب آپ کسی پہاڑی مقام پر جاتے ہیں اور بلندی پر کھڑے ہو کر چاروں طرف Horizon (اُفق) پر نظر ڈالتے ہیں تو آپ کو ایک دائرہ سا کھنچا دکھائی دیتا ہے جسے ہم اُردو میں اُفق اور انگریزی میں Horizon کہتے ہیں۔

جب ہم زمین پر کھڑے ہو کر آسمان پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ساڑھے سات میل دُور Horizon line دکھائی دیتی ہے۔ درحقیقت یہ ہماری نگاہ کی حد ہے۔ اگر ہم کسی بلند جگہ مثلاً مکان کی چھت پر کھڑے ہو کر آسمان کو دیکھیں تو ہماری حدِ نگاہ یعنی Horizon line ساڑھے گیارہ میل اور جہاز سے باہر دیکھیں تو Horizon line تقریباً ساڑھے اکیس میل دُور دکھائی دیتی ہے۔

اشفاق احمد غالباً یہ کہنا چاہتے ہیں کہ علم کا دائرہ آپ کے اردگرد اسی طرح مکمل ہوتا ہے جس طرح اُفق یا

Horizon آپ کے چاروں طرف ایک دائرے کی صورت دکھائی دیتا ہے۔ ہم جتنا بلند ہوتے جائیں گے وہ دائرہ اُتنا دُور کھنچتا چلا جائے گا اور اُفق اُسی قدر دُور محسوس ہوگا۔ اسی طرح ہم جتنا علم حاصل کرتے چلے جاتے ہیں، ہمارا Vision وسیع ہوتا چلا جاتا ہے اور ہماری نگاہ کی وسعت بھی بڑھتی چلی جاتی ہے۔

سوال: بعض افراد کو آپ سے ملاقات کے بعد یا آپ کی کتاب پڑھ کر کچھ چیزوں کی موجودگی کا احساس یا خوف کی کیفیت ہو تو اس کا کیا مطلب ہے؟

جواب: دُنیا بھر میں جتنے ریڈیو اور ٹی وی اسٹیشنز ہیں وہ مسلسل اپنی نشریات Transmit یا Telecast کرتے رہتے ہیں لیکن اگر ہم نے اپنا Receiving set یعنی ریڈیو یا ٹیلی ویژن آن نہ کیا ہو تو ہم اُن کی نشریات کو Receive نہیں کر سکتے۔ لیکن جونہی ہم اپنا Receiving set آن کرتے ہیں اور ایک خاص فریکوینسی پر جاتے ہیں تو وہ ریڈیو یا ٹی وی ہمیں سنائی یا دکھائی دینے لگتا ہے۔

بالکل اسی طرح ہمارے احوال پر گرد پڑی ہوتی ہے۔ بعض اوقات ہوتا یہ ہے کہ کسی شخص سے ملنے یا کوئی کتاب یا واقعہ پڑھنے سے ہمارے احوال پر جمی گرد Remove ہونے لگتی ہے اور ہمیں غیر مرئی قوتیں محسوس ہونے یا دکھائی دینے لگتی ہیں۔ اس میں اُس شخص کا کوئی کمال نہیں۔

آپ اس دھوکے میں مت آیئے گا کہ اگر شاہ صاحب سے ملنے کے بعد آپ کو کچھ غیر مرئی قوتوں کی موجودگی کا احساس ہوا تو اس میں شاہ صاحب کا کوئی کمال ہے...... یہ صرف اور صرف آپ کی اپنی رُوحانی کیفیات یا رُوحانی اعمال ہیں جن کے لیے آپ اپنے آپ کو شاباش دیجیے۔ اس دھوکے میں نہ آیئے کہ میری وجہ سے ایسا ہوا۔ انسان کسی کو اُسی وقت کچھ دے سکتا ہے جب اُس کے پاس کچھ ہو، میرے پاس تو سوائے گناہوں اور آوارگی کے کچھ ہے نہیں...... میں کسی کو کیا دوں گا۔

سوال: جب کوئی سائل کسی فقیر کے در پر جاتا ہے تو کیا فقیر سب کو یکساں Treat کرتا ہے یا فرق رکھتا ہے؟ کیونکہ ہر آنے والا کسی دُنیاوی حاجت، حصولِ علم، فقیر سے محبت، دوستی یا عشق میں ملنے آتا ہے؟ کیا فقیر اپنے پاس آنے والے کی نیت سے واقف ہوتا ہے؟ کیا فقیر ہر آنے والے کو کچھ نہ کچھ عطا کرتا ہے یا کسی سائل کو خالی ہاتھ بھی واپس بھیج دیتا ہے؟

جواب: سب سے پہلے تو دیکھنا پڑے گا کہ سائل جس کے پاس گیا ہے کیا وہ واقعی فقیر ہے؟ میں بے تکلف دوستوں میں بیٹھا یہ بات کیا کرتا ہوں کہ تین لوگوں کا ملنا تقریباً ناممکن ہو چکا۔

1۔ اصلی پیر

2۔ اصلی حکیم

3۔ اصلی ہومیو پیتھ

اگر کوئی واقعی صحیح فقیر ہے تو وہ سائل کو وہی دے کر بھیجتا ہے جس نیت سے وہ فقیر کے پاس آیا تھا۔ Treatment یکساں ہو نہیں سکتی۔ ایک ڈاکٹر کے پاس صبح سے شام تک 100 مریض آتے ہیں جن کی

جسمانی کیفیات، بیماریاں اور علامات مختلف ہیں۔ اگر ڈاکٹر سب کو APC کی گولی اور لال شربت دینا شروع کر دے تو کوئی مریض بھی صحت یاب نہیں ہوگا۔ فقیر سائل کو اُس کی نیت کے مطابق عطا کرتا ہے۔ رہی یہ بات کہ فقیر پر سائل کے احوال کھلتے ہیں یا نہیں؟

تو بھائی! اس کا جواب تو کوئی فقیر ہی دے پائے گا البتہ میں نے اپنے مرشد صاحب کو یہ کہتے ضرور سنا:

''میاں! ہمارے پاس تو جو آدمی جس نیت سے آتا ہے، ہم اُسے وہی کچھ دیتے ہیں۔''

اِس سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ فقیر اپنے پاس آنے والوں کی نیت سے آگاہ ہوتا ہے۔ یہ اور بات کہ وہ بھرم رکھے اور سائل پر یہ ظاہر نہ ہونے دے۔

سوال: توفیق کیا ہے؟ کیا توفیق رب تعالیٰ سے مانگنی پڑتی ہے یا یہ عطائے رب ہے؟ کیا جب اللہ تعالیٰ انسان سے خوش ہوتا ہے تو اُسے نیک اعمال کی توفیق دیتا ہے؟

جواب: جب ہم اللہ کو رب کہتے ہیں تو یہ Acknowledge کر رہے ہوتے ہیں کہ تیرا یہ دعویٰ کہ ''تو پالنے والا ہے'' بالکل سچ ہے۔

''پالنا'' اپنے اندر بہت وسیع معنی رکھتا ہے لیکن ہم اِسے محدود معنوں میں لیتے ہیں کہ جو کھلائے، پلائے، کپڑے دے، وہ پالنے والا ہے۔

ہماری ہر ضرورت و خواہش کو رب پورا کرتا ہے۔ یہ پالنے کے زمرے میں آتا ہے۔ جب کوئی مالک و آقا کسی شخص کو خرید کر اپنے پاس غلام رکھتا ہے تو ہر مالک و آقا اپنے ظرف کے مطابق اُس غلام کے ساتھ سلوک کرتا ہے۔ باظرف آقا اپنے غلام سے خدمت تو لے گا لیکن اُس کی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا خیال رکھے گا۔ رب تعالیٰ سب سے زیادہ ظرف رکھنے والا ہے۔ وہ آقا جب اپنے بندے کو پالتا ہے تو اُس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا ہے اور اُسے بن مانگے عطا کرتا ہے لیکن اُس آقا کو آقا سمجھنے اور یہ Acknowledge کرنے کے لیے کہ میں واقعی تجھے اپنا آقا سمجھتا ہوں ضروری ہے کہ اُس سے مانگا جائے، سوال کیا جائے کیونکہ یہ اُس رب کا حق ہے۔

اللہ سے نیکی کی توفیق ضرور مانگنی چاہیے اور زبان سے یہ Acknowledge کرتے رہنا چاہیے۔

''اے میرے آقا! میں تجھے آقا مانتا ہوں اس لیے اپنی ہر ضرورت کے لیے تیری طرف دیکھتا ہوں۔''

جب رب تعالیٰ انسان سے راضی ہوتا ہے تو اُسے دین کی سمجھ عطا فرما دیتا ہے اور جسے دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے اُسے علم عطا فرماتا ہے اور جسے علم عطا فرماتا ہے اُسے عقل و فراست عطا کرتا ہے، جس کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا

''مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔''

سوال: منافقت سے کیا مراد ہے؟ ظاہر و باطن کیسے ایک سا ہو سکتا ہے؟

جواب: منافقت سے مراد یہ ہے کہ انسان دل میں کچھ اور ایمان و یقین رکھتا ہو لیکن زبان سے اس کے سوئی

ضد Oppositeیقین دلائے۔ انسان کو اپنا ظاہر و باطن ایک کرنے کے لیے کوئی زیادہ مشق کی ضرورت نہیں۔ جو دل میں ہو وہ Politeاور خوب صورت لفظوں میں دوسرے کو Convey کردے تو آہستہ آہستہ انسان کا ظاہر و باطن ایک سا ہو جاتا ہے۔

سوال: کیا فقیر کی دہلیز پر آنا باعث رحمت ہے یا نعمت؟ کیا فقیر کے پاس آنے والا بھی فقیر بن جاتا ہے؟ کہتے ہیں جو فقیر کی نگاہ میں آ گیا وہ پناہ میں آ گیا۔ کیا فقیر کے پاس آنے والا اُس کی نگاہ میں آ جاتا ہے؟

جواب: فقیر کے پاس آنا رحمت ہے نہ زحمت۔ اصل بات یہ ہے کہ فقیر کے پاس جانے والے کی نیت کیا ہے۔ اگر مجھ جیسا انسان کسی فقیر کے پاس جائے تو کیا حاصل کرے گا؟ کچھ بھی نہیں۔ کیونکہ میری نیت تو یہ ہو گی کہ ریس کے گھوڑوں یا پرائز بانڈز کا نمبر پتا چل جائے یا لاٹری نکل آئے۔

اگر کوئی شخص فقیر کے پاس دُنیاوی دُعا کرانے کے لیے جاتا ہے تو چونکہ فقیر پر فرض ہے کہ جو اُس کے پاس جائے اُس کے لیے دُعا کردے ورنہ وہ اللہ کی نظر میں بخیل ٹھہرے گا۔ وہ اپنے آپ کو بخیلوں کی فہرست میں نہ لانے کے لیے اُس شخص کے لیے دُعا کردے گا۔

میری نظر میں فقیر کے پاس جانے کا ایک فائدہ ہے۔ دُنیاوی زندگی میں کامیابی و ناکامی تو چلتی ہی رہتی ہے...... یہ زندگی کا حصہ ہے۔ اس کے لیے تو فقیر کے پاس جانے کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ یہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا کہ کسی انسان کی زندگی صرف کامیابیوں، خوشیوں، خوش حالی، صحت اور سکھ سے عبارت ہو۔ ہر انسان کی زندگی میں اچھے اور بُرے ہر دو پہلو ہیں...... دُکھ سکھ، غربت امارت، بیماری تنگ دستی، سب وہ اپنی لائف میں انجوائے کرے گا...... ان سے مفر کسی طور ممکن نہیں۔ اِس سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ انسان فرشتہ ہو جائے لیکن پھر ہماری آزادی اور اِختیار محدود ہو جائے گا کیونکہ کسی فرشتے کے پاس نہ کوئی اِختیار ہے نہ اُسے کسی عمل یا فعل کی آزادی ہے وہ تو صرف اور صرف کمپیوٹر کی طرح کمانڈ کو Follow کرتا ہے۔

فقیر کے پاس دُنیاوی اغراض کے لیے جانے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا سوائے اِس کے کہ وہ آپ کے لیے دُعا کردے گا۔ مالک رب ہے۔ یہ اُس کی اپنی مرضی ہے کہ وہ اُس دُعا کو قبول کرے یا رد کردے۔ فقیر کا اس پر کوئی اِختیار نہیں۔ جو یہ کہتا ہے کہ میں رب سے اپنی بات منوا سکتا ہوں وہ جھوٹ بولتا ہے کیونکہ رب اِتنا بڑا ہے کہ اپنی مرضی کا خود مالک ہے۔ اُسے کوئی شخص خواہ وہ کسی بھی مرتبے پر ہو، مجبور نہیں کر سکتا۔ ہاں البتہ ایک بات ضرور ہے کہ رب جن سے پیار کرتا ہے اُنھیں لاڈ لڈاتا ہے لیکن یہ کلیتہً رب کی مرضی ہے کہ وہ لاڈ لڈائے یا دھتکار دے۔ وہ مالک ہے اُس کو کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔ فقیر کے پاس جا کر صرف دُعا کرائی جا سکتی ہے۔

اگر کوئی فقیر کے پاس اللہ سے قریب ہونے کے لیے جائے تو فقیر کو یہ احساس ہو جائے گا کہ یہ شخص جو بظاہر مجھ سے اللہ سے قریب ہونے کے لیے علم لینے آیا ہے اس کے پیچھے درحقیقت یہ خواہش چھپی ہے کہ رُوحانی علم حاصل ہو جانے کے بعد میرے دُنیاوی کام آسانی سے ہونے لگیں۔ تو پھر فقیر اُس شخص کو کچھ نہیں

دیتا۔ لیکن جو شخص رب کو اپنا بنانے اور راہِ ہدایت پانے کے لیے فقیر کے پاس جاتا ہے اور خواہش رکھتا ہے کہ اُسے رب کی دوستی عطا ہو جائے تو فقیر اُس شخص کو ضرور علم سے نوازتا ہے۔ لیکن اس شخص کو علم کے ملنے کا احساس نہیں ہوتا۔

اگر ایک خالی گلاس میں ایک قطرہ پانی ٹپکایا جائے تو وہ اُس وقت تک گلاس سے باہر نہیں چھلکتا جب تک گلاس بھر نہ جائے۔ جب تک پانی باہر نہ چھلکے ہمیں گلاس کے بھرنے کا احساس نہیں ہوتا۔ اگر قطرہ قطرہ پانی گلاس میں گر رہا ہے تو یہ ایک لمبا Process ہے۔

جب آپ فقیر کے پاس جاتے ہیں تو وہ فقیر بڑی Measured dose میں قطرہ قطرہ علم آپ کو دیتا ہے تاکہ آپ اُسے اچھی طرح Absorb کر سکیں۔ اگر وہ آپ کو Overdose کردے گا تو علم آپ کی باڈی میں Absorb نہیں ہو گا بلکہ ضائع ہو جائے گا۔ یہ ایک طویل اور صبر آزما Process ہوتا ہے اس لیے دُنیاوی طور پر مشہور ہے کہ عام طور پر انسان کو اِس Process میں 35 سال لگ جاتے ہیں۔ جب انسان فقیر کے پاس رُوحانی علوم کے حصول کے لیے جائے تو پھر صبر و استقامت کا مظاہرہ کرے اور یہ سوچنا بند کردے کہ میں پچاس بار فقیر کے پاس گیا لیکن مجھے ابھی تک کیا ملا؟ جب وہ یہ سوچنا شروع کر دیتا ہے تو پھر اُسے کچھ نہیں ملتا...... بلکہ جو ملا ہو وہ بھی ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔

سوال: اگر کسی مقام پر نفع و نقصان کا خیال ختم ہو جائے تو وہ کون سا مقام ہے؟ حضرت بی بی رابعہ بصری رحمتہ اللہ علیہ کے قول کا مفہوم ہے کہ عمل صرف رب کے لیے ہو نہ کہ جنت کے لالچ یا عذابِ دوزخ کے خوف سے۔

جواب: میرے خیال میں اسے قلندر کا مقام کہتے ہیں۔ قلندر کسی رُوحانی درجہ کا نام نہیں بلکہ اُسلوب اور طریقہ حیات کا نام ہے۔ جہاں انسان سود و زیاں کے احساس سے اُوپر چلا جائے، اُس کی نظر نفع و نقصان پر نہ رہے بلکہ اُس کی زندگی کا مقصد رب کی دوستی اور رب کو کمانا ہو جائے۔ جو لوگ واقعتہً اس مقام کو صحیح طور پر پہنچ پائے قلندر کہلائے۔ قلندرِ اعظم حضرت علیؓ ہیں۔

جس انسان کو یہ اُسلوبِ زندگی عطا ہو جائے اُس سے زیادہ خوش نصیب کون ہو گا!

پُر اخلاص عبادت کے ثمرات

ایک صاحب کے گھر غربت نے کچھ اِس طرح ڈیرے ڈالے کہ بچوں کو کئی دن تک کھانا نہ ملتا۔ جب فاقے بچوں کی برداشت سے باہر ہو گئے تو اُنھوں نے اپنے والد سے کہا کہ آپ کیسے باپ ہیں کہ ہمیں کھانا بھی Provide نہیں کر سکتے۔ اُن صاحب نے اپنے بچوں سے وعدہ کیا کہ کل مزدوری پر جاؤں گا اور انشاء اللہ اِتنا کما لاؤں گا کہ جس سے تم سب کا پیٹ بھر سکے۔ اگلی صبح وہ بچوں سے مزدوری پر جانے کا کہہ کر گھر سے روانہ ہو گئے اور گھر کے قریبی جنگل میں جا کر نماز عصر تک مسلسل عبادت کرتے رہے۔ عصر کی نماز پڑھ کر گھر واپس آئے تو بچے بھوک سے بلک رہے تھے۔ اُن صاحب نے اپنے بچوں کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا کہ کل دوبارہ مزدوری پر جاؤں گا تو آج اور کل کی اکٹھی اُجرت مل جائے گی۔ اگلے دن وہ دوبارہ صبح سے عصر تک اُسی جنگل میں محوِ عبادت رہے۔ عصر کے وقت اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتے کو حکم دیا کہ جنت سے دو کلو آٹا، دیگر اشیائے ضرورت اور دو ہزار اشرفیاں لے کر اُس شخص کے بچوں کو دے آؤ۔ فرشتے نے حکم کی تعمیل کی۔ سب چیزیں بچوں کے حوالے کر دیں۔ شام کو وہ صاحب گھر آئے۔ بچوں کے چہرے پر رونق اور خوشی دیکھی، چولھا بھی گرم تھا حیرت سے پوچھا "یہ کیا ماجرا ہے؟" بچے خوش ہو کر بولے "آپ ہی نے تو یہ سب ہمارے لیے بھیجا تھا۔"

بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ صاحب نے جب یہ قصہ مریدوں کے سامنے بیان کیا تو اِس کے بعد فرمایا کہ جو لوگ رزق اور دُنیا کے پیچھے بھاگتے ہیں، مالِ دُنیا ہمیشہ اُن سے گریزاں رہتا ہے۔ وہ لوگ جو اللہ سے لو لگا لیتے ہیں اور مالِ دُنیا سے منہ موڑ لیتے ہیں، مالِ دُنیا بصد شوق اُن کے پیچھے بھاگتا ہے۔

یہ بات بالکل درست ہے اور ہم نے یہ ہوتے دیکھا بھی ہے لیکن انسان چونکہ بے صبرا ہے وہ اِس پوائنٹ تک صبر نہیں کر پاتا جس پوائنٹ پر وہ واقعی سچے دل سے رب کا ہو جاتا ہے اور پھر وہ دُنیا کے پیچھے نہیں بلکہ دُنیا اُس کے پیچھے بھاگتی ہے۔

یہی وہ پوائنٹ ہے جہاں یہ مستند ہو جاتا ہے کہ انسان ریاکاری اور دکھاوے سے پاک ہو کر محض رب تعالیٰ کی محبت اور اُس کی خوشنودی کے لیے اُس سے لو لگائے ہوئے ہے۔ تب انسان اِس راہ میں آنے والی تمام آزمائشوں اور Tests سے گزرتا چلا جاتا ہے۔ پھر رب تو ملتا ہی ہے لیکن یہ دُنیا بھی اُس کے پیچھے بھاگتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اُس وقت تک دُنیا کی قدر و قیمت اُس انسان کی نظر میں ہیچ ہو چکی ہوتی ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ جناب حسن رحمۃ اللہ علیہ بہت دن تک محوِ سفر رہے، اُن کی مونچھیں بہت بڑھ گئیں۔ راستے میں ایک حجام نے بڑھی ہوئی مونچھیں دیکھ کر کہا "حضرت اگر آپ چند منٹ رُک جائیں تو میں آپ کی مونچھیں تراش دوں تاکہ یہ شریعت کے مطابق ہو جائیں۔" حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "میری جیب میں تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔" حجام نے کہا "اس کی آپ فکر نہ کریں، جب بھی پیسے ہوئے، دے دیجیے گا۔" حجام نے جب مونچھیں تراش دیں تو فقیر چونکہ قرض سے دُور بھاگتے ہیں اس لیے حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ قدرے فکرمندی سے اُوپر چہرہ کر کے بولے "اب میں کیا کروں؟ مزدوری کہاں سے دوں؟" اُن کے یہ کہتے ہی وہ درخت جس کے نیچے نائی دکان سجائے بیٹھا تھا، اچانک زور سے ہلا اور سونے کے دیناروں کی بارش شروع ہو گئی۔ جناب حسن رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی بے پروائی سے حجام سے کہا کہ ان دیناروں کو اپنی ہمت کے مطابق چن لو۔" یہ کہنے کے بعد بغیر دیناروں کی طرف دیکھے وہاں سے رُخصت ہو گئے۔

جب انسان آزمائش میں سے گزر کر رب تعالیٰ کی مستند محبت تک پہنچتا ہے تو وہ غنا کا وہ درجہ پا لیتا ہے کہ سونے کے دیناروں کی قیمت بھی اُس کے لیے کنکر سے زیادہ نہیں رہتی۔

حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ صاحب فرماتے ہیں کہ رزق چار قسم کا ہے:

1۔ رزقِ مقسوم

2۔ رزقِ مضمون

3۔ رزقِ مملوک

4۔ رزقِ موعود

1۔ رزقِ مقسوم: وہ ہے جو تقدیر میں لکھ دیا گیا جس کے بارے میں حضرت علیؓ نے فرمایا تھا کہ کوئی شخص مر نہیں سکتا تاوقتیکہ وہ اپنے رزق کا آخری نوالہ تک نہ کھا لے۔ رزقِ مقسوم مل کر رہتا ہے۔ اگر انسان دُنیا بھر کی تمام کوشش کر لے تو یہ رزق زیادہ نہیں مل سکتا اور جتنا دُور بھاگ لے اِس سے محروم نہیں رہ سکتا۔

2۔ رزقِ مضمون: وہ رزق ہے جو انسان کو کھانے پینے کی چیزوں کی صورت (جو اُس کے لیے کافی ہوں) ملتا ہے یعنی (ان کا) اللہ ضامن ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

"اور زمین پر چلنے والا کوئی ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمہ کرم پر نہ ہو۔" (ھود:6)

3۔ رزقِ مملوک: وہ رزق ہے جو انسان جائز طریقوں سے محنت کر کے کماتا ہے، بہت سے اثاثے جمع کر لیتا ہے۔ اُس کی ملکیت میں موجود اشیا، اثاثے رزقِ مملوک کے زمرے میں آتے ہیں۔

4۔ رزقِ موعود: رزق کی یہ قسم قدرے خطرناک ہے۔ یہ وہ رزق ہے جس کے بارے میں وعدہ کر لیا گیا کہ پتھر میں بند کیڑے کو بھی رزق عطا کیا جاتا ہے۔ خطرناک اِس لیے کہا کہ تمام اہلِ فقر اس قسم کے رزق پر توکل کرتے ہیں کہ چونکہ میرے رب نے وعدہ کیا ہے کہ میں پالنے والا ہوں، رب ہوں اس لیے وہ

مجھے ضرور رزق دے گا کیونکہ وہ اپنی ذمہ داریاں بڑے احسن طریقے سے پوری کرتا ہے۔

''اور جو اللہ سے ڈرے اللہ اُس کے لیے نجات کی راہ نکال دے گا اور اُسے وہاں سے روزی دے گا جہاں اُس کا گمان نہ ہو۔'' (الطلاق 2,3)

یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے غیب سے رزق آتا ہے۔ ہم بھی کہتے ہیں کہ رازق رب ہے، پالنے والا رب ہے۔ میں بھی کہتا رہتا ہوں کہ میرا رزق صرف میرے رب کے کنٹرول میں ہے لیکن اس کے باوجود ہم بھی فکرمند رہتے ہیں کہ کل کھانا کہاں سے ملے گا؟ رزق کیسے ملے گا؟ ہم اپنے سینئر کی خوشامد اسی خوف سے کرتے ہیں تا کہ ہمارا رزق لگا رہے۔ اسی موقع کے لیے میں عرض کیا کرتا ہوں کہ

We all believe in Allah but we don't trust Him.

زبانی کہنے اور دل میں ایمان کا جو فرق ہے، جس روز وہ دُور ہو گیا اُسی روز انسان کا ایک سجدہ اُسے ہزار سجدوں سے نجات دلا دے گا۔ اصل کھیل اسی یقین کا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ میں سے بہت سے صاحبان کو یہ بات قطعی پسند نہیں آئے گی اگر میں یہ کہوں کہ ہم رب کو وظائف، تسبیحات اور چلوں میں تلاش کر کے غلطی کرتے ہیں۔ رب تعالیٰ وظائف، تسبیحات، مجاہدوں اور چلوں سے نہیں ملے گا۔ رب تعالیٰ کو پانے کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ اُس سے پیار پال لیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ پیار مجازی ہو یا حقیقی، بہت دشوار کام ہے۔ پیار صرف کھونے کا نام ہے پانے کا نہیں۔ اگر ہم رب تعالیٰ سے پیار پالنا چاہتے ہیں تو ہمیں ذہنی طور پر یہ ٹریننگ کرنا ہو گی کہ سب کچھ کھونا میرا مقدر ہے۔ پیار میں انسان دے کر خوش ہوتا ہے لے کر نہیں۔ پیار میں حساب کتاب نہیں ہوتا۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے تو دوستوں کے لیے کہا تھا:

حساب دوستاں در دل

لیکن اللہ کے ساتھ پیار اور عشق میں تو دلوں میں بھی حساب کتاب نہیں رکھا جاتا۔ اُن تمام چیزوں کو ترک کر دیا جاتا ہے جن کے بارے میں Direct یا Indirect حتیٰ کہ Round about way میں بھی ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا ہو۔

زندگی میں ایسے لوگوں کی تلاش میرا مشن رہا جو مجھے نہ تو نماز پڑھنے کو کہیں، نہ روزہ رکھنے کی تلقین کریں، نہ سحر خیزی نہ شب بیداری کی نصیحت کریں اور نہ مجھے اپنی جیب سے کچھ خرچ کرنے کی تاکید کریں۔ بس مجھے کوئی ایسی تسبیح بتا دیں جو تعداد میں اتنی کم ہو کہ میں بال بناتے بناتے پڑھ لوں اور مجھے رب مل جائے۔

یہ تلاش آج تک جاری ہے۔ اس تلاش کا فائدہ یہ ہوا کہ مجھے ایسے حضرات مل گئے جو 35,40 سال سے مجاہدے، چلے کاٹ رہے تھے اور لاکھوں کی تعداد میں ذکر اذکار کرتے تھے لیکن انھیں رب نہ ملا۔ جب اُن سے بات ہوئی کہ آپ جس رفتار سے عبادت کرتے ہیں آپ کی پرواز تو سدرۃ المنتہیٰ تک ہو گئی ہو گی تو پتا چلا کہ پارسائی تو انھیں مل گئی لیکن رب نہ ملا۔ لیکن جب اُنھوں نے عبادات اور نیکی کو یک جا کر لیا تو پھر دو ڈھائی سال میں حجابات اُٹھ گئے۔

رب مل جانے کا ثبوت یہ نہیں کہ رب اُن کے ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گیا بلکہ مطلب یہ ہے کہ انھیں رب نے علم، سمجھ اور فراست عطا فرما دی جو رب تعالیٰ کے راضی اور خوش ہونے کی علامت ہے۔

رب تو بڑی جلدی راضی ہو جاتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ سیدھے طریقے سے اُس تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ اس کے لیے عبادات اور نیکی کو اکٹھے لے کر چلنا پڑے گا۔ جس طرح بچے سے پیار کریں تو اُس کی ماں آپ سے خوش ہو جائے گی اِسی طرح رب کو راضی کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ رب کے بندوں سے پیار کرنا شروع کر دیں۔

ہم سب اپنی اولاد سے پیار کرتے ہیں۔ بحیثیت باپ ہم نے کبھی انتظار نہیں کیا کہ ہماری اولاد ہم سے مدد مانگے تو ہی ہم اُس کے کام آئیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم اُسے ذرا سی تکلیف میں دیکھ کر تڑپ اُٹھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ وہ رنجیدہ نہ ہو۔

جب ہم خلقِ خدا سے رب کے لیے پیار کرتے ہیں تو ہماری نظر نہ صرف دوستوں بلکہ دشمنوں کے بھی حالات پر رہتی ہے۔ دشمن کو مشکل میں دیکھ کر اتنے محتاط انداز میں اُس کی مدد کرتے ہیں کہ اُسے پتا تک نہ چلے کہ کون اُس کی مدد کر گیا۔ اس عمل سے رب تعالیٰ بہت راضی ہوتا ہے۔ ہم نے زندگی میں یہ تماشا دیکھا کہ اگر کسی نے کسی شخص کو دیکھ کر نادانی میں یہ سوچا کہ یہ تو انتہائی حقیر شخص ہے اس کا رب سے کیا واسطہ! شاید رب اِسے عزیز نہیں رکھتا اور یہ سوچ کر اُسے کوئی ایسی بات کہہ دی کہ جس سے اُس کا دل دُکھ گیا تو دیکھنے میں آیا کہ رب فوراً اُس شخص کی مدد کو آیا اور صاف پتا چلا کہ رب کو یہ بات پسند نہیں آئی کہ اُس کے گناہ گار بندے کو بھی کوئی گناہ گار کہے اور اُس کا دل دکھائے۔

رب تو اپنے بندوں سے اس قدر پیار کرنے والا ہے۔ اُسے راضی کرنا ہے تو اُس کے بندوں کو راضی کر لیں۔

یہ میں آپ سے کہہ رہا ہوں ورنہ میں تو آج تک ایک بھی بندے کو راضی نہیں کر پایا۔ جو بندہ بھی مجھ سے ملتا ہے، مجھے بُرا بھلا کہتا ہوا جاتا ہے۔

سوال: (الف) کچھ حضرات کے مطابق اپنے نام کے حروف کی تعداد کے برابر اللہ کے نام جو اُس تعداد کے برابر ہوں، Collect کر لیے جائیں تو وہ اُس شخص کے لیے اسم اعظم ہو گا۔

(ب) کیا آیت الکرسی میں اسم اعظم پوشیدہ ہے؟

جواب: اسم اعظم اللہ کے وہ نام ہیں جنھیں پڑھ کر اللہ کے حضور جو بھی دُعا کی جائے، قبول ہوتی ہے۔ علم جفر اور علم الاعداد کے ماہر ہوتے ہیں اُن کے مطابق کسی انسان کے نام کے حروف کی Numerical value کو اکٹھا کر لیا جائے اور پھر اُس کے برابر اللہ کے مختلف ناموں کی Numerical value لے لی جائے تو اللہ کا وہ نام اُس انسان کے لیے اسم اعظم ہو گا۔ یہ بات درست نہیں ہے۔

اگر آپ کو اسم اعظم کا پتا چل بھی جائے تو میں آپ کو Warn کر دوں کہ اولیاء اللہ جب ایک خاص مقام

پر پہنچتے ہیں تو اسم اعظم اُن کے علم میں آجاتا ہے لیکن اگر وہ اسم اعظم استعمال کر کے کوئی دُعا کریں تو وہ دُعا قبول تو ہو جاتی ہے لیکن ولایت کی فہرست سے اُنھیں خارج کر دیا جاتا ہے۔ عمر بھر کی کمائی رائگاں جاتی ہے۔ کسی فقیر کے لیے یہ بہت سخت سزا ہے۔ اس لیے کوئی ولی اللہ کبھی اسم اعظم استعمال کر کے دُعا نہیں کرے گا۔

ہم سب اسم اعظم کی تلاش میں رہتے ہیں۔ شیطان ہمارے دل میں ڈالتا رہتا ہے کہ اسم اعظم معلوم کرو اور اسے استعمال کر کے دُنیاوی کام کرالو۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ ہماری عقل و نگاہ سب ناقص ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ کون سی چیز ہمارے لیے فائدہ مند ہے۔

ایک واقعہ یاد آ گیا لیکن اس کو بیان کرنے کے پیچھے قطعی طور پر خودنمائی مقصود نہیں۔ ایک صاحب ہمیشہ آ کر ایک ہی دُعا کے لیے ضد کرتے کہ گاڑی مل جائے۔ میں کہتا آپ یہ ضد کیوں کرتے ہیں۔ اپنی خواہش کا اظہار رب کے سامنے کریں۔ رب اتنا رحیم و کریم ہے کہ اپنے بندوں کی تمام خواہشات پوری کر دیتا ہے بشرطیکہ وہ بندوں کے مفاد میں ہوں۔ اگر اتنا عرصہ دُعائیں کرنے اور کرانے کے باوجود آپ کو کار نہیں ملی تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کے لیے یہ بہتر نہیں۔ آپ یہ دُعا کریں کہ یا اللہ! تُو میرے لیے جو بہتر سمجھتا ہے، عطا کر دے۔

لیکن اُن صاحب کی گاڑی حاصل کرنے کی خواہش ختم نہ ہو سکی۔ یہ غالباً 1985-86ء کی بات ہے، اُن کی رہائش گاہ سمن آباد میں بسطامی روڈ پر تھی۔ اُن کی وائف کے بھائی جو نیدرلینڈز میں رہتے تھے، By road اپنی نئی Left-hand drive کرولا میں بہن سے ملنے آئے جنھوں نے اپنے بھائیوں سے اپنے خاوند کے جنون کا ذکر کیا۔ بھائی اچھے تھے اُنھوں نے گاڑی کی چابی میز پر رکھی اور بہن سے کہا کہ "ہمارے بہنوئی سے کہنا کہ یہ گاڑی ہم اُن کے لیے نیدرلینڈز سے لائے ہیں۔" وہ صاحب میرے پاس آئے اور بتایا کہ گاڑی مل گئی ہے۔ میں نے کہا "اللہ اسے آپ کے لیے مبارک کرے اور خوشیوں کا باعث بنا دے۔" دو روز بعد Weekend آ گیا۔ اُن دنوں ابھی موٹروے نہیں بنا تھا۔ اُنھیں اسلام آباد جانا پڑ گیا۔ نئی کار کے شوق میں اکلوتا بیٹا بھی ساتھ ہو لیا۔ کالا شاہ کاکو کے قریب Left-hand drive گاڑی ہونے کی وجہ سے اُنھیں ٹرن لیتے ہوئے دوسری گاڑی کا پتا نہ چلا۔ اتنا خطرناک ایکسیڈنٹ ہوا کہ اُن صاحب اور اُن کے بیٹے کا موقع پر انتقال ہو گیا۔

اُن کی وفات کے کافی عرصہ بعد ایک خاتون میرے پاس آئیں اور شوہر اور بیٹے کی وفات کا ذکر کیا تو میرے ذہن میں ایک دم Flash ہوا کہ کہیں یہ اُنہی صاحب کی وائف تو نہیں۔ میں نے کنفرم کرنے کے لیے پوچھا "کیا آپ کی رہائش بسطامی روڈ پر ہے؟" اُنھوں نے اثبات میں جواب دیا تو میں نے کہا "بی بی! عجیب بات ہے کہ میں اُنھیں کار حاصل کرنے کی خواہش ترک کرنے کا کہتا رہا۔" ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ کسی خواہش کا پورا نہ ہونا ہی ہمارے لیے بہتر ہوتا ہے۔

اسی طرح ایک واقعہ پیش آیا جس پر ایک پورے Page کا آرٹیکل بھی اخبار میں چھپا۔ ایک صاحب کی

صاحبزادی کے نکاح کا معاملہ تھا۔ بات Engagement تک پہنچ گئی لیکن میں نے کہا کہ نکاح نہ کیجیے گا۔ مجھے تو اُنھوں نے کہہ دیا کہ ٹھیک ہے لیکن Engagement والے دن ہی نکاح کر دیا۔ نکاح کے دس دن بعد شوہر کا انتقال ہو گیا۔

ہم نہیں جانتے کہ ایک خواہش کی تکمیل کے پیچھے کیا پوشیدہ ہے اس لیے ہم کسی خواہش کو پورا کرنے کے لیے اسم اعظم استعمال نہ کریں۔ اگر اللہ ہمارا کوئی کام نہیں کر رہا تو یقیناً وہ ہمارے مفاد میں نہیں ہو گا۔ لیکن اگر ہم اسم اعظم استعمال کر کے وہ کام کرا لیں اور اُس کے نتائج ہمارے لیے بہتر نہ نکلے تو کیا ہو گا؟

اس لیے اسم اعظم کی کرید چھوڑ دیجیے۔

آپ ایسا کیوں نہیں کر لیتے کہ رب کو درد سے پکاریے۔ بندے کا رب کو درد سے پکارنا ہی اُس کے لیے اسم اعظم ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ تب رب بندے کی طرف متوجہ نہ ہو۔ ہم اپنی اُس آہ کو اسم اعظم کیوں نہیں بنا لیتے!

اسم اعظم کی کرید نہ کیجیے۔ رب کے ساتھ کمرشل رشتہ نہ باندھیے کہ میری تمام عبادت کا مقصد یہ ہے کہ تُو میرا یہ کام کر دے، یہ غرض پوری کر دے۔

آپ کبھی کسی مزار پر جا کر لوگوں کو دعا کرتے سنیے۔ چار چھ مہینوں بعد شاید ہی کوئی ایسا شخص ملے جو رو کر یہ فریاد کر رہا ہو "یا اللہ! میں نے ساری عمر تیری سرکشی کی، تیرے احکامات سے دُور بھاگتا رہا لیکن تو کتنا رحیم و کریم ہے کہ ہمیشہ میری اُن تمام حرکتوں سے صرفِ نظر کیا ہے۔ میں تیرے سامنے آتے ہوئے شرماتا بھی ہوں اور ڈرتا بھی ہوں کہ کیا منہ لے کر تیرے سامنے آؤں گا۔ تُو بڑی شرم و حیا والا ہے۔ لوگوں کے پردے رکھتا ہے۔ تُو اپنی اِس صفت کے بدلے میری تمام سیاہ کاریوں اور سرکشی کو معاف فرما دے۔"

رب تعالیٰ کے ساتھ اپنا تعلق Commercial transaction سے دُور کر لیں اور اُس کے ساتھ Purely آقا اور غلام، رب اور بندے کا تعلق قائم کر لیں۔

ہم یا کم از کم میں ہر وقت رب سے فرمائش کرتا رہتا ہوں۔ مثلاً کہتا ہوں اے اللہ! سننے میں آ رہا ہے کہ پٹرول کی قیمتوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ تُو میری تنخواہ بڑھا تا کہ پٹرول کا خرچ پورا ہو سکے۔ لیکن میں یہ کہنا بھول جاتا ہوں کہ یا رب! تیری بڑی مہربانی، تُو پیدائش سے لے کر آج تک مجھے پالتا رہا۔ آج تک مجھے طعنہ نہ دیا کہ اپنے کرتوت تو دیکھو۔ کیا منہ لے کر فرمائش کرتے ہو مجھ سے۔ رب بندے کو کچھ نہیں جتلاتا اور فرمائش پوری کر دیتا ہے۔ رب تو وہ ہے جو بن مانگے عطا کر دیتا ہے۔

ہم میں سے ہر آدمی اگر اپنی زندگی کو کھنگالے تو پتا چلتا ہے کہ ہم تو چند چیزیں ہی رب سے مانگتے رہے لیکن وہ ہمیں بے حساب رزق عطا کرتا رہا۔ اُس نے ہمیں وہ نعمتیں بھی عطا کیں جو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھیں۔ کیا ہی اچھا ہو اگر ہم اُس سے اُس کی بندگی، اطاعت اور غلامی مانگا کریں۔ "یا اللہ! تو ہمیں توفیق بخش دے کہ ہم تیرے سچے بندے بن جائیں۔ ہم تیری سچی بندگی کر پائیں اور کبھی ہم تجھے اپنا رب سمجھ کر تیری عبادت کر سکیں۔"

رب نے تو پالنے کا وعدہ اور دعویٰ کر رکھا ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ رب اپنے وعدے کا بہت سچا ہے، وہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔ ہم پھر رب سے وہ کیوں مانگتے رہتے ہیں جس کا وہ وعدہ کر چکا؟ کیا ہمیں اپنے رب کے وعدے پر یقین نہیں؟

بہتر ہے کہ ہم Commerical transaction کے بجائے رب کے ساتھ آقا اور غلام کا رشتہ جوڑ لیں۔ غلام کی تمام ضروریات پوری کرنا آقا کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ جب ہم رب کے ساتھ ایسا تعلق جوڑ لیں گے تو ہم دُنیاوی خواہشات کے پیچھے بھاگنے اور انھیں ہر حال میں پورا کرنے کے لیے اِسم اعظم کی کرید میں رہنا چھوڑ دیں گے۔ پھر ہمارے چہروں سے ایسا اطمینان جھلکے گا جو اولیائے کرام کے چہروں پر ہوا کرتا ہے کیونکہ انھیں یقین ہوتا ہے کہ میرا رب موجود ہے۔ وہ میری دیکھ بھال، نگہداشت اور حفاظت کرے گا۔ میرے سارے کام تو رب کے ذمہ ہیں۔ پھر مجھے کس بات کی فکر!

جب انسان سچے دل سے یہ سوچ لیتا ہے تو اُس کے اندر اور چہرے پر ہر وقت سکون رہتا ہے۔

سوال: مایوسی کفر ہے یا گناہ؟ بعض اوقات خواہشات یا دُعائیں پوری نہ ہونے کی وجہ سے انسان مایوس ہونے لگتا ہے؟ مایوسی سے بچنے کا آسان راستہ کون سا ہے؟

جواب: مایوسی سے بچنے کا آسان ترین راستہ یہ ہے کہ رب کے ساتھ دل سے تعلق قائم کر لیا جائے اور وہ تعلق قائم کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ کسی بھی رات عشاء کی نماز کے بعد دو نفل نماز پڑھ کر رب سے کہیے "یا باری تعالیٰ! آج سے میں نے اپنا آپ، اپنی اولاد، اپنے Dependents اور اپنے معاملات سب تیرے سپرد کر دیے۔ اب میرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تُو اِن سب کو میرے بہترین مفاد میں حل کر دے گا۔" اپنے تمام مسائل، پریشانیاں، فکریں گٹھڑی میں باندھ کر رب کے حوالے کر دیں اور پھر اُن سے لاتعلق ہو جائیں۔

اس کے بعد اپنی مقدور بھر کوشش کرتے رہیں اور نتائج کو بھلا دیں۔ مزے سے سیٹی بجاتے رہیں۔ رب جو عطا کر دے، اُسے خوش دلی سے قبول کر لیں۔ ہر حال میں ہنستے اور قہقہے لگاتے رہیں یہ سوچ کر کہ یہ میرا تو پرابلم ہی نہیں ہے، یہ تو رب کا پرابلم ہے۔ جب آپ ایسا کر لیں گے تو ڈپریشن تو دُور کی بات ہے کوئی رنجیدگی بھی قریب سے نہیں گزرے گی لیکن شرط یہ ہے کہ رب کے ساتھ یہ تعلق ایمان داری سے قائم کیجیے گا۔

Personality Grooming

اکنامکس اور سوشلزم جیسے مضامین لوگوں کے صدیوں پر محیط تجربات کا نچوڑ ہیں۔ صاحبانِ علم و بصیرت نے اِن تجربات کو اکٹھا کیا کہ پچھلے سو ڈیڑھ سو سال میں کن اقدامات کے کیا نتائج مرتب ہوئے۔ اِن اقدامات کو انھوں نے بطور Principle اپنا لیا۔ جب یہ Principles پوری طرح Develop ہو گئے تو انھیں Scientific lines پر اکٹھا کر کے کتاب کی شکل دے دی گئی۔ کسی کتاب کا نام Fundamentals of Economics تو کسی کا Principles of Economics رکھ دیا گیا۔ یوں یہ علوم وجود میں آ گئے۔ Development کا سلسلہ جاری رہا۔ آپ دیکھیں کہ امریکہ اور کینیڈا میں بزنس ایڈمنسٹریشن نے 40's میں جنم لے لیا تھا۔ یورپ میں یہ علم 50's میں آیا۔ وہاں کی چند یونیورسٹیاں بزنس ایڈمنسٹریشن پڑھاتی تھیں لیکن تب اِس کی شکل وہ نہیں تھی جو آج ہے۔ '60s میں یورپ میں بزنس ایڈمنسٹریشن کے دو Major ہوتے تھے...... ایک Finance اور دوسرا Marketing۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگ Specialisation میں آ گئے۔ پروفیسر میری اور پروفیسر پیٹر ہوکر جیسے لوگوں نے اس میں بہت کام کیا اور Specialisation کو راہ دی جس کی وجہ سے اس Discipline یعنی بزنس ایڈمنسٹریشن میں بے تحاشا میجر ہو گئے۔ آج یہ عالم ہے کہ بزنس سے متعلق کوئی بھی Discipline ہو اُس کا کوئی نہ کوئی میجر ضرور ہوتا ہے۔ طالب علم مختلف Subjects پڑھتا ہے لیکن Major emphasis کسی ایک خاص Subject پر ہوتا ہے۔

جب کارپوریٹ کلچر نے دُنیا میں بہت زور پکڑا اور کارپوریٹ کلچر کے حوالے سے مضامین پر تحقیق ہوئی اور انھیں Major کا نام دیا گیا۔ اِس تحقیق کے دوران یہ پہلو سامنے آیا کہ اگر ایک عام آدمی کو فوجی وردی پہنا دی جائے لیکن فوجی کی مخصوص ٹریننگ نہ دی جائے اور اُس کے Common sense, aptitudes, natural knacks اور Intelligence level پر یہ بات چھوڑ دی جائے کہ وہ انتہائی حساس، Sophisticated، پیچیدہ اور جدید ترین ہتھیار کو اپنی صواب دید کے مطابق استعمال کرے پھر جب وہ عام آدمی ایسے ہتھیاروں کو اپنی صواب دید کے مطابق استعمال کرے گا تو مطلوبہ رزلٹ نہیں آئے گا۔ اس لیے زور اِس بات پر دیا جاتا ہے کہ Weapon خواہ زیادہ Sophisticated نہ بھی ہو لیکن ہتھیار چلانے والے کی ٹریننگ بہت اعلیٰ پائے کی ہونی چاہیے تاکہ وہ اُس Weapon سے Maximum کام لے سکے۔ اس

لیے دُنیا نے جب اکنامسٹس، Politicians، بزنس ایڈمنسٹریٹرز، Psychiatrists اور سائیکولوجسٹس پیدا کیے تو اس بات پر بھی زور دیا کہ زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد کی ٹریننگ کا اہتمام کیا جائے ورنہ وہ پریکٹیکل لائف میں سیکھے ہوئے علوم پر صحیح طرح عمل نہیں کر پائیں گے۔ جب ان خطوط پر کام شروع ہوا تو ریسرچ کی گئی کہ کون سے لوگ زندگی میں زیادہ کامیاب ہوئے، کون سے لوگ کم کامیاب ہوئے اور کن لوگوں کی زندگی میں Failures آئے۔

ریسرچ ہمیشہ Open mind کے ساتھ کی جاتی ہے، کبھی Fixed notions کے ساتھ نہیں کی جاتی۔ جو ریسرچ Preconceived آئیڈیاز کے ساتھ کی جائے اُس کے رزلٹ کبھی درست نہیں آتے۔ ایسی ریسرچ پر اُس کے محقق کے آئیڈیاز کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ جج نے جو آرڈر پاس کیا ہے

He has taken a myopic view.

اگر Fixed notion والا آدمی ریسرچ کرے گا تو اُس ریسرچ سے برآمد شدہ نتائج Myopic ہوں گے۔

جو لوگ بہت کامیاب ہوئے، Average رہے یا ناکام ہوئے اُن پر ریسرچ کے بعد پتا چلا کہ اُن سب کا Knowledge تقریباً یکساں ہی تھا، Academically وہ ایک دوسرے سے بہتر ہی تھے لیکن ناکام لوگوں کی Personality کامیاب لوگوں کی نسبت مختلف اور کم بہتر تھی۔ ریسرچ سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ بعض اوقات ایسے لوگ بھی ناکام ہوئے جن کی پرسنیلٹی Overimposing تھی۔ اُن کی شخصیت (Personality) کے بوجھ کے نیچے لوگ دب گئے۔

کسی بھی آرگنائزیشن کی ترقی میں محض افراد نہیں بلکہ پوری ٹیم کام کرتی ہے۔ اگر ٹاپ پر بیٹھا ہوا آدمی Overimposing personality کا مالک ہے تو اُس کے ماتحت کام کرنے والوں کی Imagination اور Innovation ختم ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر وہ آدمی ناپسندیدہ عادات و اطوار کا مالک ہے تو اُس کے ماتحت بہتر کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔

They will not put in their best.

مزید تحقیق کے بعد یہ پتا چلایا گیا کہ کون سے لوگ کم Knowledge رکھنے کے باوجود زیادہ کامیاب ہو جاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ تحقیق ایک نئی سائنس "Personality grooming" کے نام سے سامنے آئی۔

مجھے اور آپ کو یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ جو Head of state ٹی وی پر متاثر کن انداز میں خطاب کرتا نظر آتا ہے، اس پر کتنی محنت کی گئی ہے۔ خود میرے ایک کولیگ کو جنرل ضیاء کی Personality grooming کے لیے امریکہ سے بلوایا گیا تھا اور بڑے بھاری معاوضہ پر انھیں یہ کام سونپا گیا تھا۔ آپ کو جو بات بتانے لگا ہوں اُس سے پتا چلے گا کہ کس طرح کوئی شخص دل میں اُتر جاتا ہے یا دل سے اُتر جاتا ہے۔ جنرل ضیاء جب شروع میں ٹی وی پر تقریر کے لیے آتے تو تقریر کے دوران ناک کے ایک حصے کو بار بار کھجاتے۔ ایک لیڈر

پبلک کو Address کرتے ہوئے جب ایسا کرے تو یہ انتہائی ناپسندیدہ عادت قرار پاتی ہے۔ میرے Colleague ان کو ٹریننگ دیتے تھے کہ دورانِ تقریر ہاتھوں کی Movement کیسی ہونی چاہیے، نرم لہجہ کہاں اختیار کرنا ہے، الفاظ کی ادائیگی میں کہاں Stress اور کہاں Pause دینا ہے، مشکل لفظ ادا کرتے ہوئے جو لاشعوری طور پر ناک کھجاتے تھے اُس کو کیسے کنٹرول کرنا ہے۔ تمام Heads of state کی ٹریننگ کے لیے پروفیشنلز باقاعدہ Hire کیے جاتے ہیں تاکہ اُن کی پرسنیلٹی پبلک کے لیے Acceptable ہو جائے۔ اسی طرح Large size ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنے سینئر ایگزیکٹوز کی Personality grooming کے لیے اپنے دفاتر میں ٹریننگ کا اہتمام کرتی ہیں یا انھیں اُن کمپنیوں کے دفاتر میں بھیج دیا جاتا ہے جہاں اس حد تک Personality grooming کی جاتی ہے کہ ملٹی نیشنل کمپنی کے ایگزیکٹوز کس سٹائل اور کس رنگ کا ڈریس پہنیں گے، بالوں کا سٹائل کیسا ہوگا، نشست و برخاست کا انداز کیا ہوگا وغیرہ۔

Personality grooming ہے کیا؟ اُس کی مختصر اور سادہ ترین تعریف یہ ہے:

''کسی انسان کی شخصیت کو Impressive, enforceable, effective اور Charismatic بنانا''۔

ذوالفقار علی بھٹو کی Personality بڑی Charismatic تھی۔ آپ Recall کریں کہ بھٹو صاحب کس طرح کا ڈریس پہنتے تھے۔ اُن کے بارے میں Officially remarks تھے کہ وہ دُنیا کے سب سے زیادہ خوش لباس (Well dressed) ہیڈ آف سٹیٹ ہیں۔

صدر ایوب کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ وہ دُنیا کے سب سے زیادہ Handsome ہیڈ آف سٹیٹ ہیں۔ بھٹو کی کامیابی میں نوے فی صد اُن کی Charismatic personality کا دخل تھا۔ بھٹو صاحب ہر پبلک میٹنگ میں مختلف ڈریس پہنتے، اُن کی ہاتھوں کی Movement، گفتگو، اور Body language کسی بھی علاقے کے کلچر، روایات اور وہاں کے باسیوں کے مزاج کے مطابق ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بہت سے لوگوں کے دلوں میں اُتر گئے۔

Personality grooming مختصر Subject ہے۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے سینئر ایگزیکٹوز کی ٹریننگ عموماً تین ہفتوں میں ہو جاتی ہے۔ Personality grooming میں بنیادی چیز Confidence ہے لیکن Confidence تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ ایک Overconfident انسان Acceptable نہیں ہوتا۔ لوگ اُس سے دُور بھاگتے ہیں۔ اگر کسی انسان میں Confidence کم ہے تو بھی لوگ اُسے پسند نہیں کریں گے۔

ایک صاحب سائیکاٹرسٹ کے پاس گئے کہ میں Inferiority complex (احساسِ کمتری) کا شکار ہو گیا ہوں۔ سائیکاٹرسٹ ایک مہینے تک اُن صاحب کے ساتھ روزانہ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی Sittings کرتے رہے اور آخر ایک روز کہنے لگے'' جناب! میں آپ کی نفسیاتی گرہ تک پہنچ گیا ہوں۔ آپ Inferiority complex کا شکار نہیں بلکہ ہیں ہی Inferior۔ ہمارے معاشرے میں بچے کو Confident نہیں ہونے

دیا جاتا۔ جونہی بچہ گھٹنوں کے بل چلنے اور چیزوں کو ہاتھ لگانے لگتا ہے تو اُسے فوراً ایک آواز سنائی دیتی ہے ''نہیں، نہیں۔ یہ نہیں کرنا۔'' یوں وہ بچہ Warning کے سوا کچھ سنتا ہی نہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اُس میں Confidence ختم ہو جاتا ہے اور وہ اپنی مرضی سے کچھ کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ وہ بڑا ہو کر دُنیا کو Face نہیں کر پاتا یا جھوٹ بولنا سیکھ لیتا ہے۔

شرارت کرنا بچے کی فطرت ہے۔ ماں باپ جب اُسے شرارت نہیں کرنے دیتے اور جونہی وہ شرارت کرنے لگتا ہے تو فوراً کہتے ہیں ''No'' تو بچہ چھپ کر شرارت کرے گا اور یہ رویہ اُس کی Personality میں جھوٹ کو راہ دے گا۔ جب وہ پریکٹیکل لائف میں جھوٹ بولے گا تو لوگوں کے نزدیک ناپسندیدہ ٹھہرے گا۔

یاد رکھیے! Personality grooming میں خوداعتماد (Confident) ہونا پہلا قدم ہے لیکن اگلا قدم Dependable or reliable ہونا ہے۔ لوگ یہ سمجھیں کہ مصیبت کے وقت ہم اپنا Weight اِس پر رکھ سکتے ہیں۔ بوقتِ ضرورت یہ اپنے شولڈر کو ہم سے دُور نہیں کرے گا۔ وہ بچہ جسے ہم ہر دو قدم پر "No" کی کمانڈ دیتے ہیں وہ یا تو جھوٹ کی راہ پر چلنے لگے گا یا احساسِ کمتری کا شکار ہو جائے گا۔ اس لیے بچے کو بچپن ہی سے Fair amout of confidence ضرور دیں تاکہ اُس کی شخصیت خوب صورت اور متاثر کن بن سکے۔

ہم UK جا کر انگریزوں کے Systems کو Study کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ کس طرح ایک کروڑ 20 لاکھ آبادی والے ملک نے 20 کروڑ آبادی والے ملک پر حکومت کر لی۔ چند انگریز اس ملک میں آئے اور اُنھوں نے 40 گنا (اگر States بھی شامل کر لیں تو 100 گنا) بڑے ملک کو کنٹرول کر لیا۔
اگر ہم اُن کے طرزِ حیات کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انگریز کبھی اپنے بچے کو یہ نہیں کہے گا:

No, don't do it!

وہ اپنے بچے کو ناپسندیدہ حرکت کرتے دیکھتا ہے تو کہتا ہے:

O' you have done wonderful. I think you could have done it better.

انگریز پہلے بچے کو Encourage کرتا ہے پھر اُسے Further improve کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ مثلاً بچہ نالی میں ہاتھ ڈالتا ہے تو باپ ڈانٹنے اور No کہنے کے بجائے کہتا ہے:

You did something good, I appreciate, but I think we can do it better.

ساتھ ہی وہ صاف پانی میں ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ اس رویے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بچہ ''No'' نہیں سیکھتا۔ حتیٰ کہ اُن کا تین سال کا بچہ اس قدر Confident ہوتا ہے کہ ہمارے بڑے بڑے بچے بھی اِتنے خوداعتماد نہیں ہوتے۔ بچے کی ان خطوط پر ٹریننگ کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ زندگی کے کسی بھی مرحلہ پر سچ بولتے ہوئے ہچکچاتا نہیں۔

ایک زمانہ میں جو میرے نمبر 2 تھے، عارف عالم، اُن کی والدہ انگریز تھیں اور والد ایس ایم عالم ویسٹ پاکستان کے آئی جی پولیس تھے۔ نمازِ جمعہ کے لیے دفتر میں دو گھنٹے کا وقفہ ہوتا۔ میں نماز پڑھ کر دفتر واپس آ رہا تھا کہ عارف عالم کو سامنے سے آتے دیکھا۔ عارف عالم نے اپنے انگریزی لب و لہجہ میں پوچھا:

Hey Mr. Shah! How are you?

Where are you coming from?

میں نے مختصر جواب دیا:

Mosque.

اُنھوں نے کہا:

Offer you a glass of juice please.

میں نے کہا۔ ٹھیک ہے۔ جوس پیتے ہیں۔ دل میں سوچا کہ میں Pay کر دوں گا۔ میں نے اپنے لیے جوس منگوایا اور اُنھوں نے گھڑا نما برتن میں بیئر منگوائی اور پینا شروع ہو گئے۔ میں جب اُنھیں یاد دلاتا کہ ہم میٹنگ کے لیے لیٹ ہو رہے ہیں تو وہ کہتے

One minute, Mr Shah.

وہی ہوا۔ ہم لیٹ ہو گئے۔ سوا تین بجے میٹنگ ہال میں پہنچے تو میٹنگ شروع ہو چکی تھی۔ میں نے معذرت کی

I am sorry Sir I am late.

باس نے مجھے تو کچھ نہ کہا لیکن عارف عالم سے استفسار کیا کہ آپ کو جمعہ کی نماز پڑھتے ہوئے دیر ہو گئی؟

عارف عالم نے جواب دیا:

No Sir! I did not offer my Juma prayer.

I was sitting in a bar, having beer.

عارف عالم کا جواب سن کر میں سوچتا رہا کہ اگر باس نے یہی سوال مجھ سے کیا ہوتا تو میرے اندر اتنا حوصلہ نہ تھا کہ بتا سکتا کہ میں تو جمعہ کی نماز پڑھنے گیا ہی نہیں بلکہ بار میں بیٹھا شراب پیتا رہا۔
عارف عالم کو یہ جرأت اُس کے بچپن نے دی تھی کہ وہ منافقت کا رویہ اپنانے کے بجائے سچ بولے۔
ایسے لوگ زندگی میں بڑے Dependable اور Reliable کہلاتے ہیں۔
اگر بچوں کو بات بات پر ڈانٹنے اور No, don't do it کہنے کے بجائے Positive way اختیار کرتے ہوئے زیادہ بہتر کام کر کے اُنھیں دکھا دیا جائے تو نہ صرف اُسے زیادہ بہتر عمل کا پتا چل جائے گا بلکہ اُس کے اندر Confidence بھی پیدا ہوگا اور اُس کا ظاہر و باطن بھی ایک جیسا ہو جائے گا۔ جس کی وجہ سے وہ بڑے حوصلے اور جرأت سے سچی اور اصل بات لوگوں سے کہہ پائے گا اور اُن کی نظر میں Dependable اور Reliable قرار پائے گا۔

Personality grooming میں دوسرا اہم عنصر یہ ہے کہ "لوگوں پر تنقید نہ کریں"۔ دوسروں کی خامیوں اور غلطیوں کو دیکھ کر ہم تنقید نہ کریں بلکہ Accept کرلیں کہ یہ بھی میری طرح کا انسان ہے۔ میری طرح اِس میں بھی خوبیاں اور خامیاں موجود ہیں۔ جس طرح لوگ مجھے برداشت کرتے ہیں میں بھی اِسے برداشت کرلوں۔ جب انسان دوسروں کی خامیوں کو اُجاگر نہیں کرتا، اُنھیں تنقید کا نشانہ نہیں بناتا تو وہ لوگوں کے نزدیک بڑا پسندیدہ شخص کہلاتا ہے۔

ہمارے معاشرہ میں ایک اور رویہ بڑا عام ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر گلہ شکوہ کرنا ہمارا معمول ہے۔ ماہرینِ نفسیات کا کہنا ہے کہ اگر آپ اپنی شخصیت کو خوب صورت اور اپنی زندگی کو پُرسکون بنانا چاہتے ہیں تو گلہ شکوہ کرنا چھوڑ دیجیے۔ اگر ایک شخص ٹائم دینے کے باوجود مقررہ وقت پر نہیں پہنچ پاتا تو اُسے دیکھتے ہی گرجنے برسنے کے بجائے نرم رویہ اختیار کریں۔ بجائے یہ کہنے کے کہ "تم نے مجھے اِتنی دیر سڑک کنارے انتظار میں کھڑے رکھا" یہ الفاظ کہیں "خیریت تو تھی کہ تم وعدہ کے باوجود نہ پہنچ سکے۔ تم تو وعدہ کی پاس داری کرنے والے انسان ہو۔" آپ کے اس رویہ کا فائدہ یہ ہوگا کہ اگلی مرتبہ وہ اپنے وعدہ کی پابندی کرتے ہوئے وقت پر آئے گا۔

Personality grooming میں زبان کو گلے شکوے سے محفوظ رکھنا تیسرا عنصر ہے۔

چوتھا نکتہ یہ ہے کہ انسان کی شخصیت کو Impressive بنانے میں لباس بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ لباس ہم وہ پہنیں جو ہماری Physique کو Suit کرتا ہے۔ ایسا لباس ہماری پرسنیلٹی کو Enhance کردے گا۔ جس آدمی کی نظر ہم پر پڑے گی اُس کے دل میں خوشی کا احساس پیدا ہوگا۔

لباس ہمارے جسم کی ساخت کے مطابق ہونا چاہیے۔ اچھے ٹیلر کی پہچان یہ نہیں کہ اُس کی Stitching اور سِلے کپڑے کی تراش خراش اچھی ہو بلکہ اچھا ٹیلر آپ کے جسم کے مطابق کپڑا سیتا ہے۔ اگر جسم بے ڈھب ہوگیا ہے، بیٹھ بیٹھ کر پیٹ بڑھ کر Cylindrical ہوگیا ہے تو ٹیلر کپڑا سیتے وقت اس بات کا خیال رکھے گا کہ پیٹ Cylindrical دکھائی دینے کے بجائے Slim اور Smart دکھائی دے۔

لباس کی مناسب تراش خراش کے ساتھ ساتھ اس کے رنگوں کا انتخاب بھی بہت اہم ہے۔ Light colours کشادگی اور خوشی کا احساس دلاتے ہیں۔ گہرے رنگ انسان کے اندر تنگی کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ اگر ایک بڑے کمرے کی دیواریں آپ نے گہرے رنگ سے Paint کردی ہیں تو یوں لگے گا کہ جیسے دیواریں آپ کی طرف دوڑی چلی آرہی ہیں۔ اِسی طرح اگر ہم نے سردیوں میں گرمیوں کے رنگ، گرمیوں میں سردیوں کے رنگ یا بہار میں خزاں کے رنگ پہنے ہوں تو دیکھنے والے کی آنکھوں پر ہمارا وہ ڈریس بار ہو جائے گا۔

Personality grooming میں الفاظ کا چناؤ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ پانچواں نکتہ یہ ہے کہ ہم اپنے الفاظ کے انتخاب میں محتاط رہیں۔ ہمارے ایک گریڈ 22 کے افسر جو ہماری منسٹری میں آنے سے پہلے منسٹری آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی میں فیڈرل سیکرٹری تھے، کراچی ٹور پر آئے ہوئے تھے۔ ہم بھی وہیں تھے۔ ایک

افسر نے پوچھا "سر! آپ رات کراچی میں رُکیں گے؟" اب میرے جیسے انسان کا جواب تو یہ ہوتا کہ کیوں نہیں رُکوں گا۔ تم نے ابھی تک میری بکنگ ہی نہیں کرائی؟ لیکن اُن آفیسر نے بہت خوب صورت انداز میں کہا:

Well, I think, I should look into the possibility of staying in Karachi over night.

جو بات چند لفظوں میں کہی جاسکتی تھی، انھوں نے ایک طویل جملے میں کہی۔ یہ ایسا اندازِ گفتگو ہے جس میں قطعیت نہیں، دوٹوک انداز نہیں۔

میں نے دیکھا ہے کہ پڑھے لکھے لوگ ہماری طرح دوٹوک انداز میں نہیں کہتے۔

Will you do it?

بلکہ وہ نام لے کر مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

Mr.....! I think, you may consider doing it for me.

یا یوں کہتے ہیں:

I think, you may like to consider it doing for me.

ایک متاثر کن شخصیت کا مالک انسان الفاظ کے چناؤ کا بہت دھیان رکھتا ہے۔

چھٹا نکتہ۔ Personality grooming کے دوران اس بات کا بھی بہت خیال رکھا جاتا ہے کہ ملاقات کے وقت بلاوجہ بے تکلفی کا اِظہار نہ کیا جائے۔ ہم جن سے بھی ملیں، خاص طور پر سینئر لوگ (خواہ وہ عمر میں سینئر ہوں یا دُنیاوی عہدہ میں) اُن سے غیر ضروری بے تکلفی کا مظاہرہ نہ کریں۔ یہ اس قدر ناپسندیدہ حرکت ہے جو ہماری Personality کو زیرو پر لے جاتی ہے۔

آپ نے خود بھی محسوس کیا ہوگا کہ کوئی صاحب آپ سے دوسری یا تیسری بار مل رہے ہیں، دُور سے بازو پھیلاتے ہوئے بڑی بے تکلفی سے بآوازِ بلند "کیا حال ہیں آپ کے" کہتے ہوئے اِنتہائی گرم جوشی اور بے تکلفانہ انداز میں آپ سے بغل گیر ہوتے ہیں اور آپ دل میں عجیب احساسات لیے سوچ رہے ہوتے ہیں کہ میں تو اِنھیں زیادہ نہیں جانتا۔

ہمیں اپنی بے تکلفی کا لیول Appropriate رکھنے کے لیے Conscious رہنا چاہیے کیونکہ بہت Reserved انسان بھی پسندیدہ نہیں ہوتا اور بہت بے تکلف انسان بھی زیادہ پسند نہیں کیا جاتا۔

ساتواں نکتہ۔ غیبت سے دُور رہنا بھی Personality grooming کا اہم حصہ ہے۔ ہم کسی کی غیر موجودگی میں وہ بات نہ کہیں جو ہم اُس کے سامنے نہیں کہہ سکتے یا ہم اُس کے سامنے وہ بات کہیں تو اُس کا دل دُکھے۔ پرسنیلٹی گرومنگ کی سائنس تو پچھلے 25,30 سال میں Develop ہوئی لیکن آپ ﷺ نے یہ تمام باتیں چودہ سو سال پہلے نہ صرف بیان فرمائیں بلکہ Exercise بھی کیں۔ آپ ﷺ نے غیبت سے منع فرمایا، اُٹھنے بیٹھنے، گھر میں داخل ہونے کے آداب سکھائے کہ اگر آپ کسی کے گھر جائیں اور تین بار دستک دینے کے باوجود اندر سے جواب نہ آئے تو واپس آجائیں اور اس بات کو مائنڈ نہ کریں۔ آپ ﷺ نے جسم

اور لباس کی صفائی پر بہت زور دیا۔ ایک اور بات جو بہت کم سامنے آئی لیکن جس کی آپ ﷺ نے بہت تاکید فرمائی وہ یہ ہے کہ آپ کے جوتے صاف ہوں، گردآلود نہ ہوں اور بال Arranged and well combed ہوں۔ آپ ﷺ نے متوازن آواز کو پسند فرمایا۔ نہ اِتنی مدھم آواز میں بات کی جائے کہ سامع کو بات سمجھنے میں دقت پیش آئے اور نہ اِتنی بلند آواز ہو کہ سننے والے کو ناگواری محسوس ہو۔ بلند آواز کو گدھے کی آواز سے مشابہ قرار دیا گیا ہے۔

دینِ اسلام میں چھوٹوں سے شفقت کا رویہ رکھنے اور بڑوں کا احترام کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ آدابِ مجلس سکھائے گئے ہیں۔ جھوٹ سے بچنے اور دوسروں کی مدد کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

بجائے انگریزوں اور West کے اطوار نقل کرنے کے ہم چودہ سو سال پہلے بتائے گئے طریقوں اور آداب کو اپنا لیں۔ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کی نقل کر لیں تو ہماری Personality بڑی پسندیدہ ہو جائے گی۔

جو West تہذیب و تمدن میں اسلام سے چودہ سو سال پیچھے ہے ہم اُس کو کیوں Follow کرنا چاہتے ہیں؟

مجھے نہیں معلوم کہ آپ میں سے کس کس کا واسطہ کسی ولی اللہ یا فقیر سے پڑا یا آپ میں سے کس کس نے کسی فقیر کے ساتھ وقت گزارا۔

اگر آپ کو کبھی ایسا موقع ملے تو آپ Observe کریں گے کہ فقیر نہ تو کسی کی غیبت کرتا ہے اور نہ کسی کا بُرا چاہتا ہے۔ جب سب آپ کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں تو فقیر آپ کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا رہے گا، آپ کا بار اُٹھائے گا۔ وہ کبھی میلے کپڑوں میں نظر نہیں آئے گا۔ اُس کے لباس سے خوشبو اُٹھتی محسوس ہوگی۔ وہ کبھی زیادہ بے تکلفی کا مظاہرہ نہیں کرے گا نہ ہی زیادہ Reserve دکھائی دے گا۔ دوسروں کی خامیوں کو نظرانداز کر دے گا اور معاف کرنے میں بہت جلدی کرے گا۔

وہ لوگ جو قسمت کے دھنی تھے، اُنھیں فقیر کے ساتھ جب وقت گزارنے کا موقع ملا تو اُنھوں نے یہ سب عادات و فضائل اور آداب اُن سے Pick کر لیے۔ ہم اپنی پرسنیلٹی کو بڑی آسانی سے Groom کر سکتے ہیں لیکن شرط صرف یہ ہے کہ آپ کو اور مجھے کبھی کسی فقیر کی صحبت میں کچھ وقت گزارنے کا موقع مل جائے۔

سوال: آپ کا کیا خیال ہے نشاۃِ ثانیہ ہماری زندگی میں ہو جائے گی یا ابھی اِس میں تاخیر ہے؟

جواب: میرا ذاتی تجربہ ہے کہ وقت کا تعین نہیں کیا جا سکتا، یہ علم الغیب کا وہ حصہ ہے جو اللہ کسی کو عطا نہیں کرتا۔ اگر کوئی وقت کا تعین کر دے تو رب تعالیٰ اُسے جھوٹا کر دیتا ہے بالکل اُسی طرح جس طرح رب دعویٰ کرنے والے کو جھوٹا ثابت کرتا ہے۔ لیکن انشاءاللہ حالات پلٹا کھائیں گے اور مسلمان ایک بار پھر حکمرانی کریں گے۔

سوال: کائنات بہت وسیع ہے، زمین کی حیثیت ایک نقطے کے برابر بھی نہیں، پھر زمین کو اتنی اہمیت کیوں حاصل ہے؟

جواب: بہت Simple سا جواب ہے۔ رب کا نائب اور خلیفہ اس Planet زمین پر بستا ہے۔ جہاں نمبر 1

ہوتا ہے وہاں کی اہمیت سب سے زیادہ ہوتی ہے اِس کے بعد اُس جگہ کی اہمیت ہوتی ہے جہاں نمبر 2 ہوتا ہے۔

وزیرِاعظم پاکستان اسلام آباد میں بیٹھے ہوئے ہیں اس لیے اسلام آباد کی اہمیت بہت ہے۔ اسلام آباد کے بعد Provincial capitals کی اہمیت ہے کیونکہ وہاں صوبوں کے وزرائے اعلیٰ ہوتے ہیں۔

رب تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے لیکن اُس کی Virtual نشست عرشِ معلیٰ پر ہے۔ یوں سب سے زیادہ اہمیت عرشِ معلیٰ کی ہے اور اُس کے بعد اُس planet کی اہمیت ہے جہاں رب کا نمبر 2 ہے۔

سوال: کیا ہماری کہکشاں کائنات کے درمیان میں ہے؟

جواب: جی ہاں! ہماری کہکشاں (Galaxy) کائنات کا تقریباً Centre بنتی ہے۔

سوال: کیا آپ کی ملاقات کبھی کسی شہید سے ہوئی؟ اور کیا آپ نے کبھی اُس سے رب کے دیدار کے بارے میں پوچھا؟

جواب: میں استنبول میں تھا۔ استنبول کے قلعہ کے نزدیک ایک مقام ہے جہاں ہمارے اسلاف سمندر سے خشکی کے اُس ٹکڑے تک آئے تھے جس پر اُنھوں نے بیلوں کو ذبح کر کے اُن کی چربی ملی تھی پھر اُس چکنی زمین پر سے بحری جہازوں کو دھکیلتے ہوئے دوبارہ سمندر میں لانے کے بعد قلعہ پر Attack کیا تھا۔ اس قلعہ کے ساتھ تھوڑی سی جگہ ہے جہاں 32 صحابہ کرامؓ دفن ہیں جن میں آپ ﷺ کے رضاعی بھائی حضرت احمد الانصارؓ بھی شامل ہیں۔ جب میں نے وہاں حاضری دی تو حضرت احمد الانصارؓ نے نامعلوم کیوں مہربانی فرمائی اور ملاقات کا شرف بخشا۔ اُن کے انداز میں اس قدر گرم جوشی تھی کہ مجھے اُس تپاک کے سوا کچھ یاد ہی نہیں رہا کہ اُن سے کوئی سوال کر سکتا۔ اُن سے ملاقات کے بعد جب باہر نکلا تو وہاں 15,16 صحابہ کرامؓ کی اکٹھی آرام گاہ ہے۔ یہ وہ صحابہؓ ہیں جو قلعہ کی فصیل پر چڑھتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ اُن میں سے ایک صحابیؓ سے ملاقات ہوئی تو میں اُن کی Personality کے سحر میں کھویا رہا۔ اُنھوں نے جو کچھ فرمایا وہ تو بیان نہیں کر پاؤں گا لیکن میرے اندر اُن سے یہ پوچھنے کا خیال نہیں آیا کہ شہادت کے وقت جب آپ کو رب تعالیٰ کا دیدار ہوا تھا تو آپ کی کیا کیفیت تھی۔ دراصل یہ پوچھنے کے لیے بڑا آدمی ہونا ضروری ہے تاکہ ملاقات کے وقت وہ صحابہ کرامؓ کی شخصیت کے سحر میں نہ کھویا رہے بلکہ سوال و جواب بھی کر سکے..... میں وہ عظمت کہاں سے لاؤں!!!

نشست نمبر 34

تصوف اور غلط فہمیاں

سوال: کیا صاحبانِ طریقت اور صاحبانِ کشف و اِلہام نبوت کے دعوٰی دار ہیں؟

جواب: ہرگز ایسا نہیں۔ مسلمان ہونے کی اِبتدا ہی یہاں سے ہے کہ اللہ ایک ہے، اُس کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں۔ یہ ہمارے ایمان کا حصہ ہے کہ نبوت تمام ہو چکی۔ آپ ﷺ نبی آخرالزماں ہیں۔ اب قیامت تک کوئی نبی یا رسول نہیں آئے گا۔

وہ لوگ جو شریعت کے پابند رہے اور تقویٰ میں اِس حد تک چلے گئے کہ رب اُن سے راضی ہو گیا اور اُنھیں اپنا دوست بنا لیا تو وہ کیسے جسارت کر سکتے ہیں کہ نبوت کا دعوٰی کریں جب کہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ نبوت کا داعی نہ صرف دائرہ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے بلکہ اپنے آپ کو ہمیشہ گمراہی کے اندھیروں میں ڈبو دیتا ہے۔ اولیائے کرام کبھی بھی نبوت کے دعوٰی دار نہیں رہے اور نہ وہ ایسا سوچنے کی جسارت کر سکتے ہیں۔

سوال: اللہ اپنے بندوں کو باوقار دیکھنا چاہتا ہے لیکن کچھ لوگ تلقین کرتے ہیں کہ آپ دوسروں کے لیے Footmat بن جایئے۔

جواب: ہمارے ذہن میں کبھی کنفیوژن پیدا نہ ہو اگر ہم الفاظ پر نظر رکھنے کے بجائے گفتگو یا جملے کی رُوح تک چلے جائیں۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ دوسروں کے لیے Footmat بن جایئے تو اِس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ کمرے کے دروازے پر لیٹ جائیں اور لوگ آپ پر رگڑ کر جوتے صاف کر کے اندر داخل ہو جائیں۔

جب ہم کلاس تھری میں تھے تو ایک لطیفہ سنا تھا کہ ایک سردار مٹی میں لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ کسی نے پوچھا ''یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟'' سردار بولا ''میں نے سنا ہے کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے۔''

سردار جی کی طرح ہم بھی ظاہری لفظوں پر نہ جائیں بلکہ اُن لفظوں کا اصل مفہوم سمجھنے کی کوشش کریں۔ دوسروں کے لیے Footmat بننے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے اندر موجود سارے بت توڑ ڈالیں۔ دوسروں کے لیے بہتر اور عاجز انسان بن جائیں۔ ہمارے اندر علم، تقویٰ، انا اور عاجزی کے بت ہوتے ہیں۔ ہم ان سب کو توڑ ڈالیں۔ جب تک ہم اِن بتوں کی پوجا کرتے رہتے ہیں، علم سے دُور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جب ہم سچی عاجزی اختیار کرتے ہیں تو اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ ناقابلِ بیان عظمت عطا کرتا ہے۔

جب میں یہ کہتا ہوں کہ جو انسان لوگوں کے لیے Footmat بن جاتا ہے رب تعالیٰ اُسے لوگوں کے

سر کا Hat بنا دیتا ہے تو میں اولیائے کرام کی مثال دیا کرتا ہوں جنھوں نے عاجزی اختیار کی، اپنے پاس آنے والوں سے خود کو چھوٹا سمجھا۔ اِس کے نتیجے میں اُنھیں جو انعامات حاصل ہوئے اُن میں سے ایک انعام ہم بھی دیکھ سکتے ہیں۔ داتا صاحب رحمتہ اللہ علیہ کو دُنیا سے رُخصت ہوئے کئی صدیاں بیت گئیں لیکن اُن کی خدمت میں حاضری دینے والے آج بھی وہاں سے اُلٹے قدموں واپس آتے ہیں۔ اُن کی طرف پشت نہیں کرتے۔

عاجزی اِختیار کرنے سے انسان بے وقار نہیں ہوتا۔ عاجزی پیغمبروں کا شیوہ ہے۔ یاد رکھیے! پیغمبروں کی تعلیم کا بندوبست رب تعالیٰ خود کرتا ہے۔ یہ اُن کی تعلیم کا حصہ ہے کہ عاجزی اِختیار کی جائے۔ ہر انسان کو خود سے بہتر سمجھ کر اُس کی عزت کی جائے اس سے بے پناہ انعامات حاصل ہوتے ہیں۔

سوال: سورۃ ابراھیم کی آیت نمبر 22 میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اور کہے گا شیطان جب چکا دیا جائے گا فیصلہ۔ بے شک اللہ نے تم سے وعدہ کیا تھا
سچا وعدہ اور میں نے بھی تم سے وعدہ کیا لیکن میں نے اُن میں سے کوئی بھی پورا نہ کیا
لیکن نہ تھا میرا تم پر کوئی زور البتہ میں نے تم کو دعوت دی تھی اور تم نے لبیک کہا میری
دعوت پر۔ سو مت ملامت کرو تم مجھے بلکہ ملامت کرو اپنے آپ ہی کو۔''

جواب: یہ بات سمجھانے کے لیے آسان لفظ استعمال کروں گا۔ آپ لفظ نہیں اُن کی رُوح دیکھیے گا۔ انسان کو نفس کی خواہشات بُرائی کی طرف لے جاتی ہیں۔ شیطان نفس کے ذریعے Attack کرتا ہے۔ جس طرح دُنیاوی قانون کی نظر میں جرم کی پلاننگ کرنے والا بھی اُتنا ہی مجرم ہے جتنا اُس جرم کو Execute کرنے والا۔

شیطان ہمارے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے اور نفس اُس خیال کی پیروی کرتے ہوئے ہمیں گناہ کی طرف لے جاتا ہے اور اُس شے کی خواہش کرتا ہے یوں Blame براہِ راست شیطان پر ہی آئے گا کہ وہ نفس کے ذریعے Operate کرتا ہے۔

سوال: اکثر یہ ہوتا ہے کہ قرآن پاک کا ترجمہ پڑھتے ہوئے کبھی کوئی معنی سمجھ آتے ہیں تو کبھی کوئی اور نئی راہ سجھائی دیتی ہے۔

جواب: اِس کی توجیہات ہیں:

1۔ جب ہم کسی چیز کو دیکھتے ہیں تو اُس وقت ہم جس ذہنی کیفیت میں ہوتے ہیں اُس ذہنی کیفیت اور سوچ کا رنگ اُس چیز کے رنگ میں داخل ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم خوش گوار موڈ میں ہوں اور کوئی شخص بُری بات کہہ دے تو ہم بُرا ماننے کے بجائے ہنس کر ٹال دیتے ہیں۔
اور اگر بعینہٖ وہی جملہ اور وہی بات کوئی ہمیں ایسے لمحے میں کہے جب ہم ذہنی طور پر جھنجھلاہٹ کا شکار ہوں تو اُس شخص سے اُلجھ پڑتے ہیں، اُس کی بات برداشت نہیں کرتے۔
انسان کی اُس وقت کی سوچ اُسے ایک Myopic view دیتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ ہم کسی

کتاب میں کوئی جملہ یا نکتہ بار بار پڑھتے ہیں لیکن اُس کی سمجھ نہیں آتی۔ ایک دن ایسا ہوتا ہے کہ اچانک ایک لمحہ میں اُس کا مطلب Flash ہوتا ہے اور یک دم وہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ مہینوں کی کوشش جس نکتہ کو Clear نہیں کر پاتی ہم لمحوں میں اُس کو حل کر لیتے ہیں۔ ایسا ہماری ذہنی و اندرونی کیفیت کے زیرِ اثر ہوتا ہے۔ یہ تو اس کی سائنسی توجیہہ ہے۔ دوسری رُوحانی توجیہہ ہے۔

2۔ قرآن پاک کے ایک ظاہری اور دس مخفی معانی ہیں۔ انسان کی رُوح پاکیزگی و بالیدگی کے جس مقام پر پہنچتی جاتی ہے اُسی درجے اور مقام سے قرآن پاک کے مخفی معانی اُس کی سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔ جس وقت ہم پاکیزہ خیالات میں ہوں اُس وقت قرآن پاک کے الفاظ میں ہمیں روشنی مختلف نظر آئے گی۔ اگر ہماری سوچ پاکیزہ نہیں تو اُس وقت قرآن پاک کی تلاوت کے اثرات اور مفہوم کا ادراک مختلف ہوگا۔

اس لیے میں عرض کیا کرتا ہوں کہ قرآن پاک ترجمے کے ساتھ پڑھتے رہا کریں۔ جو سمجھ میں آتا ہے آنے دیجیے اِس پر Confuse نہ ہوں۔ اسی طرح قرآن پاک کی کسی آیت کو سیاق و سباق جانے بغیر سمجھنے کی کوشش کریں گے تو اُس کے معنی واضح نہیں ہوں گے۔

قرآن پاک کی دو تراتیب ہیں:

1۔ ترتیب نزولی

2۔ ترتیب کتابی

ایک ہی Subject پر 30 پاروں میں مختلف مقامات پر مختلف آیات مل جاتی ہیں جب تک ہم اُن تمام آیات کو اکٹھا کر کے نہیں دیکھیں گے ہمیں اصل معنی سمجھ میں نہیں آئیں گے۔

ایک اور توجیہہ یہ ہے کہ قرآن پاک کی ایک خاص ترتیب ہے۔ سورۃ البقرہ تقریباً ڈھائی پاروں پر مشتمل ہے۔ یہ اصل احکامات کا Gist اور زندگی گزارنے کا آئین ہے۔ باقی ساڑھے ستائیس پارے اِس آئین کی تشریح ہیں۔

زندگی کا کوئی بھی شعبہ ہو، کوئی Dimension ہو اُس سے متعلقہ احکامات سورۃ البقرہ میں مختصراً مل جائیں گے اور اس کی تشریح باقی پاروں میں کہیں نہ کہیں موجود ہوگی۔ جب ہم اِن احکامات کو تشریح کے ساتھ دیکھتے ہیں تو بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔

بعض اوقات ایک مسئلہ پر ایک آیت کسی سورہ میں ملتی ہے تو اُسی مسئلے سے متعلق چھ سات آیات باقی سورتوں میں مل جاتی ہیں۔ جب ہم اُنھیں ملا کر دیکھتے ہیں تو معنی واضح ہو جاتے ہیں۔

قرآن پاک کو سیکھنے سے زیادہ سمجھنا ضروری ہے۔ جب ہم پورا قرآن پڑھ لیں گے، اُس کا ترجمہ پڑھیں گے اور معنی سمجھ لیں گے تو پھر جب بھی کوئی مسئلہ درپیش ہوگا فوراً ذہن میں Flash ہوگا کہ فلاں فلاں سورہ کی فلاں فلاں آیت میں اسے بیان کیا گیا ہے۔ جب ہم اُن آیات کو Integrate کر کے پڑھیں گے تو مسئلہ

کے حل تک پہنچ جائیں گے۔ اگر ہم آیات کو Integrate کیے بغیر پڑھیں گے تو اسی طرح اُلجھن کا شکار رہیں گے۔

سوال: معاشرے میں تبدیلی اُوپر سے نیچے یا نیچے سے اُوپر آتی ہے جب کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بندہ انفرادی طور پر ٹھیک ہو جائے تو اچھا حکمران آ جائے گا۔

جواب: دُنیاوی یا مغربی تعلیم تو یہ کہتی ہے کہ تبدیلی اُوپر سے نیچے کی طرف Travel کرتی ہے لیکن رُوحانیت میں کہا جاتا ہے کہ انسان خود ٹھیک ہو جائے تو معاشرہ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔ روشنی سے دیا نہیں جلتا، دیا جلنے سے روشنی ہوتی ہے۔

معاشرہ کیا ہے؟ اکائیوں کے مجموعہ کا نام معاشرہ ہے۔ ایک خطہ میں جتنے لوگ بستے ہیں، اُن کی اجتماعی زندگی معاشرہ ہے۔ اگر اکائی ٹھیک نہیں تو بہت سی اکائیوں کا حاصل جمع بھی کبھی درست نہیں ہو سکتا۔ جیسی اکائی ہوگی ویسا ہی اکائیوں کا حاصل جمع ہوگا۔ اِس لیے رب تعالیٰ نے فرما دیا کہ جیسی قوم ہو ویسا ہی حکمران اُس پر مسلط کر دیا جاتا ہے:

"اور یونہی ہم ظالموں میں ایک دوسرے پر مسلط کرتے ہیں بدلہ اُن کے کیے کا۔" (الانعام:129)

اچھے حکمران کا اِنتظار ذہنی تساہل کی نشانی ہے۔ جب ہم اِس انتظار میں بیٹھ جاتے ہیں کہ کوئی نیک آدمی لیڈر بن جائے گا تو سارا معاشرہ ٹھیک ہو جائے گا تو انفرادی طور پر خود کو ٹھیک کرنے کی تحریک ختم ہونے لگتی ہے۔

اگر ہم میں سے ہر ایک تہیہ کر لے کہ باقی سب اچھے ہیں، بس میں بُرا ہوں، مجھے اپنے آپ کو ٹھیک کرنا ہے۔ پھر جب الیکشن ہوں گے تو اچھی عوام میں سے منتخب شدہ حکمران اچھا ہی ہوگا۔

سوال: دارالاحسان میں ایک مینار "مینارِ صفا" کے نام سے زیرِ تعمیر ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اِس مینار کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد بڑی تبدیلی آئے گی۔

جواب: مینار ایک خاص کلچر کی علامت ہے۔ گرجا گھر ہوں، گردوارے یا مندر، ان کا مخصوص طرزِ تعمیر ایک خاص کلچر کی عکاسی کرتا ہے۔ اِسی طرح مسلمانوں کی عبادت گاہوں میں مینار نظر آتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مختلف ملکوں کی عبادت گاہوں میں اِن میناروں کی تعداد مختلف ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں چار مینار چار خلفائے راشدین کو Depict کرتے ہیں اور گنبد کا مطلب ہے کہ ہم آپ ﷺ کے اُمتی ہیں۔ ترکی اور سعودی عرب میں آپ کو ایک یا تین مینار بھی دکھائی دیتے ہیں۔

جناب صوفی برکت علی صاحب بہت بلند پایہ صاحبِ علم گزرے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُنھیں غریقِ رحمت کرے اور اُن کے درجات بلند فرمائے۔ میں خود کو اِس قابل نہیں سمجھتا کہ کسی صاحبِ علم کی فرمائی ہوئی بات پہ Comment کروں۔ حضور! آپ اِتنے چھوٹے اور معمولی آدمی سے یہ بات پوچھنے آئے ہیں جس کے پاس بصیرت ہے نہ فہم۔ دُنیا میں جتنے بھی لوگ کام کر رہے ہیں، علم پھیلا رہے ہیں میری ذاتی رائے ہے کہ وہ

مجھ سے کہیں بلند ہیں۔ میں اُن کے سامنے بالکل بے حقیقت انسان ہوں۔ صوفی برکت علی صاحب نے اگر اس مینار صفا کے بارے میں ایسا فرمایا ہے تو بالکل صحیح فرمایا ہوگا۔ مجھے اِس قصے کا علم نہیں۔ میری اُن سے Physically صرف ایک ملاقات ہوئی تھی۔ وہ دوسرے آدمی تھے جنھوں نے مجھے تصوف کی اِس راہ کی خبر دی تھی۔

مینار صفا والی بات میرے علم میں نہیں اس لیے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مینار مکمل ہونے کے بعد پاکستان میں کوئی بڑی تبدیلی آجائے گی البتہ یہ میں ضرور جانتا ہوں کہ پاکستان کی بہتری کے لیے تبدیلی زیادہ دُور نہیں۔

It is just around the corner.

تبدیلی آنے کو ہے، انشاءاللہ یہ آکر رہے گی۔ اللہ تعالیٰ بہتر ہی فرمائے گا۔ انشاءاللہ!

سوال: اسلامی بینکنگ حرام ہے یا حلال؟ کیا یہ سود کے زمرے میں آتی ہے؟

جواب: میں مفتی نہیں اور نہ فتویٰ دینے کا مجاز ہوں۔ ہم اسلامی ملک میں رہتے ہیں۔ اسلامی شعار کی پابندی کرانا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ حکومت کی قائم کردہ اسلامی نظریاتی کونسل کا فتویٰ یہ ہے کہ اسلامک بینکنگ حلال ہے اور اِس میں کوئی حرج نہیں۔ اسلامی ملک میں رہتے ہوئے اسلامی نظریاتی کونسل کا فتویٰ تسلیم کرلینا چاہیے۔ اگر اِس میں کوئی غلطی ہوگی تو اِس کا تمام بوجھ حکومت پر ہوگا ہم پر نہیں۔

سوال: ہر رُوح کا اپنا رنگ، خوشبو اور Controlling word ہوتا ہے۔ کیا پڑھائیوں کے نتیجے میں یہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں؟

جواب: یہ Fix ہیں یہ تبدیل نہیں ہوتے۔ البتہ آپ کو اولیائے کرام کی جو خوشبو وقتاً فوقتاً تبدیل ہوتی محسوس ہوتی ہے وہ اُن کی روح کی خوشبو نہیں ہوتی۔ وہ رب کی عنایات میں سے ایک عنایت ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کو خوشبو عطا فرماتا ہے۔ آپ اللہ کے دوستوں کے کسی حصے کو سونگھیں تو وہاں مختلف خوشبو آپ کو محسوس ہو گی۔ یہ دراصل اُس پڑھائی کا انعام ہے جس کا ولی اللہ ورد کرتا رہتا ہے۔ جب بھی وہ کسی پڑھائی کا لمبے عرصے کے لیے ورد کرے گا اُس کے جسم سے خوشبو اُٹھتی محسوس ہوگی۔

سوال: کسی بھی پڑھائی یا ورد کی Calculations میں جن Factors کو مدنظر رکھا جاتا ہے اگر مناسب سمجھیں تو اُن پر روشنی ڈال دیں۔

جواب: میں نہ صاحب علم، نہ صاحب نظر، نہ صاحب فہم ......اور سچی بات ہے کہ Calculations کبھی میرے ذہن میں نہیں آئیں کیونکہ میں مسلمان ہوں اور مسلمان حساب میں کچا ہوتا ہے۔

میرے مرشد صاحب نے مجھے ایک پڑھائی دی تھی اور اُس کا دورانیہ بھی بتایا تھا اور فرمایا تھا کہ جب وہ مدت پوری ہو جائے تو پھر اسے گھٹا کر ایک چوتھائی کر دینا۔ ایک لمبا زمانہ تھا۔ جب پڑھائی کا دور پورا ہونے کو تھا تو میں اُس کا اِس حد تک عادی ہو چکا تھا کہ آخری دن جان بوجھ کر ناغہ کرلیا اور اگلے دن سے دوبارہ زیرو سے اسے شروع کرلیا۔ اِس بات کو 35,36 سال ہو گئے۔ میں یہ حرکت تین بار کر چکا ہوں کہ جب بھی دور مکمل ہونے کو ہوتا ہے تو آخری دن ناغہ کر لیتا ہوں اور اگلے دن وہ پڑھائی زیرو سے شروع کر لیتا ہوں۔

اللہ کو یاد کرنے میں Calculations اور حساب کیا کرنا؟ جس رب نے مجھے عطا کرتے وقت کبھی حساب کتاب نہیں رکھا اور بے حساب رحمتیں نازل کیں اُس رب کو پکارتے وقت میں Calculations کیوں کروں!

رُوحانیت میں اُس شخص کو کبھی کچھ نہیں ملا جس نے حساب کتاب میں زندگی گزاری، جس نے گن گن کر رب کو پکارا۔ لیکن جس نے عشق میں ڈوب کر رب تعالیٰ کو پکارا اُس کو تھوڑے ہی عرصے میں رب مل گیا۔ رب کو پکارنے میں حساب کیسا؟

سوال: ہر صدی کے آخر میں جو مجدد آتا ہے کیا وہ کسی خاص خطے یا معاشرے کے لیے ہوتا ہے یا تمام اُمت مسلمہ کے لیے؟ ایک وقت میں کتنے مجدد دین کی تجدید کی Assignment پر کام کر رہے ہوتے ہیں۔

جواب: مجدد پوری اسلامی دُنیا کے لیے ہوتا ہے لیکن وہ جس ملک میں پیدا ہوا اور جہاں بیٹھا ہے وہاں اُس کے اثرات زیادہ ہوں گے۔ اُس کی زندگی کا اُسلوب اُس معاشرے کے مطابق ہوگا لیکن اُس کے Works پوری اسلامی دُنیا کے لیے پیغام ہوتے ہیں۔ ایک وقت میں ایک مجدد پیدا ہوتا ہے، دو نہیں۔

سوال: ہم آپ سے رب کی محبت کی وجہ سے محبت کرتے ہیں۔ آپ سے ملاقات و زیارت کا مقصد رب کی محبت کے حصول کے سوا کچھ نہیں۔ آپ کے ساتھ بہت سے لمحات گزارنا اور بہت کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔ کیا مرشد کے ساتھ وقت گزارے اور براہ راست شناسائی کے بغیر بھی تعلیم، تربیت اور تزکیہ کے مقاصد کا حصول ہو جاتا ہے؟ ہم تو آپ کو مرشد سمجھتے ہیں۔

جواب: کچھ لوگ مجھے گھر پر ملنے آئے۔ بوقت رُخصت کہنے لگے "شاہ صاحب! کبھی آپ ہمارے گھر آئیے۔" میں نے کہا "جب اللہ کو منظور ہوگا۔ حاضر ہو جاؤں گا۔" اُنھوں نے میری Wife سے کہا کہ آپ ان سے کہیے، آپ کی بات مان جائیں گے۔ اُنھوں نے کہا "میں کہہ دیتی ہوں لیکن اس سے پہلے میری درخواست ہے کہ شاہ صاحب سے کہیے کہ کبھی آپ اپنے گھر بھی آجایا کریں۔"

جس شخص کے پاس اپنے گھر جانے کا ٹائم نہ ہو وہ کسی کے ساتھ کیا وقت گزارے گا۔ اگر آپ مجھ سے پیار کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ آپ کو اِس کی جزا دے، آپ کو خوش رکھے اور آپ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ جہاں تک مجھ سے، اکتساب فیض کی بات ہے تو بھائی! میں کون سا اچھا اور نیک انسان ہوں جو آپ کو اچھائی اور نیکی سکھاؤں گا۔ آپ کسی بھلے اور نیک آدمی کو مرشد پکڑیے تاکہ آپ اچھی راہ پر چل سکیں۔

سوال: ایک زندہ انسان کسی قریب المرگ کو اپنی زندگی کیسے دے سکتا ہے؟

جواب: بھائی! اگر کسی کو ایک شخص سے پیار ہے اور وہ شخص عالم نزع میں ہو تو پیار کرنے والا شخص اللہ کے حضور

بڑے سچے دل اور اخلاص سے دُعا کردیتا ہے کہ یا باری تعالیٰ! تو انھیں زندگی بخش دے۔ اگر ان کی زندگی کے دن پورے ہوگئے ہیں تو بے شک میری زندگی سے کچھ سال انھیں دے کر ان کی عمر دراز کردے۔

رب تعالیٰ دُعاؤں کو قبول کرنے والا ہے۔ اُس کی رحمت سے اُمید یہ ہے کہ وہ اُس شخص کی زندگی سے بھی سال نہ لے اور جس کے لیے دُعا کی گئی ہے اُسے بھی مہلت دے دے، اُس کی عمر دراز کردے۔

سوال: (الف) سجدہ میں جب ہم زمین پر سر رکھتے ہیں تو لگتا ہے کہ جیسے حرف ''ن'' بن گیا ہو۔ رُکوع میں 7 کا ہندسہ بنتا ہے۔ کیا یہ حقیقت ہے یا میرا وہم؟

(ب) کیا سورۃ البلد میں لفظ ''طاق'' سے مراد ہماری آنکھوں کے اندرونی گھڑے ہیں؟

جواب: اگر دُنیاوی زبان میں بات کریں تو نماز یوگا کی اِنتہائی Advanced form ہے۔ اگر کوئی اِسے پانچ وقت پابندی سے پڑھے تو اُس کے جسمانی اعضا لمبے عرصے تک قائم و دائم رہتے ہیں ماسوائے اِس کے کہ انسان کو خدانخواستہ کوئی بڑی بیماری نہ لگ جائے۔

کس طرح کے Postures میں کون سے الفاظ، حروف یا ہندسے بنتے ہیں، میں نے اِن پر کبھی غور نہیں کیا۔

سجدہ تعظیم کی اِنتہا ہے اور اِس درجہ کی تعظیم صرف رب تعالیٰ کو سزاوار ہے۔ سجدہ کرتے ہوئے ''ن'' بنتا ہے یا کوئی اور حرف، اِس سے کوئی غرض نہیں...... غرض تو بس یہ ہے کہ پوری عاجزی سے سجدہ ہوجائے۔

رُکوع میں جاتے ہوئے 7 کا ہندسہ نہیں بنتا۔ ہمیں رکوع میں اِس انداز میں جانا چاہیے کہ ہماری کمر گردن اور سر ایک لائن میں رہیں۔ یوں کہہ لیں کہ اگر انگریزی حرف ''L'' کو کھڑا کردیں تو بالکل اِسی طرح کمر بالکل سیدھی ہو۔ کمر کو ٹانگوں کے ساتھ 90 ڈگری کا زاویہ بنانا چاہیے۔ یہ رُکوع کا صحیح Posture ہے۔

اِسی طرح جب ہم سجدہ کرتے ہیں تو ماتھا اور ناک کی Tip زمین کو Touch کرتے ہیں۔ اِس دوران ہماری کمر سیدھی رہنی چاہیے۔ کمان نہ بنے۔ مودّب سجدے کا یہی انداز ہے۔ نماز کے مختلف ارکان ادا کرتے ہوئے کون سا حرف یا ہندسہ بنتا ہے میں نے کبھی اِس پر تحقیق نہیں کی۔ نماز میں ہم رب تعالیٰ کی بڑائی بیان کرتے ہیں۔ نماز کی نیت کرتے ہوئے جب ہم تکبیرِ اولیٰ پڑھتے ہیں تو کانوں تک ہاتھ لے جاتے ہیں۔ اِس دوران ہماری ہتھیلیاں باہر کی طرف ہوتی ہیں جو ظاہر کرتی ہیں کہ:

1۔ ہم رب کی بڑائی بیان کررہے ہیں۔ عام طور پر جب ہم کسی شے کی اِنتہا کو ظاہر کرتے ہیں تو ہاتھ کھڑے کردیتے ہیں۔

2۔ کان کی لو کو چھونا اللہ کے حضور توبہ کا خواست گار ہونے کی علامت ہے کہ اے اللہ! تو سب سے بڑا ہے۔ ہم کچھ نہیں۔

نماز تو اصل میں رب تعالیٰ کی شکر گزاری کا انداز ہے۔ اُس کی بڑائی و بزرگی کا اقرار ہے۔ ہم اُس کی

عظمت بیان کرتے ہیں، اُس سے راہنمائی کے طلب گار ہوتے ہیں۔ جو رب اتنا بڑا ہے اُس کی بڑائی، کبریائی اور سچائی بیان کرنی چاہیے اور پھر اُس کی رحمت اور راہنمائی طلب کرنی چاہیے۔ یہ بہت اچھی اور عظیم عبادت ہے۔ نماز کے مختلف Postures کو مختلف حروف یا ہندسوں پر محمول کرنا مناسب نہیں۔

سوال: جب آپ ﷺ کا خرقہ مبارک حضرت اویس ؓ کو دیا گیا تو کیا اُس وقت وہ قطب بن گئے تھے؟

جواب: حضرت اویس قرنی ؓ نے جس طرح ٹوٹ کر آپ ﷺ سے پیار کیا، اُن کا مقام قطب سے کہیں بلند ہے۔ آپ ؓ اتنی بلند ہستی ہیں کہ آپ ﷺ نے انھیں اپنی اُمت کے لیے دُعا کے لیے کہا۔ صحابی کا مقام کسی بھی ولی اللہ سے بہت بلند ہے۔

سورۃ القلم کے خاص مضامین اور اِسمِ اعظم

سورۃ القلم بالاتفاق مکی سورہ ہے۔ اس کے دو رکوع اور 52 آیات ہیں۔ اِس میں 1256 حروف ہیں۔ سورۃ القلم سورۃ ن کے نام سے بھی جانی جاتی ہے۔

جس لفظ یا حرف سے سورتیں شروع ہوتی ہیں عام طور پر وہ اُسی لفظ یا حرف سے پہچانی جاتی ہیں۔ سورۃ القلم کی ابتدا ن سے ہوئی۔ ''ن'' حروفِ مقطعات میں سے ہے۔

اس سورہ میں آپ ﷺ کی دل جوئی اور Encouragement کی گئی ہے۔ آپ ﷺ پر جب وحی کے نزول کا آغاز ہوا اور آپ ﷺ نے کفار کو دعوتِ اسلام کا سلسلہ شروع کیا تو کفار کا رویہ سخت ہوتا گیا حتیٰ کہ اُنھوں نے آپ ﷺ کے بارے میں تحقیر آمیز الفاظ بھی کہے۔ ایسے ہی موقع پر سورۃ القلم نازل ہوئی۔ اس میں رب تعالیٰ نے قلم کی قسم کھا کر فرمایا کہ کفارِ مکہ جو کچھ آپ ﷺ کے بارے میں کہتے ہیں وہ غلط ہے۔

''قلم اور اُس کے لکھے کی قسم تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں اور ضرور تمھارے لیے بے انتہا ثواب ہے اور بے شک تمھاری خوبو (خلق) بڑی شان کی ہے۔''
(القلم: 1-4)

اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اس طرح Encourage کیا کہ اگرچہ کفار یہ چاہتے ہیں کہ آپ ﷺ اُن کے ساتھ تمام معاملات اور تبلیغِ اسلام میں نرمی اختیار کریں لیکن آپ ﷺ اُن کی بات نہ سنیں بلکہ اپنا کام جاری رکھیں۔ رب تعالیٰ انھیں معاف نہیں کرے گا اور اُنھیں ایسی سزا دے گا جو اُن کے وہم و گمان میں بھی نہیں۔

سورۃ القلم کی ابتدا حرف ''ن'' سے ہوئی۔ اس کے بعد قلم اور اُن سطور کا ذکر ہے جو اس قلم سے لکھی جاتی ہیں۔ سید شریف جرجانی جو مفسر ہی نہیں ولی اللہ بھی تھے فرماتے ہیں کہ حرف ''ن'' سے اجمالاً مراد ''دوات'' ہے۔ اللہ نے حروفِ مقطعات کا علم آپ ﷺ کو عطا فرمایا۔ اولیائے کرام کو ایک خاص لیول پر پہنچ کر حروفِ مقطعات کا علم عطا ہو جاتا ہے اور اس علم کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ شریف جرجانی رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق ''ن'' سے مراد دوات ہے۔ ''ن'' کے بعد حرف ''وٗ'' استعمال ہوا ہے۔

عربی میں ''وٗ'' سے مراد قسم ہے۔ اس کے بعد قلم کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ قلم کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگا لیں کہ ابتدائی وحی جن پانچ آیات پر مشتمل ہے اُن میں بھی قلم کا ذکر ہے۔ قلم کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ قلم زمانے کی قید سے آزاد ہے۔ وقت اسے محدود نہیں کر سکتا۔ یہ ماضی کا ذکر بھی کرتا ہے اور مستقبل کا بھی۔ اس کے ذریعے سے انسان تک علم پہنچتا ہے۔ رب تعالیٰ نے علم کی اہمیت یہ کہہ کر واضح کر دی کہ علم والا اور بے علم کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ اسی لیے رب تعالیٰ نے قلم اور قلم سے لکھی جانے والی سطروں کی قسم کھائی۔ ابتدائی وحی میں بھی اسی لیے پڑھنے پر زور تھا اور وحی میں قلم کا ذکر تھا۔

سورۃ القلم میں اس بات کا بھی ذکر ہے کہ جب آپ ﷺ کفار کو بتوں کی عبادت ترک کرنے کی تلقین کرتے ہیں جن کو وہ صدیوں سے پوجتے آرہے ہیں تو وہ آپ ﷺ کو (معاذ اللہ) مجنون کہتے ہیں۔

لفظ ''مجنون'' جنون سے نکلا ہے۔ جنون لفظ ''جن'' سے مشتق ہے۔ عربی میں جن اس چیز کو کہتے ہیں جو پوشیدہ ہوتی ہے، دکھائی نہیں دیتی۔ اس لیے کہتے ہیں کہ جن آگ سے بنے ہیں اور ہمیں دکھائی نہیں دیتے۔ جن کی Formation آگ کے اُس حصے سے ہے جو دکھائی نہیں دیتا۔ اگر ہم موم بتی دیکھیں تو ہمیں پیلاہٹ والا شعلہ دکھائی دیتا ہے جس کے اردگرد ایک Blue حلقہ بنا ہوتا ہے لیکن اس Blue area کے باہر ایک اور حلقہ ہوتا ہے جو سفید ہوتا ہے لیکن دکھائی نہیں دیتا۔ کسی بھی شعلے کا Outer area سفید ہوتا ہے جو سب سے گرم Area ہوتا ہے۔ جن کی Formation اِس White area سے ہوئی۔ اس لیے انگریزی میں Red hot کی Superlative degree کو White hot کہتے ہیں۔ جہاں لوہا Red hot سے اُوپر چلا جائے تو وہ White hot ہے۔۔۔۔۔سب سے گرم۔ جنوں کی تخلیق چونکہ شعلے کے اس White hot area سے ہوئی اس لیے وہ ہمیں دکھائی نہیں دیتے۔ یوں لفظ ''مجنون'' وجود میں آیا کیونکہ جنون دکھائی نہیں دیتا۔

سورۃ القلم میں آپ ﷺ کے اخلاق کی تعریف فرمائی گئی کہ آپ ﷺ اخلاق کے اس بلند مقام پر ہیں جہاں کوئی دوسرا نہیں پہنچ سکتا۔

اخلاق ''خُلق'' سے مشتق ہے۔ خُلق کے بارے میں صاحبانِ علم فرماتے ہیں خُلق اُس Container، چیز یا جگہ کو کہتے ہیں جہاں پاکیزگی و طہارت رہے۔ دراصل اس سے مراد وہ جگہ ہے جہاں انسان کا نفس رہتا ہے۔ جب انسان نفس کو قابو کر لیتا ہے تو وہاں پاکیزگی و طہارت آتی ہے۔

ہر پیغمبر کو رب تعالیٰ نے کوئی نہ کوئی نمایاں صفت عطا فرمائی ہے جیسے صبرِ ایوب، کلیم اللہ، ذبیح اللہ، خلیل اللہ۔ لیکن آپ ﷺ میں وہ سب صفات یک جا کر دی گئیں۔ اس لیے فرمادیا گیا کہ آپ ﷺ اخلاق کے اُس بلند مقام پر ہیں جہاں کوئی دوسرا نہیں پہنچ پاتا۔

خُلق کو ایک اور معنی میں بھی لیا جاتا ہے۔ جب ہم نیکی کرتے ہیں تو اس کے لیے ہمیں خود سے لڑنا پڑتا ہے، Effort کرنا پڑتی ہے کہ ہم دوسروں کے لیے بھلائی کریں۔ لیکن خُلق اس مقام کا نام ہے جہاں انسان

کسی Conscious effort کے بغیر نیکی کرتا ہے۔ جہاں اُس کا حسنِ اخلاق بغیر کسی تردد اور محنت کے خود بخود بھلائی کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم بلب کا سوئچ آن کرتے ہیں تو بغیر کسی Effort کے وہ Glow کرنے لگتا ہے اور اندھیرا دُور ہو جاتا ہے اِس میں کوئی Effort شامل نہیں ہوتی۔

جب ہم کسی کو کچھ دیں تو یہ لگے کہ یہ دینا ہماری جبلت یا فطرت ہے۔ جب بھی ہم کوئی کام کریں تو یوں لگے جیسے اُسے کرنا ہماری جبلت یا فطرت ہے۔ ایسا کرنا خُلق ہے۔ آپ ﷺ کی سخاوت، سچائی، دیانت داری، راست گوئی اور کسی کو اُس کی غلطیوں پر کچھ نہ کہنا آپ ﷺ کی فطرت تھی۔ یہ حسنِ اخلاق اللہ کو بہت پسند ہے۔

سورۃ القلم سے اگر ہم کچھ سیکھنا چاہتے ہیں تو وہ یہ ہے کہ ہم حسنِ اخلاق کے کس درجے کو مدنظر رکھیں۔ اگر ہماری خواہش سورج پر پہنچنے کی ہو تو ہم سورج تک نہ بھی پہنچ پائیں تو چاند تک تو پہنچ ہی جائیں گے۔ اگر ہم آپ ﷺ کے حسنِ اخلاق کو اپنا Objective بنالیں تو اِس کی عظمت اور بلندی تک تو نہیں پہنچ پائیں گے کیونکہ یہ اللہ کا فیصلہ ہے کہ آپ ﷺ کے حُسنِ اخلاق کے مقام تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن کوشش سے ہم حسن اخلاق کے کسی بہتر لیول تک ضرور پہنچ جائیں گے۔

> رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: خیر کے تین سو ساٹھ اوصاف ہیں، جب اللہ عزوجل بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اُن میں سے ایک عطا فرما دیتا ہے، جس کی برکت سے اُسے جنت میں داخل کرتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی: کیا میرے اندر اُن اوصاف میں سے کوئی موجود ہے؟ ارشاد فرمایا: ابوبکر: مبارک ہو تم میں وہ تمام اوصاف موجود ہیں۔(تاریخ دمشق، تاریخ الخلفاء)

سورۃ القلم کی تفسیر پڑھتے ہوئے ہم مدنظر رکھیں کہ یہ ہمیں Message کیا دیتی ہے؟ اس میں دو طرح کا پیغام ہے:

1۔ اللہ کو علم بہت عزیز ہے۔ اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ اس لیے ہم علم حاصل کریں۔

2۔ دوسرا پیغام یہ ہے کہ ہم کوشش کریں کہ خلق کے 360 درجات یا صفات میں سے زیادہ سے زیادہ صفات اپنے اندر پیدا کرلیں۔

سوال: اگر کوئی شخص قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر کوئی کام کرنے کی قسم کھائے لیکن بوجوہ وہ قسم پوری نہ کر سکے تو کفارہ کیا ہے؟

جواب: اگر کبھی کسی انتہائی مجبوری کی وجہ سے قسم پوری نہ کر پائیں تو صدقِ دل اور خلوصِ نیت سے اللہ سے معافی مانگ لیں اور 10 مساکین کو اوسط درجے کا دو وقت کا کھانا کھلا دیں۔ اگر اس کی استطاعت نہ رکھتے ہوں تو تین روزے رکھیں۔ اللہ معاف فرمانے والا ہے۔ وہ خلوصِ دل سے توبہ کرنے والے کی توبہ قبول کرتا ہے۔

سوال: اگر کوئی شخص کہے کہ اگر آپ نے میرا یہ کام نہ کیا تو میں آپ کے لیے بددعا کردوں گا۔ کیا ایسی بددعا قبول ہو جاتی ہے؟

جواب: ہم سفارش عموماً وہیں کرتے ہیں جہاں میرٹ پر کام کرنا ممکن نہ ہو۔ اگر ہم میرٹ سے ہٹ کر سفارش کرا رہے ہیں تو دوسرے کا حق مار رہے ہیں جو کہ غلط ہے۔ اگر آپ کسی کا غلط کام نہیں کرتے اور وہ آپ کو بددعا دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ غیب کا علم جانتا ہے، دلوں کے حال سے واقف ہے، ازل سے ابد تک کے معاملات جانتا ہے......وہ اِن بددُعاؤں کو قبول نہیں کرتا۔ اس لیے آپ ایسی بددُعاؤں سے پریشان نہ ہوں۔

سوال: اولاد ماں باپ کے لیے کس طرح آزمائش ہو سکتی ہے؟

جواب: ایک نوجوان لڑکا اپنے دوستوں کے ساتھ سخت دھوپ میں چھت پر پتنگ اُڑا رہا تھا۔ اُس کے باپ نے فکرمندی سے کہا ''بیٹا! دھوپ بہت تیز ہے، نیچے آجاؤ۔ شام کو پتنگ اُڑا لینا۔'' بیٹے نے باپ کی بات پر دھیان نہ دیا اور پتنگ اُڑاتا رہا۔ باپ نے بیٹے کا یہ انداز دیکھا تو اپنے پوتے کو گود میں اُٹھا کر چھت پر چلا گیا۔ بیٹے نے جب یہ دیکھا تو پریشانی سے بولا ''ابا جی! یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ میرے بچے کو لُو لگ جائے گی۔'' باپ نے کہا ''میرے بیٹے! جس طرح تمھیں اپنے بچے کو دھوپ میں دیکھ کر تکلیف ہو رہی ہے۔ اسی طرح اس کڑی دھوپ میں تمھارا پتنگ اڑانا مجھے تکلیف دے رہا ہے۔''

آپ نے دیکھا ہوگا کہ خدانخواستہ اولاد کو کوئی مسئلہ درپیش ہو تو بعض اوقات بڑے سے بڑا نیک انسان بھی سفارش، جھوٹی گواہی اور رشوت سے اُس مسئلہ کو حل کرانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ شخص جو دوسروں کے پاس محض دُعا کرانے کے لیے جانا مناسب نہ سمجھتا ہو وہ اولاد کے لیے دُعا کرانے، تعویذ لینے حتیٰ کہ کالا جادو تک کرانے کے لیے چلا جاتا ہے۔ حالاں کہ وہ جانتا ہے کہ کالا جادو کرانے والے کا ایمان باطل ہو جاتا ہے۔ اولاد کو آزمائش اِس لیے کہا گیا کہ اولاد کو تکلیف میں دیکھ کر والدین وہ کام بھی کر لیتے ہیں جنھیں وہ عام طور پر غلط سمجھتے ہیں۔

اولاد کو مشکل اور تکلیف میں دیکھ کر بھی غلط اور ممنوع کام نہ کرنا بڑے ظرف اور حوصلے کی بات ہے۔ بہت کم لوگ Resist کر پاتے ہیں۔

سوال: ہم اِسم اعظم کیسے حاصل کر سکتے ہیں؟

جواب: ہم نے کبھی سوچا کہ ہمیں اِسم اعظم کی تلاش کیوں ہے؟ اس کے لیے میں آپ کو یہی مثال دے سکتا ہوں کہ میں کسی کے بیٹے کو یرغمال بنا کر اُس سے اپنا کام کروالوں۔ میں کسی بھی انسان سے گن پوائنٹ پر اُسی وقت کام کراؤں گا جب میرا اُس پر اعتماد ختم ہو جائے کہ وہ بصورتِ دیگر میرا کام نہیں کرے گا۔ آپ اِسم اعظم کی تلاش میں کیوں رہتے ہیں؟ کیا آپ کو رب پر بھروسا نہیں رہا؟ جن لوگوں کو رب پر بھروسا ہے اُنھیں تو میں نے عجیب ٹون اور آواز میں رب تعالیٰ سے درخواست کرتے دیکھا۔

''اوئے ربا تو ویکھدا ائیں۔ ایہہ کیہ ہو رہیا اے؟''

عام سٹینڈرڈ سے دیکھیں تو یہ بڑے Rude words ہیں لیکن دراصل یہ انداز رب تعالیٰ پر بھروسے اور مان کی انتہا ہے۔ یہ بڑی دل سے نکلی ہوئی فریاد ہے لیکن اِسمِ اعظم کی جستجو کی وجہ سے ہم اِس مان اور بھروسے کو بھول رہے ہیں۔

بھائی! رب کے ساتھ دوستی کا رشتہ قائم کر لیجیے۔ اُس کے ساتھ اعتماد اور بھروسے کا وہ تعلق اُستوار کر لیجیے کہ جہاں آپ کو یہ یقین ہو جائے کہ رب مجھے بن مانگے دے گا کیونکہ وہ دیکھ رہا ہے کہ مجھے کس شے کی ضرورت ہے۔ جو رب اتنا مہربان ہے کہ بن مانگے عطا کرتا ہے۔ اُس سے میں کیا کہوں.....!

یہاں ہم یہ اعتراض کریں گے کہ اگر دُنیا کا مانگنا اِتنا اچھا نہیں تو پھر ہم یہ دُعا کیوں مانگتے ہیں

''اے ہمارے رب! ہمیں دُنیا و آخرت میں بھلائی عطا فرما۔''

بھائی! دُنیا جاہ و حشم اور محلات سے حسین نہیں ہوگی۔ ذرا غور کیجیے ہمارے مختلف حکمرانوں کے بارے میں کہانیاں گشت کرتی رہتی ہیں کہ فلاں کے پاس اِتنی دولت ہے۔ کبھی ہم نے سوچا کہ اُن کے بارے میں کیسے کیسے SMS گردش کرتے ہیں۔ کیا واقعی اُن کی دُنیا حسین ہے؟

اگر دُنیا حسین دیکھنی ہے تو اللہ کے دوستوں کے مزارات پر جا کر دیکھیے کہ رحمتہ اللہ علیہ کے بغیر اُن کا نام نہیں لیا جاتا۔ اُن کے پاس حاضری دینے والے واپس آتے ہوئے اُن کی طرف پشت نہیں کرتے۔ صاحبانِ اقتدار اہلِ فقر کے پاس Appointment لے کر جاتے ہیں..... اُن صاحبانِ علم کی دُنیا دیکھیے کہ جن کے دل میں مزے دار انگور کھانے کی ہلکی سی خواہش بھی پیدا ہوئی تو چند ہی منٹ میں کوئی صاحب پلیٹ میں انگور لے کر حاضر ہو گئے۔ یہ دنیا حسین ہے یا وہ دُنیا؟ اِسمِ اعظم کا استعمال کر کے اپنا ایک کام کرانے اور اللہ کے دوستوں کی فہرست سے اپنا نام خارج کرانے سے کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم رب کو اپنا بنا لیں۔ جب رب ہمارا ہو گیا تو ساری کائنات ہماری ہے۔

سوال: میں اکثر خواب میں خود کو مختلف اولیائے کرام کے مزارات پر حاضری دیتے دیکھتا ہوں۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟

جواب: مزار پر فاتحہ خوانی کر کے اُس کا ثواب صاحبِ مزار کو پہنچایا جاتا ہے۔ اگر آپ خواب میں کوئی مزار دیکھیں تو اگر آسانی سے وہاں حاضری دے سکیں تو ضرور جائیے اور فاتحہ خوانی و دُعا کے بعد واپس آ جایئے۔

سوال: اِسمِ اعظم قرآن پاک میں کس کس مقام پر ہے؟

جواب: اِسمِ اعظم کی جستجو میں کچھ نہیں رکھا۔ آپ یہ دُعا کیا کریں کہ رب تعالیٰ آپ کو اُس راہ پر لے جائے جہاں انسان ایسی کسی بھی جستجو سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ جنھیں رب کی راہ کا چسکا لگ جاتا ہے اُنھیں پھر یہ فکر نہیں رہتی کہ کون سا کام ہو گیا اور کون سا رہ گیا..... اُنھیں پھر اگر بادشاہ بھی پوچھے کہ کوئی حکم یا خدمت تو وہ کہتے ہیں:

''میری دھوپ چھوڑ دو۔''

آپ وہ مقام حاصل کر لیجیے۔ وہ مقام تب آئے گا جب رب کے ساتھ بھروسے اور یقین کا رشتہ قائم ہو جائے گا اور یہ احساس دل میں بیٹھ جائے گا کہ میرا رب واقعی بہت رحیم و کریم ہے۔ اُس کے ہوتے ہوئے نہ میرا کوئی کام رُک سکتا ہے نہ ضرورت نا تمام رہ سکتی ہے، نہ نقصان ہو سکتا ہے اور نہ کوئی ظلم ہو سکتا ہے۔

احمد شاہ ابدالی فوج میں ایک سپاہی تھا۔ فوج نے کسی مہم کے دوران ایک جگہ پڑاؤ ڈالا۔ جب رات کا کھانا Serve ہو رہا تھا تو ایک ذرا کم اچھے حلیے والا شخص وہاں آیا اور کہا ''میں بھوکا ہوں، کھانا کھلا دو۔'' فوجیوں نے ڈانٹ دیا کہ یہ تو لشکر کے لیے کھانا ہے۔ احمد شاہ ابدالی نے جب یہ سنا تو اپنے حصے کا کھانا اُس فقیر کو دے دیا۔ کھانا کھانے کے بعد فقیر نے احمد شاہ ابدالی سے کہا ''تم نے مجھے کھانا کھلایا بولو کیا مانگتے ہو۔ جو مانگو گے ملے گا۔'' یہ سن کر سپاہیوں نے قہقہے لگائے کہ جس شخص کے پاس خود کھانے کو کچھ نہ ہو وہ کسی کو کیا دے سکتا ہے۔ احمد شاہ ابدالی نے Politely کہا ''بہت مہربانی۔ بس آپ میرے لیے دُعا کر دیجیے گا۔'' فقیر نے رُخصت ہوتے وقت کہا ''جاؤ! تمھیں بادشاہ بنا دیا۔'' اُس کی یہ بات سن کر سپاہیوں نے ایک بار پھر قہقہے لگائے۔ اس مہم میں مقابلہ بہت سخت تھا۔ لشکر کا بڑا نقصان ہوا۔ احمد شاہ ابدالی نے بہت بہادری کا مظاہرہ کیا جس پر بادشاہ نے ترقی دے کر اُسے ایک چھوٹے درجے کا صوبیدار بنا دیا۔ اِس کے بعد احمد شاہ ابدالی نے اپنے Troops کی اتنی اعلیٰ کمانڈ کی کہ بادشاہ نے اُسے ترقی دے کر کمانڈر انچیف بنا دیا حتیٰ کہ ایک ایسا وقت آیا کہ جب اُس نے بادشاہ کو ہٹا کر خود حکمرانی سنبھال لی۔ تب اُسے اُس فقیر کی دعا یاد آئی۔ فقیر کا پتا کرایا تو پتا چلا کہ وہ پنجاب گئے ہیں۔ اُس وقت پنجاب پر سکھوں کی حکومت تھی اور سکھ مسلمانوں پر ظلم و ستم ڈھا رہے تھے۔ فقیر سکھ مہاراجہ کے دربار میں گیا اور احتجاج کیا کہ مسلمانوں پر ظلم و ستم سے باز آ جاؤ۔ سکھ مہاراجہ نے ظلم کی انتہا کرتے ہوئے حکم دیا کہ اُبلتی چاندی اُس فقیر کے حلق میں انڈیل دی جائے۔ جس سے اُس فقیر کا انتقال ہو گیا۔

جب یہ خبر احمد شاہ ابدالی تک پہنچی تو وہ غصے میں آ گیا کہ سکھ مہاراجہ نے میرے مرشد کے ساتھ ایسا بھیانک سلوک کیا۔ وہ افغانستان سے آیا اور پنجاب پر حملہ کیا۔ لاہور فتح کیا اور حکم دیا کہ تین دن تک سکھوں کا قتل عام کیا جائے۔ جب رات کو احمد شاہ ابدالی سویا تو اُس فقیر کو خواب میں دیکھا جنھوں نے تنبیہ کی کہ تمھیں بادشاہ اس لیے تو نہیں بنایا گیا تھا کہ تم انسانوں کا قتل عام کرو۔ فوراً اِسے بند کرو۔ احمد شاہ ابدالی نے آنکھ کھلتے ہی قتل عام بند کرنے کا حکم دیا۔

وہ فقیر صابر شاہ صاحب تھے جن کا مزار بادشاہی مسجد کی تقریباً Back پر ہے۔

آپ دیکھیے کہ صابر شاہ صاحب نے احمد شاہ ابدالی کو بادشاہ بنانے کے لیے کوئی اِسمِ اعظم استعمال نہیں کیا۔ سب سے بڑا اِسمِ اعظم تو یہ ہے کہ ہم حسنِ اخلاق پیدا کر لیں۔ خلقِ خدا کے ساتھ ہمارا رویہ بہت مہربانی کا ہو اور مہربانی صرف زبان نہیں بلکہ دل کی ہونی چاہیے تب اِسمِ اعظم خود بخود کام کرنے لگتا ہے۔ اللہ کا وعدہ ہے

کہ تم میرے بندوں کے کام کرو میں تمھارے کام کروں گا۔ تم میرے بندوں پر مہربان ہو جاؤ میں تم پر مہربان ہو جاؤں گا۔ یہ اسمِ اعظم بہت Valid ہے۔ اِس اسمِ اعظم کو پکڑیئے۔ اگر ہم نے خلقِ خدا کے کام آنا شروع کر دیا تو پھر اسمِ اعظم ہی نہیں اور بھی بہت سے نامعلوم خزانے ہمارے ہاتھ لگ جائیں گے۔

آپ وہ راستہ پکڑ لیجیے اور اُس مقام پر چلے جایئے جہاں کہی ہوئی ہر بات اِسمِ اعظم بن جاتی ہے۔ فقیر نے کہا "بادشاہ بنا دیا" تو ایک عام سپاہی بادشاہ بن گیا۔ ہم وہ مقام کیوں نہیں حاصل کر لیتے! میں تو نکما ہوں۔ ساری عمر گنوا دی۔ کم از کم آپ ہی یہ راہ پکڑ لیجیے۔

فلسفۂ حیات

سوال: جب انسان پانچ چھ دن رُوحانیت کی بلندی پر گیا ہو اور اُن دنوں کی عبادت رہ جائے تو کیا وہ عبادت پوری کرنا پڑے گی یا اُسے چھوڑا جا سکتا ہے۔؟

جواب: جب انسان رُوحانیت کی بلندی کے کسی مقام پر جاتا ہے تو (میرے خیال میں) یہ پانچ چھ دنوں کا سفر نہیں ہوا کرتا بلکہ پلک جھپکنے کی بات ہوتی ہے۔

کسی زمانے میں کہا جاتا تھا کہ روشنی سب سے تیز رفتاری سے سفر کرتی ہے لیکن چند سال قبل تجربات سے پتا چلا کہ روشنی سے ایک لاکھ گنا زیادہ تیز رفتاری سے سفر کرنے والی چیزیں موجود ہیں۔

صاحبانِ کشف جب کشف کے ذریعے روحانی سیر کرتے ہیں تو نینو سیکنڈ میں عالمِ اسباب سے عالمِ ارواح، عالمِ بالا، سمندر یا زمین کے کسی بھی حصے یا تہ کی سیر کر لیتے ہیں۔

اگر عبادت سے مراد فرض عبادات ہیں تو اُس کی معافی نہیں۔ قضا نمازیں پڑھنا ہوں گی۔ نوافل کی قضا نہیں۔ اگر عبادت سے آپ کی مراد ذکر اذکار، اوراد و وظائف اور تسبیحات ہیں تو اُن میں ناغہ ایک ہی صورت میں قابلِ معافی ہے کہ اگر حالات و واقعات کی وجہ سے اُن کی ادائیگی کا معاملہ انسان کی اِستطاعت سے باہر ہو گیا لیکن اگر جان بوجھ کر ناغہ کیا تو زیرو سے سٹارٹ کرنا ہوگا۔

سوال: کسی مغربی دانش ور کا کہنا ہے کہ اگر ہم زندگی کی Dichotomy کو سمجھ لیں تو بہت سی باتیں خود بخود سمجھ آ جائیں گی۔

جواب: جب تک ہم مغرب کی دانش کو اسلام کی دانش کے تقابل میں نہیں دیکھیں گے Confusion کا شکار رہیں گے۔ میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ اگر ہم صرف مغرب کی دانش کو دیکھتے رہیں تو زندگی کی آگہی ادھوری ہے جس کے نتیجے میں جو بہت سی Complications (پیچیدگیاں) پیدا ہوتی ہیں۔ اُن میں سے ایک ذہنی سکون سے محرومی بھی ہے۔ مغربی طرزِ زندگی اپنانے سے انسان کو وقتی طور پر تو شاید سہولت اور سکون محسوس ہوتا ہو لیکن آخر کار فرسٹریشن اُس کا مقدر رہتی ہے۔ اِسی طرح مغربی فلاسفی اپنانے سے زندگی میں ادھورا پن بڑھتا چلا جاتا ہے۔ آپ کو مغرب میں بے شمار ایسے لوگ ملیں گے جو اپنے آپ سے گفتگو کرتے جا رہے ہوتے ہیں، جو اپنے Pets بلی کتے سے اس طرح پیار کرتے ہیں جیسے ہم اپنے بچوں سے۔ وہ اپنے Pets کا منہ چومتے اور اُن کی

Death پر آنسوؤں سے روتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بہت رحم دل ہیں بلکہ وہ احساسِ تنہائی کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ احساسِ تنہائی اُنھیں Pets کے ساتھ والہانہ پیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

میں اہلِ مغرب کے طرزِ زندگی اور اُن کی سوچ کو غلط نہیں کہتا۔ ان کا فلسفۂ حیات اُن کے Angle سے درست ہوگا لیکن ہمارے ماحول میں جو کلچرل Bond ہے وہ مغربی طرزِ زندگی کو زیادہ قبول نہیں کرتا۔

اگر ہم اسلامی فلسفے کو غور سے دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ اسلام اجتماعی زندگی کا درس دیتا ہے۔ انسان صرف اپنے لیے نہیں بلکہ اپنی فیملی، پڑوسیوں، رشتہ داروں اور تمام اُمت مسلمہ کے لیے جیتا ہے۔ انسان کی جان پر اسلام کا حق ہے۔ اِس کے لیے وہ اپنی جان قربان کر دیتا ہے۔ مسلمان اپنے کام چھوڑ کر دوسروں کے کام کرتا ہے۔ اپنی ضروریات پر دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دیتا ہے۔ اپنا مال دوسروں پر خرچ کرتا ہے۔ ہمارا دین درس دیتا ہے کہ ہم انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی زندگی جئیں جب کہ مغرب کے فلسفے کے مطابق محنت سے کمائی گئی کمائی پر صرف میرا حق ہے۔ اِس کے برعکس اسلام کہتا ہے کہ اپنا مال دوسروں پر خرچ کرو۔ خود پیوند شدہ لباس پہن کر دوسروں کو نئے کپڑے پہنا دو۔ مغرب کہتا ہے کہ بچہ 16 سال کے بعد Independent ہے، وہ جو چاہے کرے۔ ماں باپ بہن بھائیوں کا اُس پر کوئی حق نہیں۔ اسلام ماں باپ کا بچے پر اور بچے کا ماں باپ پر حق واضح کرتا ہے۔

مغربی اور اسلامی تعلیمات میں یہ فرق ہی ہمیں مغرب سے جُدا کرتا ہے۔ آپ سب جانتے ہیں کہ آپ ﷺ کے مکہ مکرمہ میں ہجرت سے پہلے آپ ﷺ کے سال کافی دشوار تھے۔ اہلِ مکہ نے آپ ﷺ کو ڈرایا دھمکایا، ترغیب بھی دی، سوشل بائیکاٹ بھی کیا لیکن جب آپ ﷺ اپنی جگہ استقامت سے ڈٹے رہے اور اللہ کا پیغام پھیلانے میں مصروف رہے تو ہجرت سے پہلے کے آخری تین سالوں میں کفار کی مخالفت میں بہت شدت آگئی حتیٰ کہ وہ آپ ﷺ کی (معاذ اللہ) جان لینے کے درپے ہو گئے اور اِس حوالے سے منصوبے بنانے لگے۔ اِسی عرصے میں آپ ﷺ پر سورہ ابراھیم نازل ہوئی۔ اس سورۃ کا نام ابراھیم اس لیے رکھا گیا کیونکہ اِس کے چھٹے رکوع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے۔ اِس سورہ کی تلاوت کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کے سخت حالات کے باوجود رب تعالیٰ نے آپ ﷺ کو دینِ حق کی تبلیغ کی تاکید فرمائی اور واضح فرما دیا کہ کفار دُنیاوی زندگی کو آخرت کی زندگی پر ترجیح دے رہے ہیں۔ اُنھوں نے دُنیا کی زندگی کو ہی سب کچھ سمجھ لیا ہے۔

مغربی طرزِ زندگی دیکھ کر بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک موجودہ زندگی ہی اصل زندگی ہے۔ اُن کی نظر آخرت کی زندگی پر نہیں حالانکہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیروکار ہیں، توحید و رسالت پر بھی ایک حد تک یقین رکھتے ہیں، بائبل یا توریت کو الہامی کتاب مانتے اور دوبارہ اُٹھائے جانے پر یقین رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود اُن کے Concepts یہ ہیں کہ آج کی دُنیا کو سنوار لیں آخرت کی زندگی کے بارے میں بعد میں دیکھا جائے گا۔

مسلمان محض آج کی زندگی پر نظر نہیں رکھتا۔ وہ جانتا ہے کہ یہ زندگی چار روزہ ہے اور مجھے اسے اس طرح گزارنا ہے کہ آج میں نیک اعمال کروں تا کہ میری آخرت کی زندگی سنور جائے۔

سوال: موجودہ حالات دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ جیسے غزوۂ ہند نزدیک ہو۔ ایسے میں ہمیں اپنے آپ کو کیسے تیار رکھنا چاہیے۔

جواب: جنگ ہند Insight ہو یا نہ ہو، اِس کا مستقبل قریب میں امکان ہو یا نہ ہو...... لیکن مسلمان پر فرض ہے کہ مسلمان کسی بھی ایسی Situation کے لیے خود کو تیار رکھے۔ حکم یہی ہے کہ جنگی تیاریاں اتنی بھرپور ہوں کہ اگر دشمن اچانک حملہ بھی کرے تو منہ کی کھائے۔ لیکن یاد رکھیں کہ جنگیں ہتھیاروں نہیں بلکہ Moral strength کی بنیاد پر لڑی جاتی ہیں۔ جس قوم کی Moral values جتنی زیادہ Strong ہوتی ہیں وہ قومیں اُسی شاندار انداز میں جنگیں جیت جاتی ہیں۔ جب تک مسلمان دُنیا کی محبت میں نہیں ڈوبے تھے، سرخرو رہے۔ اپنے وقت کی سپر پاورز رومن اور Persian Empires ہمارا مقابلہ نہ کر پائیں۔ بہت کم ساز و سامان کے ساتھ عرب کے ریگستان سے اُٹھنے والوں نے رومن اور Persian Empires کو سرنگوں کر دیا۔ حالاں کہ مسلمان تعداد میں بھی کم تھے اور ساز و سامان بھی اُن کے پاس زیادہ نہ تھا لیکن اُن کے پاس اعلیٰ Moral values تھیں۔ مسلمان میدانِ جنگ میں بھی اخلاقی اقدار کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اگر ہم بھی آج دشمن پر غلبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ اپنے نفس پر غلبہ پالیں۔ اگر نفس پر غلبہ حاصل ہو گیا تو دشمن پر غالب آنا آسان ہو جائے گا۔ جب تک ہم نفس کے غلام ہیں اور ہمارے دل میں دُنیاوی مال و زر اور دُنیا کی محبت ہے تو ہم دشمن کا مقابلہ نہیں کر پائیں گے۔ جنگ جیتنے کے لیے ہتھیار تیار کرنے سے زیادہ Moral strenght بڑھانے کی تیاری ضروری ہے۔

سوال: پاکستان کے کچھ علاقوں میں جاری کشمکش کی وجہ سے کوئی کہتا ہے کہ یہ امریکہ کی جنگ ہے تو کسی کے نزدیک یہ پاکستان کی جنگ ہے۔

جواب: یہ جنگ کب اور کیسے شروع ہوئی تھی...... یہ ماضی کا قصہ بن گیا۔ اگر یہ ہمارے کسی آدمی کی غلطی کی وجہ سے شروع ہوئی تھی تو بھی یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ آج جو لوگ جاں بحق ہو رہے ہیں کیا وہ ہمارے بھائی، ہمارے پڑوسی یا ہمارے ہم وطن ہیں؟ سب سے پہلے اپنے ہم وطنوں کو Safe کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ فرض کریں اگر ہمارا کوئی فیملی ممبر باہر کسی شخص سے لڑ جھگڑ کر آجائے اور وہ شخص آکر ہمارے گھر پر حملہ کر دے تو ہم بحث میں اُلجھنے کے بجائے کہ لڑائی کس نے شروع کی پہلے حملہ کرنے والوں سے نمٹیں گے اور بعد میں یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ سارے جھگڑے کی بنیاد کس نے ڈالی۔ نقصان کس کے ذمہ جائے گا۔

اِس وقت صورت حال یہ ہے کہ ہمارے ہم وطنوں پر حملہ ہو رہا ہے۔ پہلے اُن کی جانیں محفوظ ہو جائیں...... باقی فیصلے بعد میں ہوتے رہیں گے۔

سوال: کارپوریٹ سیکٹر میں دس بارہ گھنٹے کام کرنے کے بعد نماز اور بہت سی دیگر ذمہ داریوں کی ادائیگی رہ جاتی ہے۔ ایسے میں کیا کیا جائے؟

جواب: مسلمانوں کے لیے رزقِ حلال کمانا عبادت ہے۔ جو لوگ دفاتر میں دس بارہ گھنٹے محنت کر رہے ہوتے ہیں وہ اپنے اور فیملی کے لیے رزق کما رہے ہوتے ہیں لیکن نماز کے اوقات میں نماز ادا کرنی چاہیے۔ اگر دفتری مصروفیات زیادہ ہونے کی وجہ سے اپنے اہلِ خانہ کو زیادہ وقت دینا اور حقوق العباد کی ادائیگی قدرے دشوار ہو تو الحمدللہ! ہم جوائنٹ فیملی سسٹم کی وجہ سے اپنی Duties کو دوسرے اہلِ خانہ کے ساتھ تقسیم کر کے حقوق العباد ادا کر سکتے ہیں۔ اور Long weekend پر خود آرام کرنے کے بجائے اپنے گھر والوں کو وقت دے کر ہفتے بھر کی کسر نکال سکتے ہیں۔ تمام ذمہ داریوں کی ادائیگی ضروری ہے لیکن پھر بھی اپنے اور اپنے اہلِ خانہ کے لیے رزقِ حلال کمانا زیادہ اہم ہے۔

سوال: رُوحانیت کی نظر میں پاکستان کا مستقبل کیسا نظر آتا ہے؟

جواب: نہ یہ ملک ہم نے بنایا تھا نہ اِس ملک کے مستقبل کی پریشانی ہمیں ہونی چاہیے۔ رب تعالیٰ نے ایک تنہا شخص کو یہ ہمت اور توفیق بخشی کہ وہ کھڑا ہو اور مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کے لیے جدوجہد کرے۔ یہ وطن وجود میں آ گیا تو اللہ تعالیٰ اِسے قائم و دائم رکھے ہوئے ہے اور اُمید یہی ہے کہ رب تعالیٰ نہ صرف اِسے قائم و دائم رکھے گا بلکہ دن بدن بہتری کی طرف لے جائے گا۔

مضامین سورۃ النور

اِس سورہ کا تعلق انسان کی معاشرتی زندگی سے بھی ہے اور خانگی زندگی سے بھی۔ سورۃ النور کی ابتدا میں جلال دکھائی دیتا ہے۔ اِس سورہ کا آغاز بڑے زوردار انداز میں ہوا۔ رب تعالیٰ نے ہم کا صیغہ استعمال کیا اور فرمایا کہ جو احکامات تمہیں دیے گئے ہیں وہ تم پر فرض ہیں۔ یہ بہت اہم نکتہ ہے۔ احکامات دینے سے پہلے ہی یہ کہہ کر انسان کے لیے احکامات کی بجا آوری سے پہلوتہی کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔ ہم نے تم پر احکامات فرض کر دیے...... یہ بہت Categorical statement ہے۔

انسان کی زندگی میں گھر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کوئی انسان بڑا اور Constructive کام تب تک نہیں کر پاتا جب تک اُسے گھر کا سکون نہ ملے۔ بڑے کام کو Concentrate کرنے کے لیے گھریلو سکون بہت اہم ہے۔ بہت سے جھگڑوں کی وجہ گھریلو بے سکونی ہوتی ہے۔

گھر کے اندر خاندانی زندگی اور معاشرتی زندگی کے بنیادی پہلوؤں پر سورۃ النور میں احکامات نازل کیے گئے۔

سورۃ النور اٹھارویں پارے میں ہے۔ یہ مدنی سورہ ہے ہجرت کے بعد نازل ہوئی۔ اس کی 64 آیات اور نو رکوع ہیں۔ اس کی 35 ویں آیت میں اللہ نور السمٰوٰت والارض کے الفاظ سے اس سورۃ کا نام Derive ہوا۔

اسلام میں پردے کے اِبتدائی احکامات سورۃ الاحزاب میں نازل ہوئے جب کہ سورۃ النور میں ان احکامات کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا۔ اس کے علاوہ حدود اور قصہ اِفک کا بھی اس سورہ میں ذکر ہے۔

ایک ایسی معاشرتی بُرائی جو پورے معاشرے کو ہلا کر رکھ دیتی ہے یہ ہے کہ کسی شادی شدہ انسان کا اپنی خواہشات کی وجہ سے پاؤں Slip کر جائے اور انسان (مرد یا عورت) اپنے لائف پارٹنر کے ساتھ Faithful نہ رہے یا غیر شادی شدہ انسان اپنی خواہش کے ہاتھوں مجبور ہو کر Slip کر جائے۔ ان معاملات کو اس سورہ میں Discuss کیا گیا ہے کیونکہ اگر Wife اپنے Husband سے یا Husband اپنی Wife سے Faithful نہ رہے یا غیر شادی شدہ لڑکے یا لڑکی سے کوئی ایسی لغزش ہو جائے تو اس وجہ سے آپس میں دشمنی جنم لیتی ہے اور معاشرتی تعلقات خراب ہو جاتے ہیں۔ اگر ایسا معاشرہ ہو جہاں ایسی لغزش کو بُرائی

کے طور پر نہ بھی لیا جاتا ہو تب بھی وہاں کچھ نہ کچھ معاشرتی قباحتیں لازمی پیدا ہو جائیں گی جیسا کہ ہمیں مغربی ممالک میں نظر آتی ہیں۔ کیونکہ ایسی لغزش کے نتیجے میں وجود میں آنے والی انسانی جان باپ کی شفقت اور نہ ہی ماں کی ممتا حاصل کر پائے گی۔ مغربی دُنیا میں بھی ایسے بچے Shelter homes میں پلتے ہیں۔ ایسے بچوں کی Psyche نارمل نہیں ہوتی۔ اُن میں انتقام کا جذبہ شدید ہوتا ہے اور یہ عموماً جرائم کی طرف چلے جاتے ہیں۔ یہ لغزش ایسا جرم ہے کہ ایسا شخص معاشرے کا ہی نہیں بلکہ اللہ کا بھی مجرم ٹھہرتا ہے۔ کچھ جرائم میں انسان معاشرے کا مجرم ٹھہرتا ہے جیسے کسی کی جان لینا، کسی کو قتل کرنا۔ اس میں اگرچہ اللہ نے خون کا بدلہ خون رکھا لیکن ساتھ یہ گنجائش بھی رکھی کہ اگر مقتول کے لواحقین قاتل کو معاف کر دیں تو اُس کو سزا نہیں دی جائے گی۔ وہ رب کا نہیں بلکہ مقتول کے لواحقین کا مجرم ہے۔ قاتل کو سزا دینا یا معاف کر دینا مقتول کے گھر والوں کی صواب دید ہے۔ اگر کوئی کسی کا مال زبردستی استعمال کر لے یا چوری کر لے تو چور کا ہاتھ کاٹ دینے کی سزا ہے۔

لیکن جس سے ایسی لغزش سرزد ہو اُسے دوسری پارٹی معاف بھی کر دے تب بھی سزا نہ تو Defer ہوگی نہ Waive off ہوگی۔ اس قبیح فعل سے معاشرے کو پاک رکھنے کے لیے یک طرفہ معافی کی گنجائش ہٹا دی گئی ہے اور سزا کے کچھ پیرامیٹرز Set کر دیے گئے ہیں۔ کیونکہ اسلام کسی انسان کو محض سزا کے طور پر سزا دینے پر یقین نہیں رکھتا۔ میرے خیال میں اسلام کا پینل کوڈ مختصر ترین ہے۔ اس پینل کوڈ کو غور سے Study کرنے سے پتا چلتا ہے کہ سزا برائے سزا نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ جرم کرنے والے کو ایسی سزا دی جائے کہ وہ آئندہ جرم کرنے کے تصور سے ہی لرز اُٹھے اور دوسروں کے لیے بھی عبرت ہو۔ اگر غیر شادی شدہ انسان سے ایسا جرم سرزد ہو جائے تو اُسے سو درے لگائے جائیں۔ اگر شادی شدہ ایسی لغزش کا مرتکب ہو تو اُسے Publicly رجم کیا جائے...... یہ بڑی دردناک موت ہے۔

انسانوں کو اِس جرم سے دُور رکھنے کے لیے ایسی سزا رکھ دی گئی کہ وہ اِس کے خیال سے ہی کانپ اُٹھیں اور دوسروں کے لیے بھی باعثِ عبرت ہوں۔ یہ سزا دراصل ہماری معاشرتی زندگی کو Safe بنانے کے لیے ہے۔

سورۃ النور ہی میں قصۂ افک بیان ہوا۔ مسلمانوں کا عروج دیکھ کر دشمن سازشیں کرتے ہی رہتے تھے جب تک اُنھیں یقین نہیں آ گیا کہ مسلمان اتنے طاقت ور ہو گئے ہیں کہ جب چاہیں ہمیں سزا دے دیں۔ تب تک غزوات ہوتے رہے لیکن جب دشمنوں کو پتا چل گیا کہ وہ مسلمانوں کو Physically شکست نہیں دے سکتے تب دشمن اور منافقین سازشوں پر اُتر آئے۔ منافقوں کے سردار عبداللہ بن ابی نے ایسی سازش کی جس سے مسلم معاشرے میں زلزلہ آ گیا۔ یہ ایک ایسی سازش تھی جس میں آپ ﷺ کے خاندان کے بارے میں اُنگلی اٹھائی گئی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے سورۃ النور میں اس معاملے کو صاف کیا اور پوری طرح اسے یوں واضح کر دیا کہ قیامت تک کوئی دوبارہ ایسی جرأت نہیں کر پائے گا۔

قصۂ افک غزوہ بنی المصطلق کے بعد پیش آیا۔ غزوۂ بنی المصطلق کے بارے میں مورخین کا کہنا ہے کہ

غالباً یہ شعبان چھ ہجری میں پیش آیا۔ ابن خلدون کے مطابق سورۃ النور سن چھ ہجری سے پہلے نازل ہوئی کیونکہ اُن کے نزدیک غزوۂ بنی المصطلق غزوۂ خندق سے ایک سال بعد پیش آیا۔ غزوۂ خندق شوال سن پانچ ہجری میں پیش آیا۔ بہرحال ایک بات طے ہے کہ سورۃ النور غزوۂ بنی المصطلق کے بعد نازل ہوئی۔

گھر ہر انسان کے لیے آرام و سکون کی جگہ ہے۔ گھر کی چار دیواری کے اندر اُس کی اپنی پرائیویٹ زندگی ہے۔ گھر کے دروازے کے باہر معاشرتی زندگی ہے۔ اس لیے اسلام نے احکامات واضح کر دیے کہ کسی کے گھر بلا اجازت داخل نہ ہوں۔ اُس کے گھر نہ جھانکیں اور نہ ہی کان لگا کر بات سنیں۔ دروازے پر تین بار دستک دینے کے بعد بھی اگر صاحب خانہ دروازہ نہ کھولے تو آپ واپس لوٹ آئیں اور بُرا نہ مانیں کہ صاحب خانہ نے میرے لیے دروازہ نہیں کھولا اور مجھے Attend نہیں کیا۔

سوال: سورۃ النور کی تلاوت سے حاصل ہونے والے دُنیاوی فوائد کیا ہیں؟

جواب: اِس سورہ کو پڑھنے سے عام طور پر یہ اثرات ملتے ہیں کہ تلاوت کرنے والے کی اولاد سیدھی راہ پر رہتی ہے۔

سوال: ہندو معاشرے کے اثرات کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں دوسری شادی کو بُرا سمجھا جاتا ہے۔ دوسری شادی میں حائل رُکاوٹوں کی وجہ سے بھی پاؤں Slip کر جاتا ہے۔

جواب: آپ نے درست فرمایا کہ اسلام ہمیں بہت سی چیزوں کی اجازت دیتا ہے لیکن ماضی میں ہندو معاشرہ میں رہنے کی وجہ سے ہم اُن چیزوں کو بُرا سمجھنے لگے۔ ضرورت اِس امر کی ہے کہ لوگوں میں اس تعلیم کو عام کیا جائے کہ جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہم اُنھیں حلال قرار نہ دیں اور جن کو اللہ نے حلال کہا ہم اُنھیں حرام نہ سمجھیں۔

اِس تعلیم کو عام کرنے سے غلط تصورات ختم ہونا شروع ہو جائیں گے۔ Subcontinent میں Multiple marriages-یعنی Polygamy کو بُرا سمجھا جاتا ہے۔

میں ایک بار اپنے دفتری فرائض کی انجام دہی کے لیے انڈیا گیا۔ میٹنگ کے بعد رات گیارہ بجے ہوٹل میں دُنیاوی اور عبادت کے فرائض سے فارغ ہونے کے بعد بیڈ پر نیم دراز ہو کر ٹی وی دیکھ رہا تھا جس پر ایک ہی چینل آ رہا تھا ''دوردرشن''۔ اِس پر جو پروگرام چل رہا تھا اُس میں چار لوگ اسٹیج پر بیٹھے تھے جن کے حلیے سے اندازہ ہوا کہ وہ مسلمان ہیں۔ خاتون Host جو شاید فلموں میں بھی کام کرتی ہیں ایسی Language استعمال کر رہی تھیں جو ٹی وی کے معیار کے مطابق نہ تھی۔ وہ اُن چاروں حضرات کو اپنے سوالوں سے رگید رہی تھیں اور Multiple marriages کے حوالے سے سوال کر رہی تھیں۔ Audience میں ایک اٹھارہ انیس سالہ بچی بھی اپنے سوالات میں بہت Aggressive تھی۔ کہنے لگی ''جب مسلمان مردوں کو ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت ہے تو عورت کو کیوں نہیں؟''

اسٹیج پر موجود حضرات اُس کا جواب نہ دے پائے۔ شاید اُنھوں نے ایک سے زیادہ شادیاں کی ہوئی تھیں

یا شاید وہ تابڑ توڑ سوالات سے انڈر پریشر ہونے کی وجہ سے جواب نہیں دے پا رہے تھے۔ میں نے ہوٹل آپریٹر کو دوردرشن پروگرام میں کال Through کرنے کو کہا اور کال فوراً Through ہو گئی کیونکہ آپریٹر نے کہا کہ ایک پاکستانی جوائنڈ یا آیا ہوا ہے وہ بات کرنا چاہتا ہے۔

میں نے کہا "اسٹیج پر موجود مولانا صاحب شاید انڈر پریشر ہو کر جواب نہیں دے پا رہے، میں آپ کے سوال کا جواب عرض کر دیتا ہوں۔ اگر اسلام میں عورت کو بھی ایک ہی وقت میں چار شادیوں کی اجازت دے دی جائے تو ایسی Chaotic society پروان چڑھے گی جسے کوئی سنبھال نہیں پائے گا۔ مرد اپنی ذمہ داریوں سے دور بھاگتا ہے۔ Multiple marriages کے نتیجے میں جو اولاد پیدا ہو گی اُسے اُس عورت کے چاروں شوہروں میں سے کوئی بھی اپنی اولاد کے طور پر Own نہیں کرے گا۔ ہر مرد اس ذمہ داری کو دوسرے پر ڈال دے گا۔ جب اُس بچے کو کوئی بھی شوہر Own نہیں کرے گا تو اُس بچے کو کس باپ کا نام دیا جائے گا؟ جب اُس بچے کے پاس باپ کا نام نہیں ہوگا تو وہ معاشرے میں کیا کہلائے گا؟ اسی طرح بچے کی Maintenance کون ادا کرے گا کیونکہ مرد تو اپنے سگے بچے کو اکثر Afford نہیں کرتا۔ تیسری بات یہ ہے کہ ایسے بچے کو کسی مرد کی جائداد میں سے حصہ نہیں مل پائے گا۔ وراثت کے معاملات میں لڑائی جھگڑے اور فساد شروع ہو جائے گا۔ عورت کے ساتھ یہ جھگڑا رہے گا کہ تم جس مرد کے ساتھ زیادہ وقت گزارتی ہو اُس سے Maintenance charges لو، میں کیوں دوں! اور کوئی شوہر ماننے کو تیار نہیں ہوگا کہ عورت اُس کے ساتھ زیادہ وقت گزارتی ہے۔ یوں ایک Chaos پیدا ہو جائے گا۔ انڈیا میں جو معاشرہ ہے وہ Multiple marriages کی یہ کہہ کر مخالفت کرتا ہے کہ یہ عورت کے ساتھ ناانصافی ہے کہ وہ خود تو ایک خاوند کی پابند رہے اور خاوند چار شادیاں کر لے۔ اسلام میں عورت کو ایک وقت میں ایک سے زیادہ شادیوں سے منع کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اسلام معاشرے کو Chaos سے بچانا چاہتا ہے۔"

مرد کو اس راہ سے بچانے کے لیے کہ جہاں وہ اپنی Wife کا Faithful نہیں رہتا۔ اُسے Multiple marriages کی اجازت دے دی گئی لیکن اسلام نے اُس پر یہ پابندی بھی لگائی کہ وہ تمام بیویوں کے ساتھ انصاف سے کام لے اور یہ ایک انتہائی مشکل امر ہے۔ کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی مرد اپنی تمام بیویوں کے ساتھ یکساں لگاؤ رکھ سکے۔ لائف پارٹنر کی خوبیاں یا خامیاں اُسے اُس سے بہت قریب یا بہت دُور کر دیں گی۔

ہمارے ہاں ایک اور پرابلم ہے کہ بچوں کی شادی کے وقت والدین اُن کی مرضی کو اہمیت نہیں دیتے۔ اسلام میں جہاں پردے کی اتنی پابندی ہے کہ عورت کی آواز غیر مرد نہ سنے اور عورت نامحرم کے سامنے پوری طرح خود کو ڈھانپنے کے بعد جائے وہاں شادی کے معاملے میں لڑکے اور لڑکی کو ایک دوسرے سے بات کرنے اور ایک دوسرے کو دیکھنے کی اجازت دی گئی۔ والدین پر فرض کر دیا کہ آپ بچوں کی پسند پوچھ لیں۔

نکاح اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک وہ دونوں (لڑکا اور لڑکی) خود "قبول ہے" نہ کہہ دیں۔ اولاد

کے Behalf پر باپ "قبول ہے" نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ہم اللہ کے دیے ہوئے اس حق کو اولاد سے چھین لیتے ہیں۔ ہم اپنی اولاد بالخصوص اپنی بیٹیوں کو یہ حق نہیں دیتے کہ وہ اپنی مرضی سے کہہ سکیں کہ ہم فلاں جگہ شادی کرنا چاہتی ہیں۔ جو حق اللہ نے ہماری اولاد کو دیا ہے ہم والدین کو چاہیے کہ وہ حق اُن کے پاس رہنے دیں۔ اسی طرح چار شادیاں اسلام میں جائز ہیں، ہم انھیں حرام قرار نہ دیں اور نہ ہی اُسے بُرا کہیں۔

سوال: کیا ایک کنواری مسلمان لڑکی اپنے والدین کی مرضی کے بغیر نکاح کر سکتی ہے؟

جواب: ہمیں دیکھنا ہے کہ نکاح کی شرائط کیا ہیں:

1۔ لڑکا اور لڑکی بالغ ہوں۔

2۔ نکاح پر راضی ہوں۔

لیکن اولاد پر اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ والد جنھوں نے اپنے خون پسینے کی کمائی اور والدہ جنھوں نے اپنے خون سے بنے دودھ سے بچوں کی پرورش کی، راتوں کو جاگ کر انھیں پالا، بے لوث محبت کی، اُن کے سامنے اپنی پسند رکھ دیں تاکہ وہ اپنے تجربے کی کسوٹی سے پرکھ لیں کہ اولاد کی پسند دنیاوی طور پر صحیح ہے یا نہیں۔

سیدہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کفو میں نکاح کرو اور کفو میں پیغام بھیجو۔ (سنن ابن ماجة، حدیث 1968)

لیکن بچے اپنے جذباتی پن کی وجہ سے اِس بات کو سمجھ نہیں پاتے۔ اُنھیں چاہیے کہ جب وہ اپنی پسند والدین کے سامنے رکھیں تو پھر اُن کی محبت، تجربے، تعلیم اور Wisdom پر اعتماد رکھیں اور والدین کے فیصلے کو اپنے فیصلے پر ترجیح دیں۔

سوال: راہِ تصوف میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دامن کو کیسے پکڑا جائے؟

جواب: ہم شرعی احکامات کی پیروی کریں اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے فرمودات سے روشنی لیتے رہیں تو ہماری رُوح کی پاکیزگی کا سفر زیادہ تیز ہو جائے گا کیونکہ یہ فرمودات علم کا بہت اعلیٰ نمونہ ہیں۔ شرعی احکامات کی پابندی کرنے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے نادر فرمودات سے روشنی حاصل کرنے والا انسان علم کی جانب بہت تیزی سے سفر کرتا ہے۔ جوں جوں انسان میں علم بڑھتا ہے توں توں رب تعالیٰ اُس کی عقل میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے۔ یوں وہ انسان صاحبِ علم و فراست ہونے لگتا ہے۔ یہی اصل تصوف ہے۔

قلبی وارداتیں

قلبی وارداتیں دو طرح کی ہوتی ہیں:

1۔ احوال

2۔ مقام

احوال کی واردات میں ہر فقیر، اہلِ علم، درویش کسی نہ کسی چیز میں قدرت کا جلوہ دیکھ لیتا ہے۔ یہ کیفیت احوال اللہ تعالیٰ ہر فقیر کو عطا فرما دیتا ہے لیکن اہلِ مقام بہت کم صوفیا و درویش ہوتے ہیں۔ اہلِ مقام وہ ہیں جنھیں خلوت میں قدرت کا جلوہ دیکھنے کا موقع مل جاتا ہے۔

اہلِ مقام زیادہ بڑے اہلِ علم ہوتے ہیں لیکن اس مقام تک پہنچنے کے لیے جس راستے اور سفر سے وہ گزرتے ہیں وہ خاصا کٹھن ہے۔ اس کے Test بھی بڑے مشکل ہیں اور Distractions بھی بے تحاشا ہیں۔ مختلف چیزیں انسان کو راستے سے ہٹاتی رہتی ہیں۔ شیطان مختلف کھیل کھیلتا رہتا ہے۔ شیطان کا ایک حربہ بڑا کمال ہوتا ہے کہ وہ انسان کو یقین دلا دیتا ہے کہ تم علم کے کمال کو پہنچ گئے ہو، ہر لحاظ سے مکمل ہو۔ تم سب سے زیادہ باتوں کو جانتے ہو۔ سب سے زیادہ صاحب کمال ہو۔ جہاں انسان اس حربے کا شکار ہوا (اور وہ بہت جلدی اس کا شکار ہو جاتا ہے) وہیں وہ اپنے مقام سے گر گیا۔

یہی تو شیطان کے ساتھ ہوا۔ جب اُسے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم ہوا تو یہ حکم ہونے اور اُس کا انکار کرنے سے پہلے تک وہ فرشتوں میں بہت اعلیٰ مقام رکھتا تھا۔ اُس نے چپے چپے پر سجدے کیے تھے لیکن وہ اس مقام سے گر گیا جب اُس نے کہا کہ یہ پتلا جو مٹی سے بنا ہے اور جس کی کوئی افادیت نہیں، میں اُسے کیوں سجدہ کروں جب کہ میں آگ سے بنا ہوں جو پُر حدت ہے اور اپنا رنگ بدلنے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے۔ جب شیطان کو یہ خیال ہوا کہ میں اس مٹی کے پتلے سے اعلیٰ ہوں اور اسی لیے اس کمال کو پہنچا ہوں تو اس خیال کی بنیاد پر نہ صرف اس نے حجت کی بلکہ اُس حجت پر اصرار بھی کیا۔

شیطان انکار کرنے سے نہیں بلکہ حجت پر اصرار کرنے کی وجہ سے ابلیس کہلایا۔ حکم سے سرتابی حضرت آدم علیہ السلام سے بھی سرزد ہوئی لیکن فرق دونوں میں یہ تھا کہ شیطان نے نافرمانی پر اصرار کیا اور ابلیس ہو

گیا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے غلطی کی پھر فوراً معافی مانگی اور اللہ نے انھیں دوبارہ وہ مقام عطا کر دیا اور زمین میں خلافت بھی عطا کر دی۔

شیطان جس خیال سے اپنے مقام سے گرا وہی خیال وہ انسان کے دل میں ڈالتا ہے اور اُس کا یہ حربہ شاذ و نادر ہی رائگاں جاتا ہے۔ اہلِ مقام پر ہی یہ حربہ نہیں آزمایا جاتا بلکہ مجھ جیسے دُنیادار اور گناہ گار لوگ بھی اس میں پھنس جاتے ہیں۔

ہم جیسے دُنیاداروں کے ذہن میں بھی یہ خیال آ جاتا ہے کہ میرے پاس بہت علم ہے۔ میں دوسروں سے زیادہ جانتا ہوں۔ میرے پاس ایسا علم ہے کہ مجھے مزید کچھ سیکھنے کی ضرورت نہیں۔ جہاں انسان کے دل میں یہ خیال آیا تو نہ صرف اُس کے آگے بڑھنے کا عمل رُک گیا بلکہ نیچے گرنے کا عمل شروع ہو گیا۔ اُس کے زوال کی ابتدا ہو گئی۔

انسان کا سفر جاری رہتا ہے۔ اُس میں جمود نہیں آتا۔ یہ کبھی رُکتا نہیں۔ اس میں یا تو انسان کے آگے بڑھنے کا عمل ہوتا ہے یا واپسی کا۔ کہیں جمود نہیں آتا۔

انسان اُس وقت تک آگے بڑھتا رہتا ہے جب تک اُس میں سیکھنے کی خواہش ہوتی ہے۔ جو اچھا سیکھا اُس پر عمل کر لیا تو اُس کی ترقی ہو گئی۔ اس راہ کی منزل بہت اُونچی ہے اور اس منزل پر صرف آپ ﷺ ہی پہنچ سکے۔ باقی کوئی منزل کو نہ پہنچ سکا۔ باقی سب اس راہ کے مسافر ہیں۔۔۔۔ کوئی ایک میل دور تو کوئی دس میل دور۔

یاد رکھیں! اِس وہم کا شکار ہو کر کہ میں اچھا ہوں، انسان اپنے اُس زوال کا سفر شروع کر دیتا ہے جو اُسے پاتال کی گہرائیوں میں لے جاتا ہے۔

رب تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں غصہ رکھا۔ جب اُسے غصہ آتا ہے تو اُس کی عقل، سمجھ اور علم سلب ہو جاتا ہے۔ عقل، علم اور سمجھ غصے سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔ اللہ نے تو اس لیے انسان کی فطرت میں غصہ رکھا تھا کہ انسان اپنی حفاظت کر سکے۔ لیکن انسان کی کم علمی غصے کو اُس مقام پر لے گئی جہاں وہ غصے سے یوں مغلوب ہو جاتا ہے کہ اُسے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اگر کسی انسان کی اصلیت دیکھنا ہو تو تین چیزیں دیکھیں:

1۔ غصے میں وہ کیا کہتا ہے کیونکہ غصے میں جو اندر ہو وہ باہر آ جاتا ہے۔

2۔ بہت زیادہ خوشی میں اُس کا رویہ کیسا ہے۔

3۔ جب اُسے کسی کے ہاتھوں بڑا نقصان یا دُکھ سہنا پڑے تب اُس کا ردِ عمل کیسا ہے کیونکہ ایسی صورت میں بھی اُس کی اصلیت کھل جاتی ہے جو اُس کے اندر ہو وہ اُگل دیتا ہے۔

حکیم لقمان کو عقل کا Icon (تمثال) کہا جاتا ہے۔ وہ حکمت کا نشان ہیں۔ حکیم لقمان حبشی النسل غلام تھے

لیکن رب تعالیٰ نے اُنھیں بے پناہ علم و حکمت سے نوازا تھا۔ بہت نیک انسان تھے۔ اُن کے آقا کا ایک باغ تھا جس کی رکھوالی حکیم لقمان کرتے تھے۔ چونکہ علم و حکمت کی وجہ سے یہ کم آمیز تھے اور لوگوں سے زیادہ گھلتے ملتے نہیں تھے اس لیے اُن کے ساتھی اس کم آمیزی کو بے وقوفی پر محمول کر کے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کیا کرتے اور درختوں پر لگنے والا پھل خود کھا لیتے لیکن آقا کے سامنے حکیم لقمان کا نام لگاتے۔ جس کی وجہ سے آقا رفتہ رفتہ حکیم لقمان سے ناراض و بدظن رہنے لگا۔ یہ صورت حال دیکھ کر ایک روز حکیم لقمان نے بڑے مؤدبانہ انداز میں آقا سے ناراضی کی وجہ دریافت کی تو آقا نے کہا" تم میرے درختوں کے پھل چُرا کر کھا جاتے ہو، تمھارے ساتھی اس کے گواہ ہیں۔" حکیم لقمان نے کہا" میرے آقا! میں ثابت کر سکتا ہوں کہ پھل میں نہیں بلکہ کوئی اور کھاتا ہے۔" ایک دن جب بہت کم پھل آقا کے پاس پہنچائے گئے تو وہ بہت برہم ہوا۔ حکیم لقمان نے کہا" ابھی فیصلہ ہو جاتا ہے کہ پھل میں نے کھائے ہیں یا باقی لوگوں نے۔ آپ سب غلاموں کو اکٹھا کر کے خوب گرم پانی پلایئے اور پھر اُنھیں دوڑنے کا حکم دیں۔ جب وہ دوڑیں گے تو اُنھیں قے آئے گی اور جو کچھ اُنھوں نے کھایا ہو گا وہ باہر آ جائے گا۔" آقا نے ایسا ہی کہا۔ جب سب کو قے آئی تو دیکھا کہ ہر غلام کی قے میں پھل کے ٹکڑے ہیں جب کہ حکیم لقمان کی قے صاف پانی ہے۔ یوں بھید کھل گیا کہ اصل بے ایمان اور چور کون تھا۔

یوں سمجھ لیجیے کہ غصہ بھی کچھ کھانے کے بعد گرم پانی پی کر دوڑنے کے مترادف ہے۔ جب غصہ آتا ہے تو انسان کی اصل شخصیت سامنے آ جاتی ہے۔ اُس کے اندر جو کچھ ہوتا ہے وہ اُگلنے لگتا ہے۔ عقل مند غصے کو قابو میں رکھتے ہیں تاکہ اُن کے پیٹ میں جو کچھ ہو وہ عیاں نہ ہونے پائے۔

رُوحانیت میں غصہ زہرِ قاتل ہے۔ وہ فقیر جسے غصہ بہت آتا ہے وہ رُوحانیت میں بہت آگے نہیں بڑھ پاتا۔ رُوحانیت میں آگے بڑھنے اور رب تعالیٰ سے انعام پانے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم دوسروں کے جبر کو Smiling face کے ساتھ سہتے رہیں۔ لوگوں کے طعن و طنز اور تحقیر کو مسکراتے چہرے کے ساتھ برداشت کر لیں۔ لیکن یاد رکھیے کہ اگر دل میں غصہ آتا رہا اور صرف ظاہری طور پر مسکراتے رہے تو بات نہیں بنے گی۔

بات صرف تب بنے گی جب کوئی ہمیں کہے کہ تم سے بڑا چور میں نے کوئی نہیں دیکھا تو انسان خود کو یوں سمجھا لے کہ یہ بڑا بھلا آدمی ہے، یہ جھوٹ نہیں بولتا، میں یقیناً چور ہی ہوں گا جو اس نے مجھے ایسا کہا۔ مجھے اس کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے میری ایک غلطی Point out کر کے مجھے اپنی اِصلاح کرنے کا موقع فراہم کیا۔

اسی طرح اگر ایک شخص طعن و طنز یا تحقیر کرتا ہے تو انسان خود کو سمجھائے کہ میں یقیناً ایسا ہی ہوں جو اِس نے مجھے ایسا کہا۔ جب وہ اِس سے سبق لے کر اپنے آپ کو سدھارنے لگے تو پھر ولایت اُس سے زیادہ دُور نہیں۔ تب اُس کی اِصلاح بہت تیزی سے ہوتی ہے اور وہ بہت جلد اعلیٰ اقدار کو سیکھتا ہے۔

فقیر یا درویش کو آپ ہمیشہ بہت خوش اطوار پائیں گے۔ اُس کے طور طریقے، اُس کی اقدار، نشست و

برخاست، گفتگو میں ایسا سلیقہ و قرینہ دکھائی دے گا جو دل کو بھاتا ہے کیونکہ وہ طریقہ، سلیقہ، قرینہ، اطوار اور اخلاق سنت نبوی ﷺ سے منور ہے۔ آپ ﷺ کے اخلاق حسنہ ہر انسان سے بہتر و اعلیٰ ہیں۔ وہاں سے لی گئی روشنی سب کو بھائے گی۔ اس لیے فقیر و درویش ہمیشہ خوش اطوار و خوش سلیقہ ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بھی یاد رہے کہ مولانا روم کے بقول رحمۃ اللہ علیہ "روحانیت کی راہ میں بہروپیے زیادہ ہیں۔"

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصانیف میں جگہ جگہ اِسے Highlight کیا کہ رُوحانیت کی راہ میں ایسے لوگ آ گئے ہیں جو درحقیقت وہ نہیں جو خود کو ظاہر کرتے ہیں۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے اہلِ علم کی دو قسمیں بتائی ہیں:

1. جو علم کے گھوڑے پر سوار ہو جاتے ہیں۔ علم کی رکاب میں اُن کے پاؤں اور علم کی لگام اُن کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور وہ علم کی سواری کو صحیح سمت میں دوڑانے لگتے ہیں۔ یہ اصلی علم والے لوگ ہیں۔
2. دوسری قسم وہ ہے جس میں علم انسان پر سواری کر رہا ہوتا ہے۔ اُس پر کتب اور معلومات کا بوجھ لدا ہوتا ہے۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے دوسری قسم بیان کرنے کے بعد خاصے سخت الفاظ استعمال کیے۔ اُن کا مقصد یہ تھا کہ انسان اہلِ علم کی اُس قسم میں داخل ہو جائے جہاں انسان علم کی سواری کرنے لگے۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو چند احادیث، آیات اور بزرگانِ دین کے اقوال یاد کر لیتے ہیں اور جگہ جگہ اُنھیں Quote کر کے لوگوں کو یہ تاثر دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ وہ صاحبِ علم ہیں۔

میں بھی لوگوں کو متاثر کرنے کے لیے بعض اوقات یہ بات کہا کرتا ہوں کہ رب تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور وہ مقام عطا کیا کہ فرشتوں نے اُسے سجدہ کیا۔ جسے فرشتوں نے سجدہ کیا وہ انسان اتنا کمزور کیسے ہو سکتا ہے کہ جنات اُس پر قابو پا لیں یا اُسے اپنی مرضی کے مطابق چلا لیں۔ یہ تو انسان ہے جو جنات پر قابو پا لے گا اور اُن پر سواری کر لے گا اِس لیے کہ وہ جنات سے افضل ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ انسان جسے فرشتوں نے سجدہ کیا اُس پر مسائل سوار ہو جائیں۔ یہ تو انسان ہے جو مسائل پر سوار ہو گا اور مسائل کو اپنی مرضی کے مطابق حل کرے گا۔ مسائل اُسے اپنی مرضی کے مطابق پریشان نہیں کریں گے۔

ہم ذرا ذرا سی بات پر پریشان ہو جاتے ہیں۔ کم از کم میرا رویہ تو یہی ہے کہ اگر کبھی مجھے ڈریسنگ ٹیبل پر کنگھا نہ مل رہا ہو تو میں فوراً گاڑی ڈرائیو کر کے سو ڈیڑھ سو میل دُور پیر صاحب کے پاس جا کر کہتا ہوں کہ دُعا کر دیجیے کہ مجھے ڈریسنگ ٹیبل پر کنگھا مل جائے۔ شام کو آتا ہوں تو کنگھا وہاں رکھا ہوتا ہے۔

جب میں چھوٹے چھوٹے مسائل کو اس طرح سر پر سوار کر لیتا ہوں تو اپنے مقام سے بہت نیچے آ جاتا

ہوں۔ جب میں اشرف المخلوقات نہ رہا بلکہ مسائل افضل ہو گئے کیونکہ میں نے مسائل کو کنٹرول نہیں کیا بلکہ مسائل نے مجھے قابو کر لیا۔

اللہ نے فرمایا کہ میرے دوستوں کو خوف نہیں۔ لیکن یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ہمیں خوف و پریشانی کا سامنا رہتا ہے۔ یہ دراصل ایک ولی اللہ اور عام انسان کے رویوں کا فرق ہے۔ اللہ نے انسان کی سرشت میں جو خوف رکھا وہ بھی اُس کی حفاظت کے لیے رکھا۔ مثلاً اگر مجھے آگ سے جلنے کا خوف نہ ہو تو میں آگ کو پکڑنے کی کوشش کروں گا اور اپنا ہاتھ جلا لوں گا۔ یہ خوف دراصل Defence mechanism ہے لیکن ولی اللہ کا خوف، دُکھ، رنج Momentary ہوتا ہے۔ ایک لہر آئی اور لوٹ گئی۔ صاحبِ علم کو جب کبھی کسی دُکھ، رنج یا خوف کا سامنا ہو تو وہ ایک لمحہ اُسے محسوس کرے گا اور پھر ٹھیک ہو جائے گا۔ عام انسان کا بیٹا اِنتقال کر جائے تو اُس کی کمر ٹوٹ جاتی ہے وہ دُنیا سے بے زار ہو جاتا ہے جب کہ ایک ولی اللہ کا دُکھ وقتی ہوتا ہے۔ وہ کچھ ہی دیر میں سنبھل جاتا ہے۔

ایک عام انسان اور ولی اللہ میں یہی فرق ہے اور اسی فرق کو اللہ تعالیٰ نے Refer کیا ہے۔ انسان میں یہ صلاحیت اور خوبی تب پیدا ہوتی ہے جب اُس کے پاس علم آ جائے۔ جب وہ صاحبِ مقام ہو جائے پھر رب تعالیٰ پر اُس کا بھروسا اُس درجے کا ہوتا ہے کہ کوئی چیز اُسے ہلا نہیں پاتی، پریشان نہیں کر پاتی۔ دُکھ یا پریشانی لمحوں کی ہوتی ہے۔ لمحوں میں وہ دوبارہ نارمل ہو جاتا ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ انسان کی فطرت نہیں بدلتی۔ جو چیزیں فطرت میں ہیں وہ ختم نہیں ہوتیں۔ کچھ لوگ اُن پر قابو پا لیتے ہیں۔ وہ اپنی سرشت اور جبلت پر قابو پا کر خود کو Superior ثابت کرتے ہیں تو کچھ اُس کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے اہلِ علم کی جو دوسری قسم بیان کی تھی کہ اُن پر معلومات اور کتب کا بوجھ لدا ہے۔ جیسے ہم ٹونٹی کھولتے ہیں تو اُس وقت تک پانی اُس میں سے آتا رہے گا جب تک ٹینک خالی نہ ہو جائے۔ لیکن ذرا سوچیے کہ اُس ٹونٹی یا نلکے کے پاس اپنا کیا ہے؟ پانی ٹینک میں ہے۔ ٹونٹی یا نلکے کی اپنی Value تو کوئی بھی نہیں۔ اسی طرح جب انسان نے معلومات محض اکٹھی کی ہوتی ہیں تو وہ اُس گلاس کے مانند ہوتا ہے جسے ہم نے کسی دریا، تالاب، ٹینک یا نلکے سے بھرا ہوتا ہے اور پھر اُسے ایک طرف رکھ دیتے ہیں تا کہ اُس کی اندر مٹی یا ریت کے ذرات نیچے بیٹھ جائیں۔ کچھ دیر میں اُس پانی میں موجود کثافتیں Settle down ہو جاتی ہیں لیکن اگر اُس گلاس کو ہلا دیں تو وہی کثافتیں پھر اُوپر اُٹھ آتی ہیں۔ اسی طرح جب انسان کے اپنے اندر علم نہیں ہوتا تو شیطان کا ہلکا سا جھٹکا، بہکاوا، نفس کی ذرا سی خواہش، حالات کا تھوڑا سا جبر اُس کے اندر کی کثافتوں کو ظاہر کر دیتا ہے۔ یہ علم ہے جو اندر کی کثافتوں کو فلٹر کرتا ہے۔ فلٹر کے بعد جو پانی گلاس میں بچے گا وہ صاف ستھرا اور پینے کے لائق ہوگا۔ یہ صرف علم ہی ہے جو انسان کی کثافتوں کو دُور کر دیتا ہے۔

سوال: یہ کیسے پتا چلے گا کہ اہلِ مزار واقعی ولی اللہ ہے؟

جواب: ولی اللہ کے مزار پر حاضری سکونِ قلب کا باعث ہے اور یہ جاننا ضروری نہیں کہ اہلِ مزار واقعی ولی اللہ ہے۔ ہمارے لیے بس اتنا ہی کافی ہے کہ قبرستان جائیں تو سنت کے مطابق اہلِ قبور کو سلام کریں۔ فاتحہ خوانی کر کے اُس کا ثواب اہلِ قبور کو پہنچا دیں۔ یہ بات خود ہمارے اپنے فائدے میں بھی ہے کیونکہ اس کا ثواب خود ہمارے اپنے نامۂ اعمال میں بھی لکھ دیا جائے گا۔

اہلِ مزار کے ولی اللہ ہونے یا نہ ہونے کی کُرید میں نہ پڑیں۔

اللہ نور ہے

سوال: سورۃ النور کی آیت نمبر 35 میں ارشاد ہوا جس کا ترجمہ ہے:

"اللہ آسمان و زمین کا نور ہے۔"

ایک فقیر اس نور کی تشریح کیسے کرے گا؟

جواب: جب کچھ نہیں تھا صرف رب تعالیٰ اور اُس کے فرشتے تھے تو رب نے چاہا کہ وہ کوئی ایسی تخلیق کرے جس سے اُس کی ذات کا اندازہ ہو سکے۔ یہ وہ وقت تھا جب صرف اللہ تعالیٰ کا نور قائم تھا یا فرشتے تھے۔ رب تعالیٰ کا نور جس کو اس آیت میں Refer کیا گیا ہے یہ وہ نور نہیں جو اُس وقت سے پہلے تھا بلکہ بعد کے نور کو Refer کیا گیا ہے۔

ایک تو رب کا نورِ ذات ہے دوسرا نورِ قدرت ہے۔ رب کا نورِ قدرت بہت چمک دار دودھیا رنگ کا ہے جیسے کسی مرکری ویلپن لیمپ کی روشنی بہت دودھیا چمک دار ہوتی ہے۔ ایسے خوش نصیب لوگ بھی ہیں جنھیں یہ شرف رب نے بخشا کہ اُنھوں نے رب کا نور کسی نہ کسی طریقے سے دیکھ لیا۔

نورِ ذات دیکھنے کا شرف بہت کم لوگوں کو حاصل ہوا۔ نورِ ذات کا رنگ ہی دکھائی دیتا ہے کیونکہ نورِ ذات کا جلوہ کوئی سہہ نہیں سکتا۔ نورِ ذات آسمانی رنگ سے بھی بہت ہلکا چمک دار نیلا رنگ ہے۔ بہت کم لوگوں کو یہ شرف حاصل ہوتا ہے کہ وہ اس نور کے رنگ کو دیکھ لیں۔

جب رب نے چاہا کہ وہ کائنات کی تخلیق کرے تو اُس نے اپنے نور کے قلبی حصے سے نور کا حصہ لیا یا یوں کہہ لیجیے کہ اپنے نور کے قلبی حصے سے ایک نور پیدا کیا جس کا رُوحانیت میں اصطلاحی نام نور المرواریہ ہے۔ اس نور سے آپ ﷺ کی تخلیق ہوئی۔ پھر نور المرواریہ کے قلبی حصے سے رب تعالیٰ نے ایک اور نور پیدا کیا جسے نور الہدیٰ کہتے ہیں۔ پھر نور الہدیٰ کے دو حصے کیے:

1۔ نور الہدیٰ المتقین

2۔ نور الہدیٰ العالمین

نور الہدیٰ المتقین سے تمام انبیا کی ارواح تخلیق ہوئیں جب کہ نور الہدیٰ العالمین سے دیگر تمام انسانوں

کی ارواح تخلیق ہوئیں۔

اب ہمیں یہ بات سمجھ آجائے گی کہ جب نور المرواریہ کے قلب سے نور الہدیٰ کو پیدا کیا جا رہا تھا تو نور الہدیٰ شرم و حیا کی وجہ سے پردے میں چلا گیا، شرم و حیا کے پردے کی وجہ سے وہاں محبت پیدا ہوئی۔ اس محبت نے پھر ساری چیزوں کو جنم دیا۔

یہ جو کہا جاتا ہے کہ یہ کائنات آپ ﷺ سے محبت کی وجہ سے بنائی گئی، آپ ﷺ وجہ تخلیق کائنات ہیں، یہ رُوحانیت میں اسی نکتے کی طرف اشارہ ہے۔

رب کے نور کا نام نور القا ہے۔ نور القا کی چمک اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ وہ سیاہی مائل چمک دار ہو گیا ہے جیسے کوئی چیز جب گرم ہوتی ہے تو ہم اُسے Red hot کہتے ہیں لیکن جب وہ Red hot کے Point کو Exceed کر جاتی ہے تو White hot ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جب چمک حد سے بڑھ جاتی ہے تو پھر وہ اندھیرے میں تبدیل ہونے لگتی ہے لیکن وہ اندھیرا ایسا نہیں کہ جس میں کچھ دکھائی نہ دے۔

اس سیاہی مائل نور کی مثال ایسی ہے کہ انسان حالتِ نیند میں اندھیرے میں ہوتا ہے۔ اُس اندھیرے میں اُسے کچھ دکھائی نہیں دیتا لیکن جب وہ اُس میں خواب دیکھتا ہے تو وہ اتنا واضح ہوتا ہے کہ باریک سے باریک Detail بھی دیکھ لیتا ہے۔ آپ کوئی خواب یاد کیجیے۔ آپ کو لگے گا کہ اندھیرے میں یک دم ایسا Patch آ گیا تھا جو دکھائی دیتا ہے۔ نور اتنا سیاہی مائل چمک دار ہوتا ہے کہ اس میں باریک سے باریک Detail بھی نظر آ جاتی ہے۔ نور المرواریہ کی شکل قطرے کی سی ہوتی ہے۔ یہ انتہائی چمک دار White ہوتا ہے۔

یہ جو ہم کہتے ہیں کہ ہر شے میں اللہ کا نور بسا ہے۔ اس بات کی ہمیں اس وجہ سے سمجھ آ جاتی ہے جب یہ پتہ چلتا ہے کہ تمام چیزیں نور الہدیٰ المتقین اور نور الہدیٰ العالمین سے بنی ہیں اگر ہم نور الہدیٰ کی Backward ورکنگ کریں تو وہ نور القا کا حصہ بن جائے گا۔

آپ ﷺ کو یہ شرف حاصل ہے کہ آپ ﷺ عرش پر بلا لیے گئے تھے اور رب تعالیٰ اور آپ ﷺ کے مابین بالمشافہ گفتگو ہوئی۔ اُس وقت رب تعالیٰ اور آپ ﷺ کے درمیان ایک مہین سا پردہ تھا۔ وہ پردہ بھی نور ہی کا تھا۔ رب تعالیٰ کے نور نے پوری کائنات کو گھیرے میں لیا ہوا ہے۔ وہ پوری کائنات میں بستا ہے۔

سوال: عام طور پر اللہ کے کون سے نور کی زیارت لوگ کرتے ہیں؟

جواب: ایسے خوش نصیب لوگ جو نیکی کی راہ پر چلتے ہیں اُن میں سے بہت سے لوگوں کو نور کی جھلک دکھا دی گئی۔ جو لوگ نیک ہیں اور رب کو پکارتے رہتے ہیں انھیں جس نور کو دیکھنے کا شرف عطا ہوتا ہے وہ نور اتنا دودھیا چمک دار ہے جس کا ذکر سورۃ النور میں ہوا۔ یہ نورِ قدرت ہے۔ نورِ ذات جو انتہائی ہلکے نیلے رنگ کا

چمک دار ہے اُس کی زیارت کا شرف بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔

سوال: حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر اللہ کی تجلی کی تاب نہ لا سکے اور بے ہوش ہو گئے۔ عام لوگ اُسے کیسے Absorb کر لیتے ہیں؟

جواب: خوش نصیب لوگوں کو رب کی تجلی نہیں بلکہ رب کے نور کا عکس خواب میں دکھائی دیتا ہے۔ رب کی تجلی کوئی اور چیز ہے جب کہ رب کی قدرت کے نور کی جھلک کچھ اور ہے۔ وادی طویٰ میں رب کی جو آواز حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سنی وہ بھی نور الہدیٰ ہی کی تھی۔ جو تجلی کوہ طور پر ڈالی گئی وہ رب کی تجلی تھی۔ رنگ نہیں تھا۔ رب کی تجلی کی تاب کوئی نہیں لا سکتا۔

میں گفتگو میں اکثر حضرت احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا حوالہ دیا کرتا ہوں کہ اُنھوں نے رب تعالیٰ کی خواب میں زیارت کی تھی۔ اُنھوں نے رب کی تجلی نہیں دیکھی تھی بلکہ رب تعالیٰ کی قدرت کے نور کا عکس یا رنگ دیکھا تھا۔ یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ رب کی قدرت کے نور کا جو رنگ ہے وہ تجلی نہیں بلکہ عکس ہے۔

سوال: مجذوبین اور سالکین سے کیا مراد ہے؟

جواب: جو لوگ اللہ کے عشق میں یوں ڈوب جاتے ہیں کہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھیں وہ مجذوبین کہلاتے ہیں۔ جب کہ سالک وہ ہیں جو اللہ کے عشق میں اپنے ہوش و حواس کو قائم رکھتے ہیں لیکن اُن پر بھی کبھی کبھی حالتِ جذب طاری ہو جاتی ہے۔

رُوحانیت میں اس کے لیے دو اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں:

1۔ حالتِ صحو

2۔ حالتِ سکر

حالتِ صحو وہ ہے جب ولی اللہ اپنے ہوش و حواس میں ہو اور معمولاتِ زندگی سرانجام دے رہا ہو۔

حالتِ سکر جذب کی حالت کو کہتے ہیں۔ جب انسان اللہ کے عشق میں ہوش و حواس سے بے گانہ ہو جاتا ہے اس حالت میں کہی ہوئی بات عام طور پر ٹلتی نہیں۔

سوال: حق چار یار...... حاجی، خواجہ، قطب، فرید۔ ان کا آپس میں کیا تعلق ہے؟

جواب: اگر آپ غور کریں تو پتا چلتا ہے کہ یہ وہ چار بزرگ ہیں جن کے دیے سے دیا جلا ہے۔ حاجی سے مراد ہے حاجی وارث پاک رحمۃ اللہ علیہ جن کا تعلق لکھنؤ سے 35 میل دُور ایک قصبے دیوہ شریف سے تھا۔ جب وہ حاجی ہو گئے تو واپس آنے کے باوجود آخری ایامِ عمر تک احرام نہیں کھولا۔

خواجہ سے مراد حضرت معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ المعروف خواجہ غریب نواز صاحب ہیں۔

قطب سے مراد ہیں حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ اور فرید سے مراد ہیں حضرت بابا فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ۔

ان چاروں کو دوست کہا جاتا ہے لیکن مراد یہ ہے کہ ان کی وجہ سے دیے سے دیا جلا ہے۔ سلسلہ وارثیہ چلا ہی حاجی صاحب سے ہے لیکن ان کی چشتیہ سلسلے سے بہت دوستی اور تعلق ہے۔ خواجہ غریب نواز صاحب رحمۃ اللہ علیہ مرشد تھے قطب الدین بختیار کاکی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اور جناب قطب الدین بختیار کاکی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مرشد ہیں حضرت بابا فریدالدین گنج شکر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے۔ یوں چراغ سے چراغ جلا ہے۔

ایک خط

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم اما بعد فاعوذ باللہ من الشطین الرجیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

السلام علیکم خواتین وحضرات!

یہ خط کسی خاتون نے UK سے لکھا ہے۔ خاصا تفصیلی خط ہے۔ میرے بارے میں لکھا ہے کہ میرے خیال میں آپ اس صدی کے مجدد ہیں۔ پھر دُعا کرنے میں تنگی کا مظاہرہ کیوں کرتے ہیں؟ آپ کی باتیں اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی محبت دل میں اور بڑھا دیتی ہیں۔ اللہ کے فضل سے آپ کی دُعا کی طلب گار ہوں (پھر میرے بارے میں اچھے خیالات کا اظہار کیا ہے..... اِس کو رہنے دیجیے) آپ خواہ گستاخی سمجھیں لیکن ضرور کہوں گی کہ جب آپ کی تعلیمات اِتنی اچھی ہیں کہ بے اختیار انسان کا دل نیکی کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کی دُعا لے کر خوش قسمت لوگوں میں اپنا نام لکھوالیا جائے تو آپ دُعا کرنے میں تنگ دلی کا مظاہرہ نہ کریں کیونکہ اللہ کے خزانے تو بھرے پڑے ہیں۔

شاہ صاحب مجھے کچھ باتیں Clear کرنی ہیں۔

سب سے پہلے تو میں اِن خاتون کا شکریہ ادا کردوں کہ اِنھوں نے مجھ پر احسان کیا کہ میری ایک خامی کی جانب توجہ دلائی کہ میں تنگ دل انسان ہوں۔ میں کوشش کروں گا کہ مجھ میں تھوڑی سی کشادہ دلی آجائے۔ میں اِن خاتون سے بھی Request کروں گا کہ اللہ کے حضور میرے لیے دُعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ میرے دل کو تھوڑا سا بڑا کردے تاکہ اُس کی مخلوق کو مجھ سے شکایت نہ رہے کہ میں تنگ دل انسان ہوں۔ بہر حال میں احسان مند ہوں کہ آپ نے میری ایک خامی Point out کردی۔ اُن خاتون نے جو پوائنٹس کلیئر کرنے کو کہا ہے اُن میں سے پہلا یہ ہے۔

پوائنٹ 1: آپ کے اِتنے اچھے لیکچرس کر واقعی دوسروں کی بیعت خراب ہوتی ہے۔ اِس کا مطلب یہ نہیں کہ اُن کے مرشد اچھے اور متقی نہیں جیسے میں نے کسی کی بیعت تو کی ہو لیکن میرے مرشد صاحب نے میری تربیت اس طرح نہ کی ہو جیسی کہ ہونی چاہیے۔ اُن سے بات نہ ہو پاتی ہو یا وہ مجھے عورت سمجھ کر زیادہ بات نہ کرتے ہوں۔ لیکن میں دل سے اُن کی قدر اور عزت کرتی ہوں۔ اُنھیں مرشد مانتی ہوں لیکن ساتھ آپ کے

بتائے ہوئے نوافل بڑی محبت سے جمعہ کے روز پڑھتی ہوں۔ آپ نے ایک لیکچر میں بتایا تھا کہ سورۃ التغابن پڑھنے سے گناہوں اور غلطیوں کی تلافی ہو جاتی ہے۔ کیا یہ سورۃ ہر کوئی پڑھ سکتا ہے؟

بی بی! یہ آپ کا حسنِ ظن ہے کہ میری باتیں آپ کو اچھی نظر آتی ہیں۔ ورنہ میری رائے اس سے بالکل مختلف ہے۔ اللہ مجھ پر رحم فرمائے کہ میری باتیں سن کر کسی بیعت خراب ہو جائے یا کوئی اپنے مرشد سے دور ہو جائے۔

میری ایک بات یاد رکھیے، انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے مرشد کو دُنیا کا بہترین انسان سمجھے اور مانے کیونکہ جب تک انسان کسی کو بہترین نہیں سمجھتا، اُس کو Idealise نہیں کرتا اور جس کو Idealise نہیں کرتا اُس کی باتوں پر عمل نہیں کر پاتا۔ یہی انسانی فطرت ہے۔ کوئی دوسرا انسان کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو ہم پر لازم ہے کہ ہم اپنے مرشد کو دُنیا کے ہر شخص سے بہتر سمجھیں تاکہ ہم دل و جان سے اُن کا احترام بھی کر سکیں اور اُن کی باتوں کو بہتر سمجھ کر اُن پر عمل بھی کر سکیں۔ آپ اپنے مرشد کو بہتر سمجھیے اور حقیقت احوال بھی یہی ہے۔ میں پوری سچائی سے کہہ رہا ہوں کہ میں پوری دُنیا میں سب سے کم تر اور چھوٹا انسان ہوں۔ آپ نے جن کے ہاتھ پر بیعت کی وہ یقیناً عظیم انسان ہوں گے۔ آپ اُنھیں بہترین انسان سمجھیے، اُنھیں Idealise کیجیے تاکہ اُن کی باتوں پر عمل کر سکیں۔

جہاں تک سورۃ التغابن پڑھنے کی بات ہے تو یہ کلام پاک کا حصہ ہے۔ آپ ضرور پڑھیے لیکن اصولی بات یہ ہے کہ کوئی بھی وظیفہ شروع کرنے سے پہلے آپ کو اپنے مرشد سے بات کر لینی چاہیے کہ مجھے یہ چیز اچھی لگتی ہے، میں پڑھوں یا نہ پڑھوں؟ پھر آپ کے مرشد جو آپ سے فرمائیں آپ اُس پر عمل کر لیجیے۔ لیکن میں آپ کو As a matter of principle عرض کردوں کہ سورۃ التغابن قرآن پاک کا حصہ ہے اور اِسے کوئی بھی پڑھ سکتا ہے لیکن پھر عرض کردوں کہ جب ہم کسی کو اپنا مرشد مان لیں تو اپنی مرضی کو لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیں۔

اپنی مرضی یا عقل استعمال کرنے کے Disadvantages کے سلسلے میں ایک واقعہ میں بیان کیا کرتا ہوں کہ ایک شخص کو جب اپنے مرشد کے پاس 30,32 سال ہو گئے تو مرشد صاحب نے اعلان کیا کہ کل عصر کی نماز کے بعد میں آپ کو اپنی تلوار عطا کروں گا۔ سب مریدین نے اُن صاحب کو اِس اعزاز پر مبارک باد دی۔ اگلے دن عصر کے بعد جب سب اکٹھے ہو گئے تو مرشد صاحب نے اُن صاحب سے کہا کہ آپ کی کمر پر جو تلوار بندھی ہے اُسے اُتار کر زمین پر رکھ دیں تاکہ میں اُس کی جگہ اپنی تلوار باندھ دوں۔ اُن صاحب نے اپنی تلوار کھولی اور قریب کھڑی اپنی زوجہ کے ہاتھ میں تھما دی۔ مرشد صاحب نے کہا "میرے خیال میں آپ ابھی Deserve نہیں کرتے کہ آپ کو اپنی تلوار دوں البتہ میرے مرنے کے بعد آپ کو چین کی ایک سڑک پر ایک اجنبی ملے گا جسے آپ کی بیگم پہچان لیں گی، وہ آپ کو میری تلوار دے گا۔

سب لوگ صورت حال کی تبدیلی پر حیران تھے کہ مرشد صاحب نے تلوار اس مرید کو کیوں نہیں دی۔ کسی

مرید نے ہمت کر کے مرشد صاحب سے اُس کا سبب دریافت کیا تو انھوں نے بڑے نکتے کی بات بتائی کہ میں نے اُنھیں تلوار کھول کر زمین پر ڈالنے کو کہا تھا لیکن اُنھوں نے اُسے زمین پر ڈالنے کے بجائے بیگم کے ہاتھ میں تھما دیا۔ جو شخص مرشد کے حکم کے مقابلے میں اپنی عقل استعمال کر رہا ہے وہ ابھی اُس مقام پر نہیں آیا کہ مرشد اُسے اپنی تلوار دے دے۔

کچھ عرصہ بعد اُن مرشد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اللہ نے اُن شاگرد کو بہت علم عطا فرمایا۔ علم ہی کے سلسلے میں اُنھیں ایک بار چین جانا پڑا۔ جب وہ چین کے ایک شہر گئے تو اُنھیں اپنے مرشد صاحب کی بات یاد آئی۔ ایک روز جب وہ اپنی بیگم کے ساتھ کسی سڑک پر جا رہے تھے تو بیگم نے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا کہ یہی وہ شخص ہے جس کے پاس تمھاری تلوار ہے۔ اُس سے جب بات ہوئی تو اُس نے مرشد صاحب کی تلوار اُن شاگرد کو دے دی۔

یاد رکھیے! مرشد کی بات اور حکم کے مقابلے میں اپنی عقل و سمجھ کو استعمال کرنے والا شخص علم کے اُس مقام تک نہیں جا پاتا جس تک اُسے جانا چاہیے۔

بی بی! آپ اپنی سمجھ سے کام نہ لیجیے بلکہ جو بھی معاملہ ہو مرشد کے سامنے رکھ دیں۔ وہ جو بھی فرمائیں، کر لیجیے۔ اس راہ کا اصول یہی ہے۔

پوائنٹ 2: کیا سورۃ التغابن اور نوافل عوام الناس کے لیے ہیں یا صرف آپ کے مریدین کے لیے؟

بی بی! میں دُنیا کا گناہ گار ترین آدمی ہوں۔ علم سے قطعی طور پر تہی دامن ہوں۔ میرے مریدین کہاں سے آ گئے۔ میں تو اُس مقام پر شاید دس بار پیدا ہو کر بھی آ جاؤں تو نہ پہنچ سکوں۔ میں جو بات بھی کہہ رہا ہوں وہ ہر آدمی کے لیے ہے اس پر جو چاہے عمل کر لے۔ لیکن وہ صاحبان جو کسی کے ہاتھ پر بیعت کیے ہوئے ہیں وہ اسے ضرور پڑھیں لیکن مرشد صاحب کی اجازت کے بغیر نہیں۔

پوائنٹ 3: اگر سورۃ التغابن، بسم اللہ کا وظیفہ اور نوافل صرف آپ کے مریدین کے لیے ہیں تو یہ بہت زیادتی ہے۔ کاش آپ کلیئر کر دیا کریں کہ یہ عوام الناس کے لیے ہے یا نہیں۔

بی بی! میں معافی چاہتا ہوں، میرے ذہن میں یہ نہیں تھا کہ یہ بات کہیں Confusion پیدا کرے گی ورنہ میں ضرور کلیئر کر دیتا کہ یہ سب کے لیے ہے۔

یہ خاتون مزید لکھتی ہیں...... شاہ صاحب! علم انبیا کی میراث ہے جو سب تک پہنچنا چاہیے۔

بی بی! میں گواہی دیتا ہوں کہ علم واقعی انبیا کی میراث ہے۔ میں جس طرح کی لایعنی باتیں کرتا ہوں اُسے علم نہیں کہا جا سکتا۔ علم تو بہت آگے کی بات ہے۔

پوائنٹ 4: آپ مختلف آیات، سورتوں اور وظائف کے بارے میں بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اُنھیں Body chemistry کے مطابق پڑھنا چاہیے۔ لیکن آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ سورۃ الملک ہر مومن کے دل میں ہونی چاہیے۔

شاہ صاحب! سوال پوچھنا میرا حق ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ سے بھی کسی عورت نے سرِ محفل حق مہر کا پوچھا تھا۔ مجھے بھی پوچھنے کا حق ہے۔

بی بی! یہ بات سمجھ لیجیے کہ آپ ﷺ کا مقام رب کے بعد سب سے بڑا ہے۔ کوئی کم بخت اور بدنصیب ہی ہو گا جو اپنی آواز کو آپ ﷺ کی آواز سے بلند کرے گا۔ آپ ﷺ نے جو فرما دیا اُس کی تقلید نہ صرف ہم سب پر فرض ہے بلکہ وہ حرفِ آخر ہے۔ وہ وظائف، تسبیحات، آیات اور سورتیں جنھیں پڑھنے کی تلقین آپ ﷺ نے فرمائی اُنھیں ضرور پڑھنا چاہیے۔ سورۃ الملک بھی اُن میں سے ایک ہے۔

آپ نے فرمایا کہ آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ سورۃ الملک ہر مومن کے دل میں ہونی چاہیے۔

بی بی! میرے علم کی حد تک یہ فرمان آپ ﷺ کا سورۃ یٰسٓ کے بارے میں ہے۔ سورۃ الملک کے بارے میں مجھے علم نہیں۔

جو چیز دل میں ہوتی ہے وہ کبھی دھیان سے اوجھل نہیں ہوتی۔ انسان اُسے کبھی نہیں بھولتا اور جسے وہ بھولتا نہیں، اُس پر عمل کرتا ہے۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن پاک پڑھنا باعثِ رحمت و برکت ہے۔ قرآن پاک پر عمل کرنا باعثِ نجات ہے۔ ہم نجات کی راہ پر کیوں نہ چلیں؟ ہم سورۃ الملک پڑھیں پھر اُس کو سمجھیں اور اُس پر عمل کر لیں۔

سوال کرنا نہ صرف آپ کا بلکہ ہر شخص کا حق ہے۔ کوئی شخص اگر سرِ راہ روک کر بھی مجھ سے سوال کرے تو میں کوشش کروں گا کہ اُس کا جواب دے دوں۔

پوائنٹ 5: کیا آپ عورتوں کو کم تر سمجھتے ہیں کہ اُن کے سوالوں کے جواب نہیں دیتے؟ مجھے آپ کے لیکچرز بہت پسند ہیں۔ ہر روز اُمت اخبار میں آپ کے لیکچر سے اقتباس پڑھتی ہوں جو تربیت کا حصہ ہے۔

بی بی! ہم سب الحمدللہ مسلمان ہیں۔ اسلام میں ہر بات کو واضح کر دیا گیا ہے اور کسی کو حق نہیں کہ اُس میں ترمیم و تحریف کرے۔ اسلام میں عورتوں کو بہت تکریم دی گئی ہے۔ جب رب تعالیٰ نے خواتین کو قابلِ احترام بنایا ہے تو میں کون ہوتا ہوں اُن کے احترام میں کمی کرنے والا! ایسا ہرگز نہیں کہ میں عورتوں کو کم تر سمجھتا ہوں صرف میں یہ احتیاط کرتا ہوں کہ جو سوالات خواتین کی طرف سے ہوتے ہیں۔ اُن کی Privacy کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں عموماً اُن کے نام نہیں پڑھتا نہ Gender ظاہر ہونے دیتا ہوں کہ سوال خاتون نے پوچھا ہے یا صاحب نے۔ ورنہ ہر سوال کا جواب دیتا ہوں خواہ وہ کسی نے بھی پوچھا ہو۔

آپ کی بڑی عنایت کہ آپ ''اُمت'' اخبار میں شائع ہونے والا اقتباس پڑھتی ہیں۔ اللہ کرے کہ وہ آپ کی توقعات پر پورا اُترتا رہے اور علم بڑھنے کا سبب بن جائے۔ شاید میں اسی طرح بخش دیا جاؤں۔ کیونکہ جب اپنے نامۂ اعمال پر نظر ڈالتا ہوں تو وہاں گناہوں کی سیاہی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ یوں لگتا ہے جیسے نامۂ اعمال پر کسی نے برش لے کر سیاہ پینٹ پھیر دیا ہو۔

پوائنٹ 6: حکمت (Wisdom) کو قرآن پاک میں خیرِ کثیر کہا گیا۔ آپ نے ایک بار تقشیرِ مبرم اور

تقدیرِ معلق کے بارے میں بتایا تھا کہ تقدیرِ مبرم کل تقدیر کا پانچ سے دس فی صد ہے اور یہ وہ تقدیر ہے جسے کوشش سے تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ اگر انسان پیدائشی یا جبلی طور پر بہت بے وقوف ہو تو وہ عقل مند کیسے ہو سکتا ہے۔ کس طرح کی کوشش سے حکمت و دانائی حاصل کرسکتا ہے؟

شاہ صاحب! میں پیدائشی طور پر بہت بے وقوف ہوں مجھے حکمت کے حصول کا کوئی نسخہ بتا دیجیے۔

بی بی! تقدیرِ مبرم سے عقل مندی یا بے وقوفی کا کوئی تعلق نہیں۔ تقدیر مبرم وہ ہے جو کلیتہً رب تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھی جب کہ تقدیرِ معلق وہ ہے جسے ہم اپنے اعمال سے لکھ لیتے ہیں۔ اگر میں نیک اعمال کروں گا تو نیک کہلاؤں گا...... یہ میرے اپنے اختیار میں ہے۔

By instinct کوئی عقل مند یا بے وقوف نہیں ہوتا۔ عقل مندی یا بے وقوفی کا تعلق انسانی دماغ کے اُن خلیوں کے ساتھ ہے جو مرتے اور نئے بنتے رہتے ہیں۔ عقل کا تعلق براہِ راست مشاہدے سے بھی ہے۔ جس انسان کا جتنا زیادہ Exposure ہوتا ہے۔ وہ جتنے لوگوں سے ملتا ہے اُنھیں گہری نظر سے Study کرتا ہے اور اُن کی اچھی باتیں اور خوبیاں Pick کر لیتا ہے تو وہ دن بدن عقل مند اور سمجھ دار ہوتا چلا جاتا ہے۔

ہماری عقل مندی کا تعلق تین چیزوں سے ہے:

1۔ مشاہدہ

2۔ Learning

3۔ Exposure

کسی انسان کو جتنا زیادہ Exposure ملتا ہے اُسی قدر اُس کا مشاہدہ تیز ہوتا چلا جاتا ہے۔ جس قدر مشاہدہ تیز ہو اُسی قدر اُس کا Vision وسیع (Broad) ہوتا چلا جاتا ہے اور جتنا کسی کا Vision وسیع ہو۔ اُتنی ہی اس میں حکمت ہوگی۔

اگر میں حکمت اور عقل مندی کا طالب ہوں تو مجھے چاہیے کہ اپنی عمر سے بڑے پڑھے لکھے اور اپنے سے بہتر لوگوں میں بیٹھوں۔ اُن سے میں بہت کچھ سیکھوں گا۔

اس کے علاوہ مجھے چاہیے کہ میں بڑے نامور اور کامیاب لوگوں کی یادداشتیں اور سوانح عمریاں پڑھوں۔ اُنھوں نے زندگی میں جو کچھ سیکھا وہ سنوں اور پڑھوں۔ یادداشتیں M e m o i r s اور سوانح عمریاں (Biographies) پڑھنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہم ایک شخص کی 70 سالہ زندگی کے اہم اور سبق آموز واقعات چند سو روپوں کے عوض پڑھ لیتے ہیں اور اُن سے بہت کچھ اخذ کر لیتے ہیں اس طرح جب ہم لوگوں کی سوانح عمری پڑھتے ہیں تو گویا Wisdom حاصل کر رہے ہوتے ہیں۔

حکمت کے حصول کے لیے سفر بہت اہم ہے۔ سفر وسیلہ ظفر ہوتا ہے۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان ہے کہ فقیر پر لازم ہے کہ وہ رب تعالیٰ کی زمین پر چل پھر کر رب کی قدرت کا مشاہدہ کرے۔ یہ سب چیزیں عقل، علم اور حکمت میں اضافہ کردیں گی۔

پوائنٹ 7: شاہ صاحب! مجھے معاف کردیں اور میرے لیے وہ دُعا کردیں جو آپ کو پسند ہو۔ میں حقیقتاً بہت بے وقوف ہوں۔ بے وقوفیوں، غلطیوں اور کمزوریوں سے بھری پڑی ہوئی۔ میں شکر گزار ہونا چاہتی ہوں۔ کسی لیکچر میں میرا نام لیے بغیر مجھے ڈانٹ دیں یا تنبیہ کردیں۔ آپ کی ڈانٹ سے مجھے خوشی ہوگی لیکن خیال رہے کہ میں عورت ہوں مجھے رُسوا نہ کیجیے گا۔

بی بی! اللہ مجھے معاف فرمائے کہ میں کسی کو رُسوا کروں۔ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ کبھی بھی اللہ کے کسی بندے کو رُسوا کروں...... یہ سنتِ رب نہیں ہے۔ سنتِ رب تو یہ ہے کہ دوسروں کے عیوب پر پردہ ڈالا جائے۔

میں آپ کو ڈانٹنے کا حق نہیں رکھتا کیونکہ آپ سے بہتر نہیں ہوں۔ کسی کی خامیوں کو وہی Point out کرسکتا ہے جو دوسروں سے بہتر ہو۔ کسی کو بے وقوفیوں پر وہی ڈانٹ سکتا ہے جو خود عقل مند ہو۔ میں اپنے اندر یہ خوبیاں ابھی تک پیدا نہیں کر سکا اس لیے میں آپ کو نہ ڈانٹ سکتا ہوں نہ خامیوں کو Point out کر سکتا ہوں۔

پوائنٹ 7: شاہ صاحب! میں نے متعدد بار آپ کو خواب میں دیکھا ہے۔ جو دیکھا وہ ابھی تک ذہن پر نقش ہے۔ آپ میرے گھر کی کھڑکی کے باہر کھڑے ہیں اور مجھے باہر ہی سے ایک سفید کپڑا اور بٹن دیتے ہیں کہ اسے اس کپڑے پر سی دو۔ تھوڑی دیر بعد آپ گھر آتے ہیں اور سفید چادر والے پلنگ پر بیٹھ جاتے ہیں۔ وہاں اور بھی لوگ موجود ہیں جو آپ سے دُعا کروانے آئے ہیں۔ میں اُسی پلنگ پر ذرا ایک سائیڈ پہ بیٹھ کر بٹن ٹانکنے لگتی ہوں تو بٹن نہیں ٹانکا جا رہا۔ آپ اچانک دھاگے کی طرف دیکھتے ہیں تو مجھے سمجھ آجاتی ہے کہ دھاگا کالا نہیں سفید ہونا چاہیے۔ جب سفید دھاگے سے بٹن سیتی ہوں تو آپ خوشی کا اظہار کرتے ہیں کہ اب ٹھیک ہے۔

بی بی! اس سے اندازہ کر لیجیے کہ میں کتنا بُرا شخص ہوں کہ کسی کو چین سے سونے نہیں دیتا۔ اُن کے خوابوں میں گھسا چلا آتا ہوں۔ میں تو لوگوں کی خدمت کرنے کے بجائے اُن سے کام کرا کر خوش رہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے میں اُس کی مخلوق کے لیے مصیبت بنا رہتا ہوں۔

بی بی! میں نے آپ کی خواہش کے مطابق آپ کا پورا خط پڑھ دیا ہے کہ شاید آپ کو خوشی مل جائے۔

آرزوئیں

انسان کی زندگی میں جبلت کے ذریعے آرزوئیں جنم لیتی ہیں۔ انسان جبلی طور پر خواہشات کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اگر وہ ایک بار آرزوئیں پوری کرنے کے سلسلے میں پڑ جائے تو یہ بڑھتی چلی جاتی ہیں حتیٰ کہ انسان اُس مقام پر چلا جاتا ہے جہاں آرزوؤں کی تکمیل ممکن نہیں رہتی۔ حالاں کہ انسان اگر اپنی زندگی میں دیکھے تو ایک وقت میں کپڑوں کا ایک ہی جوڑا پہن سکتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک کے اُوپر دوسرا اور دوسرے کے اُوپر تیسرا جوڑا پہن لے۔ ایک وقت میں وہ ایک ہی کمرہ میں رہ سکتا ہے لیکن اِس سب کے باوجود اُس کی آرزوؤں کا سلسلہ دراز ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ مختلف خواہشات پالنے لگتا ہے اور پھر اُن کی کوئی حد نہیں رہتی۔

ایسی ہی ایک خواہش مال وزر کے حصول کی ہے جس کی مثال مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے یوں دی ہے کہ انسانی زندگی کشتی کی مانند ہے اور مال وزر یا دولت پانی کی مانند۔ کشتی کو صرف اُتنا ہی پانی چاہیے کہ جو اُس کے وزن کو اُٹھا سکے اور کشتی تیرتی رہے۔ اگر ڈیڑھ فٹ پانی کشتی کو تیرائے رکھ سکتا ہے تو پھر خواہ کسی جگہ پانی کی گہرائی پانچ سو فٹ بھی ہو جائے تو بھی کشتی کو فرق نہیں پڑے گا۔

سلسلہ سہروردیہ سے تعلق رکھنے والے اپنے وقت کے مشہور غوث حضرت بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ بہت امیر تھے۔ اُن کے ہم عصر اولیائے کرام اِس بات پر پریشان ہوتے رہتے تھے کہ فقیر تو کبھی اِس قدر مال وزر کے مالک نہیں ہوتے۔ وہ اُنھیں لیٹرز میں بھی یہی لکھتے کہ آپ کیسے فقیر ہیں کہ اِتنی دولت اکٹھی کر رکھی ہے۔ حضرت بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ اعلیٰ ظرف انسان کی طرح اُن کی تنقید خاموشی سے سنتے رہتے لیکن جب ایسی آوازیں زیادہ ہی بلند ہوگئیں تو اُنھوں نے جواب دیا کہ میں نے مال وزر جمع ضرور کیا ہے لیکن اُسے دل میں جگہ نہیں دی۔ رب تعالیٰ نے بعد میں اُن کے الفاظ کو ثابت بھی کردیا کہ وہ درست فرما رہے تھے۔

کشتی کو تیرنے کے لیے جتنا پانی مطلوب ہوتا ہے اُس مطلوبہ مقدار سے پانی جتنا بھی بڑھ جائے کشتی کو فرق نہیں پڑتا۔ اُسے صرف اُس وقت فرق پڑتا ہے جب یہ پانی کشتی کے اندر داخل ہو جاتا ہے۔ جب خواہشات بہت بڑھ جاتی ہیں تو وہ اس پانی کی مانند ہو جاتی ہیں جو کشتی کے اندر داخل ہو کر اُسے ڈبو دیتا ہے۔ اسی طرح خواہشاتِ نفس کی کثرت عموماً انسان کو بربادی کی طرف لے جاتی ہے۔

جس محفل میں بھی جائیں ایک سوال دہرایا جاتا ہے کہ اس ملک کا بنے گا کیا؟ میرے نزدیک اس ملک کو

کرپشن نے نقصان پہنچایا ہے نہ مہنگائی نے بلکہ اِس ملک میں مال وزر کے حصول کی شدید خواہش اور ھل من مزید کی آرزو نے تباہی مچائی ہے۔

یہ آرزوئیں ہی تو ہیں کہ جن کی وجہ سے ہم چادر سے زیادہ پاؤں پھیلاتے ہیں جن کی وجہ سے غربت ہمیں گھیر لیتی ہے۔ اِن آرزوؤں کو قابو کرنا بہت ضروری ہے۔ اس کا آسان ترین حل یہ ہے کہ نفس کی چھوٹی سے چھوٹی خواہش کی مخالفت کر لی جائے تاکہ خواہشات کا سلسلہ دراز نہ ہو سکے۔ جب آرزوئیں کنٹرول ہونے لگیں تو پھر سکھ کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور دُکھ ختم ہونے لگتے ہیں۔ پھر اُس فقیر کی مانند زندگی گزرنے لگتی ہے جس کے پاس کھانے کو روٹی، پہننے کو مناسب لباس اور رہنے کو مکان نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود وہ اطمینان اور سکون کی زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے کیونکہ فقیر نے اپنی آرزوؤں کو یوں کچلا ہوتا ہے کہ بالآخر اُس کا نفس خواہش کرنا ہی چھوڑ دیتا ہے۔

غربت مٹانے اور امیر ہونے کا ایسا بہترین فارمولا آج تک کوئی اکنامسٹ بھی نہیں دے سکا جیسا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے آج سے چودہ سو سال پہلے دے دیا تھا:

"میں نے اپنے اخراجات کو اِتنا کم کر لیا کہ امیر ہو گیا۔"

اخراجات کو کم کرنا آرزوؤں کو دبا کر ہی ممکن ہے۔

سوال: اگر حضرت بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں مال وزر کی محبت نہیں تھی تو اُنھوں نے اُسے جمع کیسے کر لیا کیونکہ دولت کی محبت کے بغیر اُسے جمع نہیں کیا جا سکتا۔

جواب: حضرت بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ خاندانی رئیس تھے۔ اُن کی جاگیر اور کاروبار موروثی تھے۔ اُنھیں ورثے میں بے پناہ دولت ملی تھی۔ اُنھوں نے جب یہ فرمایا کہ میں نے مال و دولت کو دل میں جگہ نہیں دی تو رب تعالیٰ نے اِس سچائی کو یوں ثابت کیا کہ کچھ عرصہ بعد جب ریاست میں شدید قحط پڑا اور خشک سالی کی وجہ سے اناج بالکل نہ اُگ سکا۔ حاکم ریاست کی طرف سے اناج تقسیم ہوا حتیٰ کہ تمام ذخائر ختم ہو گئے۔ تب حضرت بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے گوداموں کے منہ کھول دیے اور اعلان کیا کہ ہر ضرورت مند Free of cost اناج لے جائے۔

حضرت بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے حضرت شاہ رکن عالم رحمۃ اللہ علیہ میں بھی سخاوت Genetically ٹرانسفر ہوئی تھی۔ ایک روز حضرت بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی محفل میں ایک شخص آیا اور کہا کہ میں مسافر ہوں، سید ہوں، میرے پاس کوئی سواری نہیں۔ حضرت شاہ رکن الدین عالم رحمۃ اللہ علیہ جو اُس وقت آٹھ نو سال کے تھے اور کھیل رہے تھے، اُس شخص کی یہ بات سنتے ہی کھیل چھوڑ کر اصطبل گئے اور بہترین گھوڑا لا کر اُسے دے دیا۔ وہ گھوڑے پر بیٹھا اور رہوا ہو گیا۔ محفل میں موجود ایک آدمی نے کہا "حضور! میں اس شخص کو جانتا ہوں۔ یہ سید نہیں بلکہ میراثی ہے، اور اسی شہر میں رہتا ہے۔ اُس نے آپ سے جھوٹ بولا ہے۔" حضرت شاہ رُکن عالم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "میرے علم میں ہے کہ یہ لوکل میراثی ہے لیکن میں نے گھوڑا

اسے نہیں بلکہ اُس نسبت کو دیا ہے جس کا اس نے حوالہ دیا تھا۔"

حضرت بہاؤالدین ذکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ میں اس قدر سخاوت تھی کہ اُن کے اِتنے چھوٹے پوتے میں بھی اُس کے اثرات تھے۔

آپ کا سوال ہے کہ دل میں مال کی محبت نہ ہو تو وہ جمع نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھیے! جب مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا جاتا ہے تو وہ کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔ رب تعالیٰ انفاق فی سبیل اللہ کرنے والوں پر انعامات کی بارش کر دیتا ہے۔ دُنیا میں ایک کا دس گنا اور آخرت میں ایک کا ستر گنا ملتا ہے۔ حضرت علیؓ کے گھر اکثر فاقے رہتے تھے۔ ایک بار دو تین روز کے فاقے کے بعد کہیں سے آٹا میسر ہوا تو بی بی صاحبہؓ نے روٹی بنا کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں پیش کی۔ وہ نوالہ توڑنے ہی لگے تھے کہ دروازے پر کسی نے صدا لگائی کہ اللہ کے نام پر کچھ دے دو۔ اُنھوں نے کئی روز کے فاقہ کی پروا کیے بغیر روٹی اُسے دے دی۔ کچھ ہی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ ایک صاحب وہاں روٹیاں لیے کھڑے تھے کہ فلاں صاحب نے آپ کے لیے بھیجی ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے تعداد دریافت کی تو پتا چلا کہ آٹھ روٹیاں ہیں۔ فرمایا "یہ روٹیاں میری نہیں، واپس لے جاؤ۔" تھوڑی دیر بعد دوبارہ دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو کوئی صاحب روٹیاں لائے تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے تعداد دریافت کرنے کے بعد وہ روٹیاں بھی واپس لوٹا دیں۔ تیسری بار دستک ہوئی اور دس روٹیاں پیش کی گئیں تب اُنھوں نے فرمایا "یہ روٹیاں واقعی میرے لیے ہیں کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے کہ میں تمھیں دس گنا زیادہ دوں گا۔"

جب انسان اللہ کے نام پر مال و زر خرچ کرتا ہے تو پھر اُسے اسی طرح وسیع رزق ملتا رہتا ہے۔ اُس پر چاروں طرف سے عطا کی بارش ہونے لگتی ہے بشرطیکہ وہ اخلاصِ نیت سے صرف اللہ کے لیے ایسا کر رہا ہو کہ اللہ نے مجھے جو رزق دیا ہے اِس میں اُس کی مخلوق کا حصہ ہے۔ میرا فرض اُس حصے کو مخلوق تک پہنچانا ہے۔ جب انسان اللہ کی مخلوق پر خرچ کرتا ہے تو اُس کا بے پناہ انعام اور اجر ملتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ایک شخص اُنھیں کوہ طور پر جاتے دیکھا کرتا تھا۔ ایک روز اُس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ "جب آپ کی رب تعالیٰ سے گفتگو ہو تو میرا ایک سوال اُس سے پوچھیے گا کہ میری تقدیر میں آخری سانس تک کتنا رزق لکھا ہے؟" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اللہ سے یہ پوچھا تو اللہ نے اُس رزق کی مقدار بتا دی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور سے واپس آ کر جب اُس شخص کو اُس مختصر رزق کے بارے میں بتایا جو اُس کی تقدیر میں لکھا تھا تو اُس شخص نے ایک نئی فرمائش کر دی کہ "اے موسیٰ علیہ السلام! آپ رب سے کہیے گا کہ جو چیز میری ہے اُسے میں جب چاہوں طلب کر لوں اس لیے وہ میرا رزق مجھے تھوڑا تھوڑا دینے کے بجائے اکٹھا ایک ہی بار دے دے۔" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اُس کی فرمائش اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کی تو اللہ تعالیٰ نے متعلقہ فرشتے کو حکم دیا کہ اُس شخص کو اُس کی تقدیر میں مرقوم سارا رزق یک مشت دے دو۔ حکم کی تعمیل ہوئی اور اُس شخص کو اُس کا سارا رزق اکٹھا دے دیا گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سوچا کہ یہ شخص تو اپنا سارا رزق چھ آٹھ مہینوں میں خرچ کر دے گا نہ جانے باقی عمر کیسے گزارے گا۔ چند دنوں بعد اُن کا گزر دوبارہ اُس گلی سے ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اُس کے محلے اور خاندان کے سبھی لوگ وہاں کھانا کھا رہے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کئی مہینوں تک یہ معمول دیکھتے رہے لیکن رزق ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ آخر ایک روز اُنھوں نے رب تعالیٰ سے سوال کیا کہ "یا باری تعالیٰ اُس شخص کی قسمت میں تو بہت تھوڑا سا رزق تھا اور وہ چند دن ہی چل سکتا تھا لیکن وہ شخص تو ایک طویل عرصے سے مخلوقِ خدا کو کھانا کھلا رہا ہے، اس کے باوجود اِس کا رزق ختم نہیں ہوا۔ ماجرا کیا ہے؟"

رب تعالیٰ نے فرمایا "اے موسیٰ علیہ السلام! اُس شخص نے میرے ساتھ سرمایہ کاری شروع کر دی ہے۔ وہ میرے بندوں کو کھانا کھلا رہا ہے اور میں اُسے ایک کے عوض دس عطا کرتا چلا جا رہا ہوں اور ایسا میں تب تک کرتا رہوں گا جب تک وہ میری رضا کے لیے میرے بندوں کو کھانا کھلاتا رہے گا۔"

جب انسان رب تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا ہے تو اُس کے پاس رزق اور مال و زر بے تحاشا جمع ہو جاتا ہے۔ رزق کا یہ جمع ہونا دولت سے محبت کا نتیجہ نہیں بلکہ انفاق فی سبیل اللہ کا ثمر ہے۔ یہ سوچنا درست نہیں کہ اگر ہم اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہیں گے تو شاید ہماری دولت کم ہو جائے گی۔

بات صرف اِتنی سی ہے کہ ہم کسی بھی قسم کی توقع، صلے اور بدلے سے مبرا ہو کر خالصتاً اللہ کی خوشنودی کے لیے اللہ کے بندوں پر مال خرچ کریں اور پھر دیکھیں کہ کس طرح رزق مینہ کی طرح ہم پر برستا ہے۔

سوال: کیا دورانِ سفر درود پاک بغیر وضو کے پڑھا جا سکتا ہے؟

جواب: پڑھا جا سکتا ہے لیکن ادب کا تقاضا ہے کہ بے وضو درود پاک نہ پڑھا جائے۔

سوال: مجھ جیسے کچھ نالائق سٹوڈنٹس اپنے مرشد کی توجہ پانے کے لیے کبھی بے پروائی سے اور کبھی جان بوجھ کر غلطی کرتے ہیں تاکہ ڈانٹ ہی سہی لیکن اُن کے پاس کسی بہانے زیادہ بیٹھنے کا وقت مل جائے۔ اگر ایسا نہ کریں تو وہ جاتے ہی ٹالی دے کر فرماتے ہیں۔ ٹھیک ہے، جائیے! اِس طرح کی حرکتوں سے کہیں وہ ناراض تو نہیں ہو جاتے۔ اپنے مرشد سے سب ہی کو پیار ہوتا ہے اور اُن کے پاس بیٹھنا مرید کی خواہش۔

جواب: مجھے نہیں معلوم کہ آپ کے مرشد کون ہیں لیکن مجھے اپنے مرشد کا ضرور پتا ہے۔ جب میں اُن کے پاس بیٹھا کرتا تھا، اُن ابتدائی دنوں میں اگرچہ میں اللہ کو بہت پکارتا تھا۔ جاب اور دیگر معاملات بھی بااحسن نبھاتا تھا لیکن اِس کے باوجود میری انا بہت مضبوط تھی جس کا مجھے تو نہیں لیکن میرے مرشد صاحب کو ضرور اندازہ تھا۔ اس لیے بغیر کوئی غلطی کیے بھی مجھے مرشد صاحب سے ڈانٹ پڑ جایا کرتی اور خاص طور پر اُس وقت جب سب لوگ موجود ہوتے۔ ایسے میں میرے اندر اُس خوف نے جنم لیا کہ اگر بغیر غلطی کے ڈانٹ پڑ سکتی ہے تو میں پوری کوشش کروں کہ مجھ سے کوئی غلطی سرزد نہ ہو۔ غلطی سے بچنے کے لیے میں خاموش رہتا لیکن جب انسان زیادہ محتاط ہوتا ہے تو وہ غلطی ضرور کرتا ہے اِس لیے مجھ سے بھی غلطیاں ہوتی تھیں۔ جس طرح کی ڈانٹ مجھے

پڑتی تھی اور جیسا سلوک میرے ساتھ ہوتا تھا وہ شاید عام آدمی کے لیے ناقابل برداشت ہو۔

آج احساس ہوتا ہے کہ اگر وہ غلطیاں یا کوتاہیاں مجھ سے نہ ہوتیں تو شاید مرشد صاحب مجھ سے اور زیادہ پیار کرتے۔

ہم یہ غلط سمجھتے ہیں کہ جب تک ہم اپنے مرشد صاحب کے پاس دو چار گھنٹے نہ بیٹھیں وہ ہماری طرف متوجہ نہیں ہوں گے۔ ہم دوسروں کے ساتھ جو سلوک کرتے ہیں اُسے اگر اپنی ذات پر منطبق کر کے دیکھ لیں کہ کسی کی ایسی حرکت سے ہمارا رویہ کیا ہوگا تو ہمیں بہت سی باتوں کی سمجھ آجائے گی۔

اگر کوئی شخص ہمارے پاس آئے تو اُسے نہ صرف پورا وقت دیں بلکہ گفتگو اور رویے سے Entertain بھی کریں تاکہ وہ خوش ہو کر اُٹھے۔ یہ سنت رسول ﷺ بھی ہے اور آپ ﷺ کا فرمان بھی کہ جب تم کسی سے ملو تو وہ سوچے کہ شاید تم اُسی کے ہو۔

جب آپ سنت پر عمل کرتے ہوئے اپنے پاس آنے والے شخص کو نہ صرف پورا وقت دیتے ہیں بلکہ گفتگو اور رویے سے Entertain بھی کرتے ہیں تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آپ کے بہت سے کام رُک جاتے ہیں۔ اگر ایسا مہمان روز آنے لگے تو آپ سوچتے ہیں کہ ان صاحب کے آنے سے میرے کام رہ جاتے ہیں۔ اس کے برعکس ایک صاحب آپ کے پاس جو آئے، سلام کیا اور چل دیے۔ ایسا وزیٹر ویلکم وزیٹر ہوتا ہے۔ ہم اُسے دل سے پسند کرتے ہیں کہ وہ زیادہ وقت نہیں لیتا۔

بزرگوں کا شیڈول خاصا Tight ہوتا ہے۔ وہ اپنے پاس آنے والوں کو وقت دیتے رہیں گے لیکن Realise نہیں کرائیں گے، وہ کسی Guest کو یہ کہہ کر اُٹھ کر نہیں چلے جائیں گے کہ میں نماز کے لیے جا رہا ہوں بلکہ وہ ہر حال میں مہمانوں کو وقت دیتے رہیں گے۔

آدابِ مہمانی یہ ہے کہ جب کسی سے ملنے جائیں تو کم سے کم وقت میزبان کے پاس بیٹھیں اور کوشش کریں کہ جلدی واپس چلے جائیں۔ اس رویے سے وہ آدمی خوش رہتا ہے جس کے پاس ہم بطور مہمان گئے ہیں۔

میں تو خاصا نالائق انسان ہوں۔ دوسرے ممالک میں جاتا ہوں تو بہت سے بزرگوں کے مزار پر حاضری دینا ہوتی ہے۔ پانچ ساڑھے پانچ گھنٹے کی فلائٹ کے بعد جب ترکی پہنچوں تو تین ساڑھے تین منٹ کی حاضری حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مزار پر دیتا ہوں۔ فاتحہ پڑھی، اُن کی خدمت میں سلام عرض کیا، اجازت لی اور واپس آ گئے۔ استنبول سے ایک ہزار کلومیٹر سے زائد فاصلہ طے کر کے قونیہ گئے۔ حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر تین ساڑھے تین منٹ کی حاضری دی اور واپس چلے آئے۔ اگر آپ حضرات استنبول جائیں تو وہاں سے پندرہ کلومیٹر دور ایک پیغمبر حضرت یوشع علیہ السلام دفن ہیں۔

حضرت یوشع علیہ السلام بہت ہی پیارے شخص ہیں۔ اگر فاتحہ پڑھنے کے دوران اُن سے آپ کی ملاقات ہو جائے تو ہو ہی نہیں سکتا کہ آپ اُن کے عشق میں مبتلا نہ ہوں۔ لیکن وہاں بھی حاضری تین ساڑھے تین منٹ

ہی کی ہوتی ہے اور اس کا فائدہ میں نے ضرور دیکھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ جو لوگ وہاں گھنٹوں بیٹھے رہتے ہیں وہ وہاں سے کیا لیتے ہوں گے لیکن مجھے یہ ضرور پتا ہے کہ وہ تین ساڑھے تین منٹ کے مختصر وقت میں اتنے لاڈ لڈاتے اور اتنی عنایات کرتے ہیں کہ انھیں سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اس کی ایک مثال عرض کر دوں کہ اگر ایک شخص روز آپ کے گھر پر آئے۔ دروازہ کھول کر اندر سر کر کے کہے "السلام علیکم! اچھا جناب، مجھے اجازت دیجیے۔" کوئی اور بات نہ کرے۔ تین چار روز بعد آپ خود ہی پوچھ لیں گے "بھائی! کوئی کام ہے مجھ سے؟" وہ کہے "نہیں جناب! مجھے تو آپ سے پیار ہے اس لیے صرف سلام عرض کرنے آتا ہوں۔" اُس کا یہ رویہ آپ کو مجبور کر دے گا کہ آپ اپنے افرادِ خانہ اور ملازمین کو ہدایت کر دیں کہ یہ شخص کبھی کوئی کام کہے تو وہ کر دینا۔

اس کے برعکس ایک شخص روز آپ کے پاس آ کر ایک نئی فرمائش کرتا ہے۔ پانچ چھ مرتبہ اُس کی فرمائش پوری کرنے کے بعد آپ کہیں گے۔

"بھائی! کبھی فرمائش کے بغیر بھی آجایا کرو۔"

بزرگوں سے بٹورنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اُن کے سامنے روز نئی فرمائش نہ رکھیں۔ میں نے اپنے مرشد صاحب سے ایک روز دُعا کے لیے کہہ دیا۔ اُن کے پاس بہت سے صاحبانِ علم آیا کرتے تھے۔ جب میں نے مرشد صاحب سے دوسری بار دُعا کی درخواست کی تو ایک صاحبِ علم نے مجھے کہا "شاہ صاحب! آپ مرشد صاحب سے دُعا کے لیے نہ کہا کیجیے۔" اِس کے بعد میں نے اُنھیں کبھی دُعا کے لیے نہیں کہا۔ پھر جب مجھے رُوحانیت کی اِس راہ کی کچھ سن گن ملی تو اُن صاحبِ علم کی بات سمجھ آئی کہ یہ درحقیقت بہت بڑی Favour تھی کیونکہ بہت بعد میں پتا چلا کہ جب میں نے مرشد صاحب سے دُعا کرائی تو وہ دعا کر کے بری الذمہ ہو گئے کہ جو اِس نے کہا میں نے اِس کے لیے دُعا کر دی اور جان چھوٹی لیکن اگر میں دُعا کے لیے نہ کہوں تو وہ خود میرا خیال رکھنے پر مجبور ہو جائیں گے اور از خود میرا دھیان رکھتے رہیں گے۔ اس لیے ضروری نہیں ہوتا کہ آپ اپنے مرشد صاحب کے پاس جائیں تو اُن سے دُعا کے لیے کہیں۔

میری گزارش تو یہ ہوگی کہ آپ اپنے مرشد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوں تو انھیں دُعا کے لیے کبھی نہ کہیں۔ آپ اُنھیں مجبور کر دیں کہ وہ خود آپ کا خیال رکھیں۔ اگر آپ کے مرشد صاحبِ نظر اور صاحبِ علم ہیں (اور یقیناً وہ ہوں گے اِسی لیے تو آپ نے اُن کی بیعت کی ہے) تو جیسے ہی آپ مشکل میں آئیں گے اُن کے وہاں گھنٹی ضرور بج جائے گی۔ یوں از خود دُعا ہو جائے گی اور اللہ تعالیٰ آپ کو مشکلات سے نکال لے گا۔

مرشد کے ساتھ ایسا تعلق رکھیے جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ بے لوث تعلق ہے۔ اس میں کوئی غرض نہیں۔ پھر دیکھیے کہ اِس کا پھل رب کی طرف سے کتنا زیادہ ملتا ہے۔ اگر آپ غرض کے ساتھ مرشد سے ملیں گے تو صرف وہ غرض ہی پوری ہوتی رہے گی باقی سب پہلو تشنہ رہ جائیں گے۔

فقیر یا مرشد کے پاس کوئی زیادہ مال و دولت نہیں ہوتا۔ آپ کو اُن سے وہ تو نہیں ملے گا۔ اُن کے پاس سب سے قیمتی چیز علم و تربیت ہے۔ انسان کو وہ علم اور تربیت ملنی چاہیے۔ جب یہ چیزیں مل گئیں تو وہ اپنے مرشد کے مقام کو پہنچ گیا۔ اس کی مثال یوں ہے کہ اگر ایک شخص ریتلے علاقے میں سفر کرتا ہے تو ریت پر اُس کے قدموں کے نشان رہ جاتے ہیں۔ اگر میں اُن Footprints پر قدم رکھتا ہوا چلتا چلا جاؤں تو وہیں جا پہنچوں گا جہاں وہ شخص پہنچا ہے جس کے قدموں کے وہ نشان ہیں۔ جب ہم مرشد کی تربیت اُن سے لینے لگیں گے تو وہ ویسی ہی تربیت کریں گے جیسی اُن کی اپنی ہوتی تھی۔

یہ بہتر ہے یا ایک آدھ کرائی گئی دُعا......؟

میں تو عرض کیا کرتا ہوں کہ اگر کوئی ڈاکٹر آپ کا دوست ہے تو بجائے اپنے جاننے والوں کو اُس ڈاکٹر کے پاس علاج کے لیے لے جانے کے آپ اُس ڈاکٹر سے علمِ طب حاصل کر لیں۔ یوں آپ خود ہی مریضوں کا علاج کرنے لگیں گے۔ آپ مرشد صاحب سے ضرور ملیے لیکن کوشش کیجیے کہ اُن سے علم اور تربیت حاصل کر لیں۔

اس راہ میں ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ مرشد صاحب آپ کو انجکشن لگا دیں اور آپ کو علم مل جائے۔ جب آپ مرشد کے پاس جاتے ہیں تو انھیں کاپی کرنے لگتے ہیں۔ جب آپ اُن کے Attitudes towards life اور Attitude towards people کاپی کر لیں گے تو وہیں جا پہنچیں گے جہاں آپ کے مرشد صاحب پہنچے ہیں۔

سوال: فیض احمد فیض نے کہا تھا

تیری کج ادائی سے ہار کر شبِ انتظار چلی گئی
میرے ضبطِ حال سے رُوٹھ کر میرے غم گسار چلے گئے
نہ سوالِ وصل، نہ عرضِ غم، نہ حکایتیں نہ شکایتیں
تیرے عہد میں دلِ زار کے سبھی اختیار چلے گئے

جواب: کہاں فیض جیسا پڑھا لکھا Genius شخص اور کہاں میں! اگر انسان یہ چاہے کہ وہ دُنیا میں ہی جنت کے مزے لوٹے تو اُسے چاہیے کہ اپنی زبان کو گلے شکوے سے روک لے۔ گلے، شکوے اور شکایتیں کر کے انسان اپنی زندگی کو بھی تلخ بنا لیتا ہے اور دوسروں کے لیے بھی مشکلات کا سبب بنا رہتا ہے۔

ضبط میں بہت فائدے ہیں۔ ضبط انسان کی اصلیت پر پردہ ڈالے رکھتا ہے۔ جو آدمی اپنے اندر ضبط پیدا کر لے وہ فقر کی اُس راہ پر چل پڑتا ہے جہاں کہا جاتا ہے کہ فقیر جب بھوکا ہوتا ہے تو خود کو پیٹ بھرا ظاہر کرتا ہے، جب دُکھ میں ہو تو سکھ میں ظاہر کرتا ہے، تنگ دستی میں ہو تو خوش حالی میں ظاہر کرتا ہے۔ اس لیے فقیر کے ظاہر سے کبھی اُس کے اصل حالات کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ دوست اُس پر ترس کھا کر اُس کی مدد نہیں کرتے یوں وہ زیرِ احسان نہیں ہوتا اور مخالف اُس کا اطمینان و سکون اور مسکراہٹ دیکھ کر

مایوس ہوتے ہیں کہ ہم نے اسے اتنے دُکھ دیے پھر بھی اس کے ماتھے پر شکن نہیں آئی۔ یوں سب فقیر کا ضبطِ حال اور قہقہے دیکھ کر واپس چلے جاتے ہیں۔

ضبطِ حال کا سب سے بڑا Advantage یہ ہے کہ فقیر کبھی رب کا گلہ شکوہ نہیں کرتا۔ (آپ کو یہ بات بڑی عجیب لگے گی) جب میں یہ کہتا ہوں کہ چار پہر گزر گئے مجھے کھانے کو کچھ نہیں ملا...... یہ رب کا شکوہ نہیں تو کیا ہے؟ جب کہتا ہوں میں بیمار ہوں تو یہ کیوں بھول جاتا ہوں کہ بیماری مِن جانب اللہ ہے۔ جب میں اپنے دُکھوں کا کسی کے سامنے اظہار کرتا ہوں تو مجھے یہ کیوں یاد نہیں رہتا کہ دُکھ سکھ تو رب کی طرف سے ہیں۔

جب انسان ضبط سے کام لے تو وہ شکر گزار ہو جاتا ہے۔ وہ ہر حال میں لوگوں کو ہنستا مسکراتا دکھائی دیتا ہے۔ دل سے کہتا ہے الحمدللہ! اللہ کا بہت شکر ہے۔

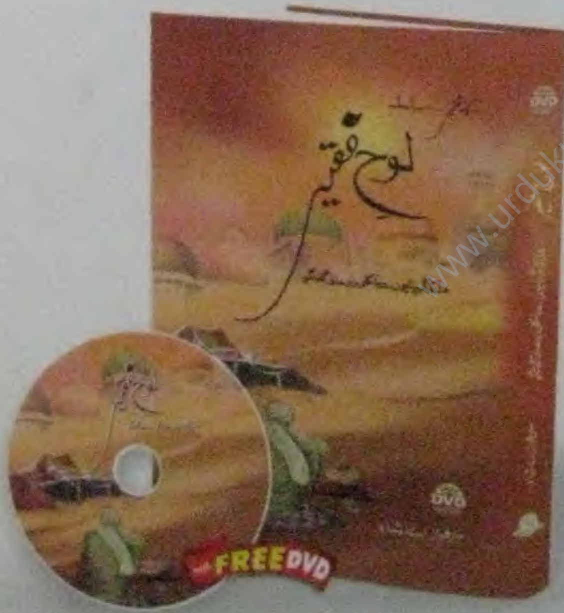
ضبط کمال کی خوبی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس ضبط کا اہل کر دے۔

DVD کیسے سنیں

نشست نمبر		لیکچرز نمبر
1	غور و فکر	207 (15.07.12)
2	کثافتیں دُور کرنے کے طریقے	208 (29-07-12)
3	سورۃ الفاتحہ کے اہم مضامین کا خلاصہ	209 (05.08.12)
4	دس کثافتیں	210 (12.08.12)
5	رُوحانی کیفیات اور بنیادوں کی تیاری	211 (19.08.12)
6	سورۃ التغابن	212 (26.08.12)
7	نفس سے جنگ	213 (09.09.12)
8	اکتسابِ فیض	214 (16.09.12)
9	مرشد، مرید اور راہِ سلوک	215 (30.09.12)
10	مثبت رویہ اور شکرگزاری	216 (07.10.12)
11	رب پر یقین	217 (14.10.12)
12	عمل سے زندگی	218 (21.10.12)
13	چند مضامین قرآن اور حروف کے اثرات	219 (04.11.12)
14	شکرانِ نعمت	220 (11.11.12)
15	حُسنِ آگہی	221 (18.11.12)











Published by:
Jahangir Books

